ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
تحقیق کے چراغ تلے...
ڈاکٹر صدیق جاوید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر سیّد مُعین الرّحمٰن

—— تحقیق کے چراغ تلے...

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

ــــــ تحقیق کے چراغ تلے...

ڈاکٹر صدیق جاوید

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ©

مطبوعِ اوّل: مئی 2005ء

کتاب: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
— تحقیق کے چراغ تلے...

مصنف: ڈاکٹر صدیق جاوید

ناشر: محمد عابد علی

سرورق: عبدالحمید شاہد

کمپوزنگ: آصف رضا

مطبع: شرکت پریس لاہور

تعداد: 1000

قیمت: 200 روپے، 10 ڈالر، 6 پونڈ

اہتمام: مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ
امین پور بازار، فیصل آباد Ph:+92 41 2615359
e-mail:misaal615@hotmail.com
misaal615@yahoo.com

نئے راہروانِ تحقیق کے نام!

—— خدا کرے وہ تحقیق کی تاریک راہوں میں
محفوظ و مامون رہیں!

فہرست

”پڑھوں میں شکوے سے۔۔۔“

ڈاکٹر انور محمود خالد

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے حوالے سے ڈاکٹر صدیق جاوید کو دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ کتاب: ”تحقیق کے چراغ تلے۔۔۔“ لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا صحیح جواب (اور لطف) تو آپ کو پوری کتاب پڑھ کر ہی ملے گا‘ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے‘ اس تحریر کا فوری محرک ’ماہنامہ ”الحمرا“ لاہور (شمارہ نومبر 2003ء) میں چھپنے والے ”مولانا حامد علی خاں کے چند خطوط“ ہیں جو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مدیر کو ارسال کیے تھے اور ”ترتیب و تعارف“ کی آڑ میں ایک خط کے طویل وضاحتی نوٹ میں انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی‘ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کو گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے اُردو کی کلاسوں کے اجرا میں رکاوٹ بننے کا مجرم ٹھہرایا تھا۔ اسی حاشیے میں انہوں نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی انتظامیہ کے اس فیصلے کو بھی ہدف تنقید بنایا جس کے مطابق ڈاکٹر وحید قریشی کو شعبہ اردو میں تاحیات Distinguished Professor کا منصب جلیلہ پیش کیا گیا اور بقول اُن کے جس کا اعزازیہ ’’ماہ بماہ اُن کے گھر پہنچتا رہے گا‘‘ حالانکہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے خیال میں ڈاکٹر وحید قریشی اپنی شدید علالت کی وجہ سے اس قابل نہیں تھے کہ وہ شعبہ اردو میں پہنچ کر طلبہ و طالبات کی صحیح علمی رہنمائی کر سکتے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کو یہ بات بھی پسند نہیں آئی کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنا وسیع اور نادر و نایاب ذخیرہ کتب عطیہ کے طور پر جی سی یونیورسٹی لائبریری لاہور کو دے دیا —— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا یہ وضاحتی نوٹ غلط بیانیوں کی پوٹ ہے اور اس تحریر کے طنزیہ جملے‘ بغض و عناد اور حسد کے زہر میں بجھے ہوئے وہ تیر ہیں جن کا ہدف انہوں نے پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کے ان تین اساتذہ کو بنایا ہے‘ جن کی شرافت‘ دیانت‘ لیاقت

اور اصابت رائے کا ایک زمانہ گواہ ہے اور جو اپنے اپنے تصنیفی کارناموں کی وجہ سے پورے ملک میں عزت کی نگاہ سے دیکھتے جاتے ہیں۔

الزامات کی سنگینی اور ڈاکٹر صدیق جاوید کے ردِ عمل کی شدت کا اُس وقت تک صحیح ادراک نہیں ہوسکتا جب تک ڈاکٹر معین الرحمٰن کا یہ وضاحتی نوٹ آپ کے پیشِ نظر نہ ہو۔ آپ بھی پڑھیے اور سر دھنیے!

"میں 1981ء کے اوائل میں' گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے' جہاں ایم اے (اردو) کی کلاسز تھیں' سات آٹھ برس کا تعلق منقطع کر کے' اس یقین دہانی پر لاہور آیا تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے (اردو) کی کلاسز کا آغاز کیا جائے۔ محکمہ تعلیم حکومت پنجاب سے ہمیں ایم اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء کی فوری اجازت مل گئی لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کی در پردہ اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی علی الاعلان مخالفت اور ان کے لایعنی حیلوں بہانوں کے باعث پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی کلاسز کے الحاق کے معاملات رو بہ راہ لانے میں ہمارے چار برس برباد ہوئے اور بالآخر الحاق کی منظوری کہیں 1985ء میں جا کر میسر آ سکی!

محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کی آشیر باد کے باوجود گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء کی تحریک کو یونیورسٹی اورینٹل کالج کے "بڑوں" کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر وحید قریشی مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ میں 'جی سی' کی جانب سے اورینٹل کالج میں ایم اے (اردو) کی تدریس میں شریک ہو جاؤں اور بجائے خود 'جی۔ سی' میں ایم اے (اردو) کی کلاسز شروع کرنے پر اصرار نہ کروں۔ میں اُن سے متفق نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے' جب تک وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں شعبۂ اردو کے سربراہ رہے' 'جی سی' کی درخواست اور کوشش کو لیت و لعل اور حیلوں بہانوں سے ٹالے رکھا۔ سال 66-1965ء کے سیشن میں بھی گورنمنٹ کالج لاہور کی اسی نوعیت کی ایک تجویز اور تحریک کو وہ حتمی طور پر رد کر چکے تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے بعد 1983ء میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' شعبۂ اردو' یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے صدر ہوئے۔۔۔ انہوں نے کہ یکسر بے لچک آدمی ہیں' کسی لگی لپٹی کے بغیر مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپ کی درخواست کے قطعاً حق میں نہیں ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کا یہ

خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا کہ 'جی سی' میں اور ینٹل کالج کے برابر' ایم اے (اردو) کی کلاسز ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کے دورِ صدارت میں ممکن ہے یہ نہ ہو' یا ہو بھی جائے' لیکن بالآخر تو اسے ہو کر رہنا ہے! خدا آپ کو زندگی دے کہ آپ 'جی سی' میں ایم اے (اردو) کے اجراء اور ان کلاسز کے پھلنے پھولنے کی ''خوشی'' دیکھیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے بعد' 86-1985ء کے سیشن میں پہلی بار ہم محکمہ تعلیم حکومتِ پنجاب کی اجازت اور پنجاب یونیورسٹی سے باقاعدہ الحاق کے بعد ایم اے (اردو) کی سطح پر تدریس کا آغاز کر سکے۔

اب اس تو ے اور تصویر کا دوسرا رخ: شعبۂ اردو' گورنمنٹ کالج لاہور میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز شروع ہونے پر ڈاکٹر وحید قریشی نے پہلی فرصت میں مجھے ''اعتماد اور راز'' میں لے کر اپنی مجبوری اور معذوری یا کم زوری کا پس پردہ قصہ سنا کر اعتراف کیا کہ یہ ''دراصل'' خواجہ زکریا تھے' جو کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ 'جی سی' میں ایم اے (اردو) کی کلاسز ہوں۔ 66-1965ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے کہنے پر اور پھر مابعد اپنے زمانۂ صدارت اور اختیار میں' میں خواجہ زکریا کے دباؤ کے تحت 'جی سی' میں ایم اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء کی درخواست سے اتفاق نہیں کر سکا۔ میں لاہور میں رہتے ہوئے خواجہ زکریا کی مخالفت کو Afford نہیں کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی اس ''دُرفشنی'' کو میں نے' ان کے خیالِ خاطر سے ''مان'' لیا۔۔۔ وہ مجھے اپنے تئیں' یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ خواجہ محمد زکریا' مجھ سے شدید معاصرانہ اور معاندانہ چشمک رکھتے ہیں اور مجھے اپنا واحد شریک اور حریف سمجھتے ہیں!

میرے اور برادرم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے مابین (1965ء تا حال) کیا رشتہ رہا' یہ ایک الگ اور مختلف (بعض دوستوں کے نزدیک ایک مستقل موضوع) ہے لیکن خود ڈاکٹر وحید قریشی کے طرزِ عمل اور روشِ حیات کو ان کے مضمون ''خوف زدہ غالب اور عصری صورتِ حال'' کی روشنی میں دیکھنا اور جانچنا بہت پُر لطف' بامعنی اور سبق آموز ہوگا۔ یہ مطالعۂ غالب سے شاید زیادہ خود مقالہ نگار کی صورتِ حال کا عکاس ہے!

یہ کس درجہ ''حمیت افزا'' منظرنامہ' اور میسر وسائل کا منصفانہ مصرف ہے کہ آج جب ڈاکٹر وحید قریشی بستر علالت پر تنہائی کا مستقل شکار ہیں' گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اردو سے وحید قریشی کی غیر منقطع اور طویل دورانیے پر پھیلی ہوئی ''مہربانیوں'' کے ''اعتراف'' میں جی سی یونیورسٹی کی ''کمپی ٹینٹ'' اتھارٹی کی خوش بخشی سے' وہ شعبۂ اردو میں' تاحیات ''ڈِسٹنگوئیسٹ پروفیسر'' کے منصبِ جلیلہ پر فائز کیے گئے ہیں۔ 'جی سی' میں کسی ایک دن کے لیے بھی شعبے یا فیکلٹی میں آنا تو دور کی بات ہے' وہ گھر میں اپنی شدید علالت کے باعث کسی بیرونی مدد/ ایکسٹرنل ایڈ کے بغیر اپنے کمرے تک سے باہر نکلنے کے قابل نہیں۔ ماہ بماہ اعزازیہ گھر پہنچتا رہے گا۔ خدا انہیں جلد تر صحت یاب فرمائے اور وہ شعبے میں آئیں یا لائے جا سکیں اور فیکلٹی ان کے وجودِ معود سے فیض یاب ہو۔

میں نے جی سی یونیورسٹی کی انتظامیہ کے ایک اہم کل پُرزے سے' خود ان کے رابطہ کرنے پر' عرض کیا تھا کہ ڈاکٹر وحید قریشی' جی سی' کے شعبۂ اردو سے جو کچھ کرتے رہے' وہ ڈھکا چھپا نہیں ہے' ریکارڈ پر ہے۔ وہ بھی شریکِ سفر ہونا تو کیا معنی' سفر کھوٹا کرنے کا سبب اور باعث رہے ہیں۔ جواباً اس ''اعزاز اور مالی مفاد'' کا جواز مجھے یہ بتایا گیا کہ انہوں نے اپنا کتب خانہ 'جی سی' یونیورسٹی میں محفوظ کرا دیا ہے۔

مجھ سمیت یہ بات بہتوں کے علم میں ہے کہ وہ برسوں' اپنے کتب خانے کو فروخت کر دینے کی فکر اور کوشش میں لگے رہے لیکن وفاقی اور جامعاتی سطح پر ان کی کوئی کوشش' ان کے حسب خواہ سرے نہ چڑھی۔ اسے چھوڑیئے' ایک دوسرے زاویے سے دیکھیے۔ وہ نہ پہلے شخص ہیں' نہ وہی ایک ایسے منفرد شخص ہیں جنہوں نے 'جی سی' کو اپنے شخصی ذخیرۂ کتب کا عطیہ دیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم' ڈاکٹر محمد صادق اور دوسرے ذی حیات اکابر کے قیمتی عطیات 'جی سی' لائبریری کے منور گوشے ہیں۔ ''پروفیسر شپ'' کے تاج کا وحید قریشی ہی کے سر پر رکھنے میں مخفی حکمت ہے کیا؟ عقل اسے سمجھنے سے عاجز ہے۔

اگر میاں والی' کالا باغ کے علاقے کے معروف ڈاکو محمد خاں'' اپنی زندگی میں ایک معقول رقم ''جی سی' کو عطا کر دیتے تو کیا ان کے نام نامی کو 'جی سی' سے وابستہ کر لینا اعزاز کا باعث ہوتا! یا کوئی اس کا جواز بنتا!؟ حمیت بھی کوئی چیز

ہے یا اسے بڑے بڑے سورما "راؤنٹرز" گھول کر پی گئے ہیں!!

جی سی یونیورسٹی کے منتظمہ کے جس مہربان سے میری یہ گفتگو ہوئی، اپنے آپ پر ان کے پیہم لطف و کرم کا معترف ہوں۔ اسی شہ پر میں یہ سب کچھ ان سے کہہ گزرا۔ ان کے پاس جواب صرف یہ تھا کہ "فیصلے اوپر جہاں ہوتے ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، میں تو فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کا ذمہ دار اور پابند ایک ادنیٰ خادم ہوں!" میں اس پر صرف "سبحان اللہ" کہہ سکا، حالانکہ محل کیا "انا للہ" کا نہیں تھا؟ (ماہنامہ "الحمرا" لاہور۔ شمارہ نومبر 2003ء، صفحات 20 تا 22)

اس طویل فٹ نوٹ کو پڑھ کر ماہنامہ "الحمرا" لاہور کے اگلے شمارے (دسمبر 2003ء) میں "محفلِ احباب" (قارئین کے خطوط) کے کالم میں جناب عرفان احمد خان (ناول نگار) نے ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف لکھے جانے والے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے نوٹ کے اصل محرک سے پردہ اٹھایا۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کو ریٹائرمنٹ کے بعد حسبِ خواہش گورنمنٹ کالج میں نہ تو توسیع ملازمت ملی اور نہ انہیں پروفیسر ایمریٹس بنایا گیا، اس لیے انہوں نے (جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے) ڈاکٹر وحید قریشی کی ذاتِ گرامی کو ہی متنازعہ بنانے کی کوشش کی، جنہیں ان کی جگہ "Distinguished Professor" بنا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے "الحمرا" لاہور کے شمارہ فروری 2004ء میں "محفلِ احباب" کے کالم میں ہی جناب عرفان احمد خان کے مراسلے کا جواب دیتے ہوئے ان کے تاثرات کی تردید کی، لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی کہ وہ جی سی یونیورسٹی سے کسی اعزازی نسبت یا تحقیقی یا نصابی امور میں رہنمائی کے لیے رضاکارانہ طور پر ہمہ وقت تیار ہیں اور یہ کہ وہ اس نوعیت کی کسی بھی خدمت کو اپنا اعزاز تصور کریں گے اور یہ کام بلا معاوضہ کریں گے۔ اس جواب کا جو طویل "جواب الجواب" عرفان احمد خاں نے اگلے شمارے میں اشاعت کے لیے مدیر "الحمرا" (شاہد علی خان) کو بھیجا، وہ بقول عرفان احمد خاں، ڈاکٹر معین الرحمٰن نے شائع نہیں ہونے دیا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے وضاحتی نوٹ میں اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اردو کے جن تین اساتذہ (بالخصوص ڈاکٹر وحید قریشی) کو ہدفِ تنقید بنایا تھا، ان میں سے کسی نے بھی کوئی زبانی یا تحریری جواب نہ دیا۔ شاید ڈاکٹر وحید قریشی بوجۂ علالت، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار بوجۂ عدم فرصت اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بوجۂ عدم دلچسپی، اپنے خلاف چلائی جانے والی اس معاندانہ مہم کا نوٹس نہ لے سکے یا انہوں نے اُس "فٹ نوٹ" کو بیکار غوغا آرائی اور بے بنیاد الزام تراشی سمجھ کر اس کا جواب دینا اپنے مرتبے سے کمتر جانا۔ ان تینوں اساتذہ کے لاتعداد شاگردوں، دوستوں اور مداحوں میں سے بھی کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی غلط بیانیوں کی تردید میں کوئی مراسلہ ہی شائع کرتا، سوائے ایک خاتون فرح ہارون کے، جنہوں

نے ماہنامہ ''الحمرا'' لاہور کے شمارہ جنوری 2004ء میں ''محفل احباب'' کے کالم میں شائع شدہ اپنے مکتوب میں معین صاحب کے رویے کے خلاف یہ کہہ کر دبے لفظوں میں احتجاج کیا کہ ''نومبر (2003ء) کے شمارے میں ڈاکٹر معین نے مولانا حامد علی خاں کے خطوط پیش کر کے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے لیکن ان خطوط میں ذاتی حوالے بالخصوص ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے اذکار نہ صرف بے محل ہیں بلکہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی عالمانہ شان سے مطابقت نہیں رکھتے۔۔۔'' اس کے بعد انہوں نے کھل کر ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ''ڈاکٹر وحید قریشی اردو تحقیق میں ایک Living Legend کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔ جہاں تک پروفیسر آف ایمریطس کی تقرری کا سوال ہے' ڈاکٹر وحید قریشی سے بہتر استاد اس کرسی کے لیے ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا شمار اردو ادب کے سینئر ترین اساتذہ میں ہوتا ہے جن کی حیثیت مسلّم الثبوت ہے۔ انہوں نے شدید بیماری میں بھی اردو ادب میں اپنی زندگی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی زندہ مثال قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلّہ ''مخزن'' ہے جس کی ادارت ڈاکٹر وحید قریشی کے سپرد ہے۔ ان کا کتب خانہ ایک قومی ورثہ ہے اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کو اس پر فخر ہوگا۔ اردو ادب کی ادنیٰ سی طالبہ کی حیثیت سے ان بزرگ ادیبوں سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنے رتبے سے کم تر بات نہ کریں اور ذاتی حوالوں کو ادب کا حصہ نہ بنائیں۔'' (صفحہ 88)

بہر حال ڈاکٹر صدیق جاوید کے علم میں جونہی یہ ''وضاحتی نوٹ'' آیا' انہوں نے (باوجود شدید علالت کے) اس کا جواب دینے کے لیے کمر ہمت باندھی اور متعلقہ مواد کھنگالنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی جملہ ''تصنیفات و تالیفات و مرتبات'' کو بھی از سرِ نو ناقدانہ نظر سے دیکھ ڈالا۔ چنانچہ موجودہ کتاب کے تقریباً ایک سو صفحات ''الحمرا'' شمارہ نومبر 2003ء میں شائع شدہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ''وضاحتی نوٹ'' کے جواب میں تحریر کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے تو (ایک اناڑی وکیل کی طرح) ''دعویٰ'' تیار کرتے وقت محض الزامات کی فہرست گنوانے پر اکتفا کیا تھا لیکن ڈاکٹر صدیق جاوید نے اپنے ''جواب دعویٰ'' میں (ایک ذہین وکیلِ صفائی کی طرح) اپنا موقف ثابت کرنے کے لیے دلائل کے انبار لگا دیے۔ انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا پر عائد کردہ ایک ایک الزام کی تردید کی اور ثابت کیا کہ ان دونوں اساتذہ نے نہ صرف یہ کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء میں روڑے نہیں اٹکائے بلکہ الٹا ان کے قیام میں بھرپور معاونت کی۔ ''مقدمے'' کی پوری مسل اب قارئین کے سامنے ہے اور وہ اسے پڑھ کر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟

موجودہ کتاب میں اس ''بیانِ صفائی'' کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ مثلاً مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' (نسخۂ خواجہ) کی دریافت' ملکیت اور اشاعت کا مسئلہ' معین الرحمٰن کی بتدریج منصبی ترقیوں میں پروفیسر حمید احمد خان اور سید وقار عظیم کی مساعیٔ جمیلہ' ڈاکٹر سید عبداللہ کی کردار کشی کے لیے پروفیسر خواجہ محمد سعید اور معین

الرحمٰن کی ملی بھگت' معین الرحمٰن کی پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے بجائے سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی (اردو) کے لیے رجسٹریشن کی اصل حقیقت اور ان کے پی ایچ ڈی کے مقالہ: ''غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' کی تا حال عدم اشاعت کی وجوہات اور اس کی بجائے ''غالب کا علمی سرمایہ'' کو اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ظاہر کر کے اس کی اٹھارہ سال بعد اشاعت' ڈاکٹریٹ کے لیے اپنے ''پہلے عشق'' بابائے اردو مولوی عبدالحق پر غالبیات کو ترجیح دینے کی مصلحت' محرکات' سہولیات اور اس سے حاصل ہونے والے دنیاوی ثمرات' معین الرحمٰن کے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے گورنمنٹ کالج لاہور آنے کی اصل وجوہات اور بطور صدر شعبہ' اپنے رفقائے کار' ان کے بچوں اور اپنے بعض شاگردوں کے ساتھ ''حُسنِ سلوک'' کی مثالیں وغیرہ۔

میرے نزدیک اس کتاب کے دو حصے زیادہ اہم ہیں۔ ایک وہ' جس میں مصنف نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور دوسرا وہ' جس میں انہوں نے معین صاحب کی جملہ ''تصنیفات' تالیفات اور مرتبات'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اگر چہ دونوں جگہوں پر انہوں نے اجمال و اختصار سے کام لیا ہے۔ کاش یہ حصے زیادہ گہرے' طویل اور جامع ہوتے! ڈاکٹر صدیق جاوید کے ڈاکٹر معین الرحمٰن سے تعلقات کی کہانی لگ بھگ 30 برس کے عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ پہلے وہ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں معین صاحب کے رفیق کار رہے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور میں وہ اکٹھے ہو گئے اور ایک لمبے عرصے تک ایک دوسرے کے معین و معاون رہے۔ اُن کے ''وصل سے فصل تک'' کی داستانِ امیر حمزہ (یا عمر وعیار؟) بھی دھوپ چھاؤں کی زد میں آتی رہی ہے اور صدیق جاوید نے موجودہ کتاب میں اپنے بڑھتے گھٹتے تعلقات کو کہیں بھی پردۂ اخفا میں نہیں رکھا۔ ایک ذہین استاذ' ایک وسیع المطالعہ محقق اور ایک عاشق کتب کی حیثیت سے انہوں نے معین صاحب کی ان ساڑھے چار درجن کتابوں کا بھی تحقیقی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے' جن پر موصوف نے ''تصنیفات' تالیفات اور مرتبات'' کا (پُر فریب) ٹیگ لگا رکھا ہے۔ صدیق جاوید سے زیادہ معین صاحب کا کوئی اور معاصر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان سے زیادہ معین صاحب سے قریب اور پھر زیادہ دُور رہا ہے۔ اب بھی دونوں کے درمیان جسمانی اور ذہنی فاصلے موجود ہیں لیکن باہمی احترام اور تہذیبی شائستگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کا ثبوت (قدم قدم پر اختلافات کے باوجود) وہ ہمدردانہ مشورے ہیں' جو صدیق جاوید صاحب نے معین صاحب کو اس کتاب کے مختلف مقامات پر دیے ہیں تا کہ جس قسم کی ''داؤ پیچ تحقیق'' کے وہ خوگر ہو چکے ہیں' اُس سے اگر وہ اب بھی تائب ہو جائیں تو ان کے ادبی ''گناہوں'' کا کفارہ ادا ہو سکتا ہے۔ اپنی جن کتابوں پر ڈاکٹر معین الرحمٰن کو خاص طور پر ناز ہے یعنی (i)۔ ''غالب اور انقلاب ستاون'' (ii)۔ ''غالب کا علمی سرمایہ'' اور (iii)۔ ''مجموعۂ مطالعات عبدالحق'' (بابائے اردو پر مرتبہ پانچ کتابیں) ـــــ ان کی ''علمی حیثیت'' کا جس طرح صدیق جاوید نے پول کھولا ہے' وہ یہ ثابت کرنے

کے لیے کافی ہے کہ اگر وہ موصوف کی بقیہ ''تصنیفات و تالیفات و مرتبات'' کا بھی اسی طرح عمیق اور مفصل جائزہ لیتے اور گزشتہ تیس برسوں کے دوران انہوں نے معین صاحب کو جس طرح قریب سے دیکھا' برتا اور پرکھا' اس کے اُتار چڑھاؤ کی تفصیلات بھی قارئین کے سامنے رکھتے تو ان کی یہ تصنیف 'ڈاکٹر معین الرحمٰن کی شخصیت اور کارناموں پر شاید سب سے دلچسپ کتاب شمار ہوتی۔ موجودہ صورت میں یہ کتاب نہ تو معین الرحمٰن کی باقاعدہ سوانح عمری ہے اور نہ ان کی محققانہ مساعی کا سیر حاصل تنقیدی مطالعہ۔۔۔ البتہ اس کتاب میں معین صاحب کی پیچیدہ' ملمع اور پُر اسرار سیرت و کردار اور انہی سے مخصوص ''دبستانِ تحقیق'' کی جھلکیاں ضرور موجود ہیں۔۔۔ اور یہ جھلکیاں کیا شاندار ہیں!

ڈاکٹر صدیق جاوید نے اس کتاب میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی غلط بیانی' فریب کاری' دھوکہ دہی اور خوشامدی ذہنیت کی متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں' جو اُن کی بظاہر شائستہ' نستعلیق' پُر وقار' اُجلی' کم گو اور کم آمیز طبیعت سے لگا نہیں کھاتیں۔ صدیق جاوید کی طرح' معین صاحب سے میری واقفیت کا عرصہ بھی کم و بیش 30 برسوں پر محیط ہے۔ جب وہ جنوری 1974ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں پروفیسر منتخب ہو کر آئے تو میں پہلے سے شعبۂ اردو میں (بحیثیت استاد) موجود تھا۔ میں نے گورنمنٹ کالج لائل پور 1966ء میں جوائن کیا تھا اور اسی کالج میں مسلسل 34 برس گزار کر بالآخر 2000ء میں بطور پروفیسر و صدر شعبۂ اردو' ریٹائر ہوا۔ اس سے پہلے میں دیال سنگھ کالج لاہور' اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور' پنجاب یونیورسٹی (شعبۂ صحافت) لاہور' گورنمنٹ کالج لیہ (ضلع مظفر گڑھ) اور گورنمنٹ کالج لکی مروت (ضلع بنوں) میں بحیثیت لیکچرار اردو کام کر چکا تھا اور ایک سال کا عرصہ میں نے ماہنامہ ''سیارہ ڈائجسٹ' لاہور میں نائب مدیر کی حیثیت سے گزارا تھا (سید قاسم محمود مدیر اعلیٰ تھے) معین صاحب کی فیصل آباد آمد (1974ء) سے پہلے میری دو کتابیں۔ (i)۔ عہد نامہ (شعری مجموعہ) اور (ii)۔ اقبال کا خصوصی مطالعہ (تنقید) چھپ چکی تھیں اور بیسیوں تنقیدی مقالات بھی مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ ''سیارہ ڈائجسٹ'' کی ادارت کے زمانے میں لاہور اور بیرونِ لاہور کے بے شمار اہلِ قلم سے میرے مراسم استوار ہوئے اور لاہور کی مذکورہ بالا تین درس گاہوں سے وابستگی کے دوران اور ادبی مجالس میں باقاعدہ شرکت کی وجہ سے وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے میری اچھی خاصی واقفیت تھی۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن جب فیصل آباد تشریف لائے تو میرے لاہور کے دوست' (ڈاکٹر) محمد احسان الحق اختر (استاد ایم اے او کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور) کا حوالہ دے کر مجھے ملے اور تین چار دفعہ (محلہ ناظم آباد میں) میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے جو کالج اور ان کی رہائش گاہ سے زیادہ دُور نہ تھا۔ ریاض مجید' ریاض احمد ریاض' عبدالرحمٰن شاکر' صدیق جاوید' منظر مفتی' حق نواز' عصمت اللہ خان اور یوسف عزیز بھی اسی شعبۂ اردو میں استاد تھے اور ہم سب نے معین صاحب کا نئے صدر شعبہ کی حیثیت سے خیر مقدم کیا اور ان سے شعبہ جاتی تدریسی امور میں بھرپور تعاون

کیا۔ حق نواز اور عصمت اللہ خان، ہم لوگوں سے قدرے سینئر تھے اس لیے معین صاحب نے ٹائم ٹیبل کے معاملات میں ان پر انحصار کیا۔۔۔ اور ریاض مجید اور مجھ سے قدرے فاصلے پر رہے۔ ریاض مجید کے بھی اس وقت تک تین شعری مجموعے (i)۔ پس منظر (ii)۔ گزرے وقتوں کی عبارت اور (iii)۔ ڈوبتے بدن کا ہاتھ، چھپ چکے تھے اور وہ شاعر کی حیثیت سے پورے ملک میں معروف تھے۔ ریاض مجید اور راقم الحروف، حلقہ ارباب ذوق (لائل پور) انجمن اہلِ قلم (لائل پور) اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے بھی سرگرم رکن اور عہدے دار تھے اور لائل پور اور بیرونِ لائل پور کے مشاعروں، ادبی مجلسوں اور سیمیناروں وغیرہ میں کثرت سے شریک ہونے کی وجہ سے شعری اور ادبی حلقوں میں بخوبی جانے پہچانے جاتے تھے۔ معین صاحب کی بھی اس وقت تک چار کتابیں (i)۔ سید وقار عظیم ــــ سوانحی خاکہ (1967ء)، (ii)۔ نقدِ عبدالحق (1968ء) (iii)۔ اشاریۂ غالب (1969ء) اور (iv)۔ مطالعۂ یلدرم (1971ء) چھپ چکی تھیں البتہ ان کی پانچویں کتاب ''غالب اور انقلاب ستاون'' (1974ء) ان کے فیصل آباد آنے کے بعد شائع ہوئی۔ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ریاض مجید اور راقم الحروف ہی دو ایسے اساتذہ تھے جو شعبہ سے باہر، بلکہ شہر سے باہر کے علمی و ادبی حلقوں میں معروف تھے اس لیے ہم معین صاحب کے ویسے تابع فرمان ماتحت نہ بن سکے، جیسے حق نواز، عصمت اللہ خان اور منظر مفتی وغیرہ تھے کہ جن کی وجہ شہرت صرف گورنمنٹ کالج لائل پور سے وابستگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ معین صاحب کے فیصل آباد کے سات سالہ قیام کے دوران ہمارے (ریاض مجید اور راقم الحروف کے) اور معین صاحب کے درمیان ایک باوقار مغائرت موجود رہی اور ہم کبھی ان کی 'اچھی کتابوں' میں شمار نہ ہوئے۔ اس کا ثبوت ان کی مرتبہ کتاب ''قائداعظم اور لائل پور'' کا پہلا ایڈیشن (1977ء) ہے جس کے ''حرفے چند'' (پیش لفظ) میں معین صاحب نے شعبۂ اردو کے تمام سینئر اور جونیئر اساتذہ کا نام بنام شکریہ ادا کیا ہے لیکن ان میں میرا اور ریاض مجید کا نام نہیں ہے (البتہ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن (1998ء) میں ہم دونوں کے ناموں کا اضافہ کر دیا گیا) یوں لگتا ہے (اگرچہ انہوں نے اس کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا) کہ وہ ہم دونوں کو بلاوجہ اپنا ادبی حریف سمجھتے تھے، کیونکہ شعبہ اردو کے استاد ہونے کے علاوہ بھی ہماری ایک الگ ادبی شناخت تھی، جو ہمیں معین صاحب کا تابع مہمل بننے سے روکتی تھی اور اسی وجہ سے ہمارے تعلقات اگرچہ ناہموار تو نہ ہوئے لیکن گرم جوش اور خوشگوار بھی نہ ہوئے۔ منظر مفتی، ریاض احمد ریاض اور صدیق جاوید، البتہ ان کی ''اچھی کتابوں'' میں سرفہرست تھے۔ انہیں بقول خود، ریاض احمد ریاض کی ذہانت، خوش گفتاری اور ادب اور زندگی کے بارے میں ان کے تازہ کار رویوں نے متحیر اور مسحور کیا۔ وہ ان کی تخلیقی اُپج، ابداعی قوت اور منفرد اسلوبِ اظہار کی وجہ سے بھی ان کے مداح تھے۔ منظر مفتی اپنی اطاعتِ کامل کی وجہ سے انہیں پسند تھے کیونکہ وہ ''Yes Boss'' کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔

صدیق جاوید ایک شاندار ذاتی لائبریری کے مالک تھے اور نئی پرانی سب کتابوں کے نام اُن کے نوکِ زبان ہوتے تھے۔ پھر وہ اپنی کتابیں مستعار دینے میں بھی فیاض تھے اور بڑے اچھے ماتحت ہونے کی وجہ سے وہ اپنے سینئرز کا اور سینئرز اُن کا دل سے احترام کرتے تھے اور ان سے شخصی روابط اور قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ اُن کی یہ ادائیں بھی معین صاحب کو بھائیں اور وہ علمی و ادبی تبادلۂ مشاورت میں اُن سے بہت قریب ہوگئے۔ علاوہ ازیں صدیق جاوید کا ہاتھ کشادہ دل غنی اور دستر خوان وسیع تھا اور وہ مقامی اور بیرونی مہمانوں کو نہ صرف اپنے گھر ٹھہراتے تھے بلکہ اُن کی پُرتکلف دعوتیں بھی کرتے تھے اور ان میں اپنے رفقائے شعبہ کو خاص طور پر بلاتے تھے۔ معین صاحب خرچ کرنے کے معاملے میں طبعاً جزرس اور محتاط تھے لیکن خرچیلے اور کشادہ دست احباب کو پسند بھی کرتے تھے۔ (جس کا ثبوت اُن کا کئی سال تک حق نواز، عصمت اللہ خان اور افتخار احمد چشتی جیسے بامروّت اور وضعدار اساتذہ کے گھروں میں معزز مہمان کی حیثیت سے قیام ہے۔) صدیق جاوید کا یہ حاتمی رویہ اور انداز داد و دہش لاہور جاکر بھی برقرار رہا اور معین صاحب اُن کے ذاتی کتب خانے، گاڑی اور ٹیلی فون کا بے محابا استعمال اسی طرح کرتے رہے جیسے اپنے سگے بھائیوں یا قریبی دوستوں کا کیا جاتا ہے۔ مروّت کے پُتلے صدیق جاوید تو اپنے دیرینہ مراسم نبھانے کے لیے یہ سب کچھ برداشت کرتے تھے لیکن شاید معین صاحب اسے ماتحتی کا خراج سمجھتے تھے اسی لیے کبھی کھل کر انہوں نے صدیق جاوید کے احسانات کا اعتراف نہ کیا۔۔۔ بلکہ جب ایک دفعہ حُسنِ اتفاق سے حساب چکانے کا موقع ملا تو صدیق جاوید پر ایم اے اردو کا ایک تحقیقی مقالہ اپنی ایک طالبہ سے لکھوایا (جو مجھے بھی دیکھنے کا موقع ملا) اور اس میں اپنی طرف سے متعدد نامناسب عبارتوں کا اضافہ کرایا (اس کی تفصیل موجودہ کتاب میں موجود ہے۔) یہ مقالہ مجموعی لحاظ سے تحقیقی مقالہ نگاری کی ایک بھونڈی مثال ہے۔

معین صاحب کے فیصل آباد کے سات سالہ قیام کے دوران میں تو شاید ان کے دردولت پر ایک آدھ بار حاضر ہوا لیکن ریاض مجید نے کبھی ان کے گھر کا منہ نہ دیکھا چنانچہ "دل کی کتاب" (از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مرتبہ انبساط امین عباسی) میں رفیق ڈوگر کے لیے ہوئے معین صاحب کے ایک انٹرویو میں جب ان کا یہ بیان پڑھا تو ششدر رہ گیا:

> "میرا احساس یہ ہے کہ اگر میں چند برس کے لیے فیصل آباد نہ گیا ہوتا تو فیصل آباد کے نامور اساتذہ ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر ریاض احمد ریاض، ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی اور بعض دوسرے رفقا "ڈاکٹر" نہ ہوتے۔ انہیں میں نے کام پر لگایا۔ فیصل آباد میں میری موجودگی اُن اصحاب کے لیے تحقیقی کام پر گامزن ہونے کا باعث ہوئی۔"

(الوقار پبلی کیشنز، لاہور، طبع: 2000ء، صفحات 202-203)

یہی بیان انہوں نے دو تین اور جگہوں کے علاوہ روزنامہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی (مورخہ 25 مئی 2004ء) کے ادبی ایڈیشن میں راشد حمید کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی دُہرایا۔ کہ ''فیصل آباد میں مجھے اپنے رفقائے کار کو تحقیق کی طرف مائل کرنے کی سرخروئی بھی حاصل ہوئی۔ میں اگر فیصل آباد نہ گیا ہوتا تو ڈاکٹر ریاض احمد ریاض' ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی' ڈاکٹر ریاض مجید' ڈاکٹر انور محمود خالد اور بعض دوسرے ساتھیوں کو ہائر ریسرچ ڈگری کا خیال نہ آتا نہ اس کا موقع ملتا۔''

یہ بیان سو فیصد جھوٹ ہے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے (مذکورہ بالا) ہم چاروں اساتذہ کی پی ایچ ڈی کا معین صاحب کی معاونت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ فیصل آباد نہ بھی آتے تو ہماری (علمی) صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ اُردو نعت (ریاض مجید) اردو نثر میں سیرت رسولؐ (انور محمود خالد) برصغیر پاک و ہند میں عربی نعتیہ شاعری (محمد اسحٰق قریشی) اور ابن انشاء — احوال و آثار (ریاض احمد ریاض) جیسے پی ایچ ڈی کے موضوعات سے معین صاحب کو بھلا کیا واسطہ؟ ہم چاروں کے گائیڈ بالترتیب ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اور ڈاکٹر خان حمید اللہ خاں تھے (البتہ ریاض احمد ریاض کے ''کو گائیڈ'' ڈاکٹر معین الرحمن ضرور تھے) لیکن ریاض احمد ریاض نے (ریاض مجید اور راقم الحروف کی مدد سے) اپنا تحقیقی مقالہ از خود دو رجسٹروں میں قلم بند کر کے معین صاحب کو لاہور بھیجا تھا اور انہوں نے بقول ریاض احمد ریاض' کہیں کہیں ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا اور صرف ٹائپ اور جلد بندی کے مراحل میں تعاون کیا۔ ہم تینوں (ریاض مجید' ریاض احمد ریاض اور راقم الحروف) کے مقالات تو پی ایچ ڈی برائے اردو تھے' ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی کا مقالہ پی ایچ ڈی برائے عربی تھا۔ معین صاحب عربی نعت گوئی میں ان کی بھلا کیا مدد کر سکتے تھے؟ سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر سید معین الرحمن کو عربی' فارسی اور انگریزی بالکل نہیں آتی۔ چنانچہ یہ کہنا سفید جھوٹ ہے کہ اگر وہ فیصل آباد نہ گئے ہوتے تو ہم چاروں دوست (جنہیں انہوں نے ازراہِ کرم ''نامور اساتذہ'' قرار دیا ہے) ''ڈاکٹر'' نہ ہوتے۔ ان کا یہ کہنا بھی صریح کذب بیانی ہے کہ ''انہیں میں نے کام پر لگایا۔ فیصل آباد میں میری موجودگی' ان اصحاب کے لیے تحقیقی کام پر گامزن ہونے کا باعث بنی۔'' ان کا یہ دعویٰ بھی جھوٹا ہے کہ اگر وہ فیصل آباد نہ گئے ہوتے تو نہ ہمیں ہائر ڈگری ریسرچ کا خیال آتا اور نہ ہمیں اس کا موقع ملتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ریاض مجید' ملک حسن اختر' انور سدید اور راقم الحروف 1970ء سے کوشاں تھے کہ ہمیں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت مل جائے لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ہماری دال نہ گلنے دی اور ہمارے خاکے دبا کر بیٹھ گئے۔ تاہم ملک حسن اختر اور انور سدید نے ہمت نہ ہاری اور مسلسل کوشاں رہے۔ چنانچہ پہلے ان دونوں کو اور بعد ازاں 1976ء میں مجھے اور ریاض مجید کو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے ہمدردانہ رویے کی وجہ سے پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت ملی کیونکہ انہوں نے ہی ہمارے خاکوں کی منظوری کے دفتری مراحل طے کروائے۔ ہم دونوں نے 1981ء

میں اپنے اپنے تحقیقی مقالے پنجاب یونیورسٹی میں جمع کرا دیئے۔ میرے گائیڈ خواجہ محمد زکریا نے تو یہ کہہ کر مجھے پوری آزادی دی کہ میں اپنا کام مکمل کر کے مقالے کی ایک کاپی انہیں دے دوں کیونکہ وہ میرے موضوع کے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جانتے لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے البتہ ریاض مجید کے مقالے کے ابتدائی دو ابواب دیکھے' ان کی مناسب تصحیح کی اور گراں قدر مشورے دیئے۔ ڈاکٹر معین الرحمن صاحب تو وزن میں پورا مصرع نہیں پڑھ سکتے' وہ بھلا ریاض مجید کو اردو نعت اور اسحٰق قریشی کو عربی نعت کے بارے میں کیا مشورہ دے سکتے تھے؟ پھر موصوف کے ذاتی کتب خانے میں عربی' فارسی اور اردو نعتیہ شاعری کے بارے میں وہ متنی' تنقیدی اور تحقیقی مواد کہاں موجود تھا جو ریاض مجید نے پانچ برسوں کے عرصے میں پاکستان' ہندوستان' ایران' افغانستان' سعودی عرب اور مصر وغیرہ ملکوں سے اکٹھا کیا تھا۔ میرا موضوع بھی معین صاحب کی دسترس سے باہر تھا۔ میں نے بھی عربی' فارسی' اردو' انگریزی' جرمن' فرنچ اور اطالوی زبانوں میں موجود کتب سیرت کے حصول اور ان سے متعلقہ تحقیقی و تنقیدی و متنی مواد اکٹھا کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیئے اور یوں میری ذاتی لائبریری میں اپنے موضوع سے متعلق ہزاروں کتابوں کا اضافہ ہوا۔ دوران تحقیق مجھے معین صاحب کے کم از کم فیصل آباد قیام کے زمانے میں ان کے ذاتی کتب خانے سے ایک کتاب لینے کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ البتہ ان کے لاہور چلے جانے کے بعد مجھے اپریل 1981ء میں دو ایک تحقیقی کتابوں کی ضرورت پڑی جو انہوں نے مجھے بھیج دیں۔ یوں بھی ان کے لاہور جانے کے بعد ہمارے درمیان کتابوں کا لین دین شروع ہو گیا تھا۔ تاہم انہوں نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے ہم چاروں کو کیسے اور کب تحقیقی کام پر لگایا؟ وہ منصب میں ہم چاروں سے ایک قدم (صرف ایک قدم) آگے تھے' لیکن عمر میں ہم سب سے چھوٹے تھے۔ صدر شعبہ بننے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمہ دان یا ہر فن مولا تھے۔ ہم اپنے سے قدرے سینئر استاد ہونے کی وجہ سے ان کا احترام ضرور کرتے تھے (اور اب بھی کرتے ہیں) لیکن ہماری فطرت میں "ایازی" پہلے تھی نہ اب ہے۔ معین صاحب نے ہمیں تحقیقی کام پر کیا لگانا تھا' انہیں تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ملا معین واعظ کاشفی کی "معارج النبوۃ" (فارسی) کی کل کتنی جلدیں ہیں اور کیا اس معروف کتاب سیرت کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے یا نہیں؟

''معارج النبوۃ'' کا قصہ یہ ہے کہ اکتوبر 1980ء کے اواخر میں ایک دن ڈاکٹر معین الرحمن صاحب گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے سٹاف روم میں تشریف لائے اور مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر اشارے سے برآمدے میں بلایا۔ میں گیا تو انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ایک کتاب کھول کر دکھائی (جس کی عام سستی سی جلد تھی) یہ دراصل ایک خطی نسخہ تھا اور غالباً اس کے ابتدائی اوراق غائب تھے البتہ ہر صفحے پر متن کے چاروں طرف کھینچے ہوئے حاشیے کے اُوپر بائیں کونے میں کتاب کا نام "معارج النبوۃ" لکھا ہوا تھا۔ معین صاحب کتاب کے نام پر اُنگلی رکھ کر پوچھنے لگے کہ اس کا مصنف کون ہے اور کیا یہ کتاب چھپ چکی ہے؟

میں نے مخطوطہ دیکھ کر بتایا کہ ہاں! یہ مُلاّ معین واعظ کاشفی الہروی کی فارسی میں لکھی ہوئی سیرت نبوی کی مشہور کتاب ہے اور اس کا پورا نام 'معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ'' ہے۔ اس کتاب کے ہزاروں خطی نسخے دُنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ گزشتہ ایک صدی میں یہ بارہا چھپ بھی چکی ہے۔ فارسی میں یہ پہلی دفعہ 1892ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تالیف 891ھ سے 901ھ کے درمیان ہوئی تھی اور مصنف نے اسے ایک مقدمہ، چار ارکین (حصوں) اور ایک تمہ میں تقسیم کیا ہے۔ اس وقت جو خطی نسخہ آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ اس کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ اُن کے مزید استفسار پر میں نے بتایا کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ 1978ء میں تین جلدوں میں لاہور سے چھپ چکا ہے جو دو ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا کہ اردو ترجمہ کہاں سے مل سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس بھی یہ موجود ہے اور اگر آپ خود خریدنا چاہتے ہیں تو یہیں فیصل آباد میں 'ملک سنز' کارخانہ بازار سے بھی دستیاب ہے۔

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے ''دیوانِ غالب'' (نسخۂ خواجہ) کے ڈی لکس (دوسرے) ایڈیشن میں ''حرفے چند'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''1981ء کے پس وپیش' مجھے آگے پیچھے لاہور میں پرانی کتابوں کے ایک کاروباری مرکز انارکلی کے فٹ پاتھ سے تین نادر کتابیں اور دو قیمتی مخطوطے ملے۔ ان میں غالبؔ کے دیوان کا ایک ایسا مخطوطہ بھی تھا جس کی کتابت غالبؔ کی زندگی میں اور ان کی نگرانی میں ہوئی۔ زیرِ نظر کام اُس نعمتِ بے نہایت کو متاعِ خاص و عام بنانے کی ایک مخلصانہ اور والہانہ کوشش ہے۔'' (صفحات 10-11 طبع اگست 2000ء 'تعارف' توضیحات اور اضافات از ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن۔ الوقار پبلی کیشنز' لاہور)

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے جن دو قیمتی مخطوطات (اور تین نادر کتابوں) کے انارکلی کے فٹ پاتھ سے ملنے کی کہانی بیان کی ہے' اُن میں ایک مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' (نسخۂ خواجہ / نسخۂ لاہور؟) تھا اور دوسرا مخطوطہ ''معارج النبوۃ'' کا وہی نسخہ تھا جو انہوں نے مجھے اکتوبر 1980ء میں فیصل آباد میں دکھایا تھا۔ ان پانچوں کتابوں کی تفصیل انہوں نے دیوانِ غالبؔ (نسخۂ خواجہ) کے پہلے عام ایڈیشن (مطبوعہ 1997ء) کے ''بیانِ مرتب'' (کچھ اپنے کام ''نسخۂ خواجہ'' کے بارے میں) میں یہ کہہ کر خود دی ہے کہ ''1981ء کے پس وپیش' مجھے آگے پیچھے' پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے تین نادر مطبوعہ کتابیں اور دو قیمتی مخطوطے ملے:

(1)۔ کتاب علم جرثقیل' جلد اوّل' ستہ شمسیہ

تالیف: امیر کبیر نواب شمس الامراء بہادر' مدراس' 11۔ دسمبر 1837ء

(2)۔ کتاب علم ہیئت' جلد ثانی' ستہ شمسیہ

تالیف: امیر کبیر نواب شمس الامراء بہادر' مدراس' 27۔ دسمبر 1837ء

(3)۔فسانۂ عجائب از مرزا رجب علی بیگ سرور

طبع اول: مطبع حسنی لکھنؤ' نہم جمادی الثانی 1289ء' 7 جولائی 1843ء

(4)۔فارسی مخطوطہ' معارج النبوت (قلمی 1486ء)

از: ملا معین الدین واعظ الکاشفی (وفات 1501ء)

(5)۔مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' (اردو) نسخۂ خواجہ' مکتوبہ ماقبل اگست 1852ء

آج اس پانچویں اور آخری نعمت بے نہایت کو متاعِ خاص و عام بنانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔اُمید ہے کہ اس پیش کش اور کارِ ترتیب و تدوین کو قدر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔''
(دیوانِ غالب' نسخۂ خواجہ۔تجزیہ و تحسین۔مرتبین: ڈاکٹر سید معراج نیر۔اصغر ندیم سید۔الوقار پبلی کیشنز' لاہور۔طبع 2000ء۔صفحات 184۔185)

اسی مخطوطہ ''معارج النبوۃ'' کے حوالہ سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی ڈاکٹر سید معین الرحمٰن پر ایک اور پہلو سے گرفت کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''معین صاحب کو' پرانی کتابوں کے ایک کاروباری'' سے جو دو قلمی نسخے ملے' ان میں ایک فارسی مخطوطہ ''معارج النبوۃ'' ہے۔جس کا سنہ انہوں نے 1486ء درج کیا ہے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ قلمی نسخوں پر شمسی نہیں قمری سال درج ہوتا تھا' چنانچہ یہاں بھی 1486ء کے بجائے 891ھ درج ہونا چاہیے تھا۔۔۔یا پھر دونوں سنین کا اندراج کرنا چاہیے تھا۔۔۔پھر ملا معین الدین کی وفات کا سن 1501ء درج کر دیا ہے حالانکہ اُس کا سالِ وفات متعین نہیں۔اس کی وفات 907ھ تا 910ھ/1501ء سے 1504ء کے دوران کسی وقت ہوئی۔''
(دیوان غالب' نسخۂ خواجہ ـــــ اصل حقائق: ڈاکٹر تحسین فراقی۔سورج پبلشنگ بیورو' لاہور' بار دوم مارچ 2001ء۔صفحہ 38)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے نہ صرف مجھ سمیت فیصل آباد کے تمام اساتذہ کو پی ایچ ڈی کرانے کا بے بنیاد کریڈٹ لے لیا بلکہ چلتے چلتے مجھ پر ایک اور احسان کا بوجھ بھی لاد دیا۔اپنی مخزونہ و متعارفہ نئی کتاب (جس پر بطور معاون مرتب صائمہ سلیم کا نام درج کیا گیا ہے): ''صد رنگ' سدا بہار خط'' (فراق گورکھ پوری سے اصغر ندیم سید تک) میں انہوں نے میرا بھی یکم جون 1982ء کا لکھا ہوا ایک خط شامل کیا ہے' جو میں نے اُن کی طرف سے پی ایچ ڈی کی تحریری مبارک باد کے جواب میں اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لکھا تھا اور جس میں اُن کی طرف سے چند کتابیں بروقت فراہم کرنے پر اخلاقاً ممنونیت کا اظہار کیا تھا۔اس چند سطری غیر اہم رسمی خط پر حاشیہ چڑھاتے ہوئے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ''فٹ نوٹ'' میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''راقم الحروف (ڈاکٹر معین الرحمٰن) نے جنوری 1974ء میں سینئر پروفیسر اور شعبہ اردو کے

صدر کے طور پر گورنمنٹ کالج لائل پور میں ذمے داری سنبھالی تو خالد صاحب شعبے میں لیکچرار تھے۔ پی ایچ ڈی کے بعد وہ پبلک سروس کمیشن سے "پروفیسر" منتخب ہوئے۔ میں کمیشن کی جانب سے اس موقع پر سلیکشن بورڈ میں شامل تھا۔" (الوقار پبلی کیشنز لاہور طبع 2005ء۔ صفحہ 84)

جی ہاں' یہاں باتیں تو سب صحیح ہیں لیکن ڈاکٹر معین صاحب نے حسب عادت' سیاق و سباق سے ہٹا کر انہیں اپنے مخصوص معانی پہنائے ہیں اور ان سے اپنی مرضی کے نتائج نکالے ہیں۔ اولاً تو میرا مذکورہ بالا خط قابلِ اشاعت تھا ہی نہیں۔ یہ نہ تو "صدر رنگ" ہے اور نہ "سدا بہار" —— بلکہ محض غیر علمی رسمی اور اخلاقی تحریر ہے جس میں مکتوب نگار (ڈاکٹر معین الرحمٰن) کو جواب دیتے ہوئے روایتی مشرقی وضع داری سے کام لیا گیا ہے اور مروتاً خط نگار (ڈاکٹر معین الرحمٰن) کے ادعا کی تائید کی گئی ہے۔ ثانیاً ڈاکٹر معین صاحب کے نام میرے بیسیوں خط ہوں گے جو سب کے سب کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت لکھے گئے تھے اور ہرگز اس قابل نہ ہوں گے کہ انہیں شائع کیا جائے۔ موجودہ خط بھی اسی قبیل کا ہے اور اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو قارئین کے لیے کسی دلچسپی کا باعث ہو —— لیکن لگتا ہے کہ معین صاحب نے محض مجھ پر احسان جتانے کے لیے اس خط کو استعمال کیا ہے جیسا کہ اس کے (بلا جواز) "فٹ نوٹ" کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہر حال اب اگر ڈاکٹر معین صاحب نے "مصرع طرح" دے ہی دیا ہے تو میری "طرحی غزل" بھی سنیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ 1974ء میں جب معین صاحب فیصل آباد تشریف لائے تو میں لیکچرار ہی تھا اور یکم مئی 1966ء سے سرکاری ملازمت میں آنے کے وقت سے تھا۔ (1962ء سے 1965ء تک میں غیر سرکاری کالجوں میں باقاعدہ اور پنجاب یونیورسٹی میں جزوقتی لیکچرار کی حیثیت سے پڑھاتا رہا تھا) —— لیکن 1976ء میں میں پروموٹ ہو کر اسسٹنٹ پروفیسر ہو چکا تھا۔ 1982ء میں مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی اور 1989ء میں میں انیسویں گریڈ کی پروفیسر شپ کا امیدوار ہوا۔ اس سے چند برس پہلے دو دفعہ پرنسپل شپ کے لیے مطلوبہ اہلیت رکھنے کے باوجود میں نے اپلائی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ پوسٹیں فیصل آباد سے باہر چھوٹے کالجوں کی تھیں اور میں اپنے نجی حالات کی وجہ سے فیصل آباد چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ 1989ء میں جب مجھے اسسٹنٹ پروفیسر بنے بھی 13 برس گزر چکے تھے' پروفیسر شپ کی پانچ پوسٹوں کا اشتہار چھپا تو میں نے بھی پنجاب پبلک سروس کمیشن کو درخواست دے دی۔ اتفاق دیکھئے کہ پانچ پوسٹوں کے لیے بارہ امیدوار اہل نکلے اور صرف سات نے انٹرویو دیا۔ ان میں تین گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ تھے (ڈاکٹر ملک حسن اختر' ڈاکٹر اختر علی میرٹھی اور ڈاکٹر سعید مرتضیٰ زیدی)' دو گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے (ڈاکٹر ریاض مجید اور راقم الحروف)' ایک ملتان کے استاد (ڈاکٹر سید منہاج الدین) اور ایک راولپنڈی کے

استاد (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ) تھے۔ حُسنِ اتفاق سے انٹرویو بورڈ (جو چھ سات افراد پر مشتمل تھا) میں ماہرین مضمون تینوں کے تینوں گورنمنٹ کالج لاہور کے سینئر اساتذہ تھے (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن پروفیسر صابر لودھی اور ڈاکٹر مظفر عباس) اور وہ نہ صرف ذاتی طور پر ہم ساتوں امیدواروں کو جانتے تھے بلکہ بعض امیدوار تو اُن کے رفقائے کار تھے یا رفقائے کار رہ چکے تھے۔ انٹرویو کے نتیجے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے تینوں اور گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے دونوں امیدوار کامیاب قرار دیے گئے اور ڈاکٹر سید منہاج الدین اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ (بدقسمتی سے) رہ گئے۔

اب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن بتائیں کہ بطور ماہر مضمون انہوں نے جن امیدواروں کو منتخب کیے جانے کی سفارش کی تھی کیا وہ اس منصب کے اہل تھے یا نہیں؟ اگر منتخب شدہ امیدوار واقعی اس منصب کے اہل تھے تو احسان کیسا؟۔۔۔ اور اگر وہ اہل نہیں تھے اور محض واقفیت یا سفارش کی وجہ سے انہیں منتخب کیا گیا تو کیا یہ پیشہ ورانہ بددیانتی نہ تھی؟ قومی جرم نہ تھا؟

راقم الحروف خود ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن فیصل آباد پنجاب پبلک سروس کمیشن لاہور اور پنجاب یونیورسٹی لاہور وغیرہ میں لیکچررشپ کے امیدواروں کے انٹرویو لینے کے لیے حاضر ہوتا رہا ہے اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایک انٹرویو بورڈ میں تو وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ساتھی رہ چکا ہے (جس میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر اور ڈاکٹر محمد کامران کا بطور لیکچرر انتخاب ہوا تھا) سب جانتے ہیں کہ انٹرویو بورڈ میں مضمون کے ماہرین کے علاوہ بھی دیگر تین چار افراد ہوتے ہیں اور امیدواروں کو دیے جانے والے نمبر اُن میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اونچی پوسٹوں میں ماہرین مضمون بالعموم تین افراد ہوتے ہیں اور ان کے پاس کل 15 نمبر ہوتے ہیں۔ ہر ماہر مضمون پندرہ نمبروں میں سے امیدوار کو حسب لیاقت واہلیت نمبر دیتا ہے اور پھر تینوں کے عطا کردہ نمبروں کا اوسط نکال لیا جاتا ہے۔ یوں عملاً ہر ماہر مضمون کے پاس دینے کے لیے صرف پانچ نمبر ہوتے ہیں۔ زیادہ نمبر امیدواروں کے اکیڈیمک ریکارڈ اور تدریسی تجربے کے ہوتے ہیں اور بقیہ نمبر چیئرمین اور دیگر اراکین بورڈ کے پاس ہوتے ہیں۔ عملاً انٹرویو بورڈ میں چیئرمین کی رائے غالب رہتی ہے اگرچہ دیگر اراکین اور ماہرین مضمون کی آرا کو بھی کلیتہً نظر انداز نہیں کیا جاتا۔

یہ بھی محض حُسنِ اتفاق ہے یا ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پاس موجود پانچ نمبروں میں سے عطا کردہ کچھ نمبروں کا کرشمہ کہ راقم الحروف ان پانچ منتخب شدہ امیدواروں میں میرٹ کے اعتبار سے سرفہرست تھا۔ ہوسکتا ہے کہ راقم الحروف کے انتخاب میں اس کے اچھے اکیڈمک ریکارڈ طویل تدریسی تجربے اور قابلِ ذکر تصنیفی وتالیفی استعداد کا کوئی حصہ نہ ہو (ایف ایس سی اور بی ایس سی میں سیکنڈ ڈویژن میٹرک اور ایم اے میں فرسٹ ڈویژن بی ایڈ اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں چار سالہ غیر سرکاری درس گاہوں اور 22 سالہ سرکاری

کالجوں کی ملازمت اور اتنے ہی عرصہ کا ایم۔اے اردو کی کلاسوں کو پڑھانے کا تجربۂ چار مطبوعہ کتابیں اور ساٹھ سے زائد مطبوعہ تنقیدی و تحقیقی مقالات وغیرہ) یہ بھی ممکن ہے کہ راقم الحروف کی انٹرویو میں ''پرفارمینس'' تسلی بخش نہ ہو اور وہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کے انٹرویو بورڈ کا رکن ہونے اور محض ان کی سفارش سے پروفیسر شپ کا اہل قرار پایا ہو۔۔۔ اور اس کے ٹاپ پوزیشن پر انتخاب میں باقی پانچ چھ اراکین بورڈ کی اپنی آراء کا کوئی دخل نہ ہو۔

بہر حال میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ انٹرویو بورڈ میں کم از کم ماہرین مضمون کی حد تک سب چہرے میرے لیے مانوس اور مہربان تھے۔ البتہ اگر ماہرین مضمون کے مجھ سے پوچھے گئے سوالات اور میرے جوابات کی چند جھلکیاں بھی سامنے آ جائیں تو شاید ڈاکٹر معین صاحب کا بار احسان میرے ناتواں کندھوں پر سے کچھ کم ہو جائے۔

ماہرین میں سے سب سے پہلے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب عینک کے اُوپر سے جھانکتے ہوئے گویا ہوئے: ''آپ نے ''اردو نثر میں سیرت رسولؐ'' پر ڈاکٹریٹ کی ہے۔ یہ بتائیے کہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں میں۔۔۔''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''چھ نہیں سات جلدوں میں۔''

حیران ہو کر بولے کہ ساتویں جلد کب چھپی؟

میں نے عرض کیا کہ 1980ء میں۔

کہنے لگے کہ انڈیا میں چھپی ہو گی؟

میں نے عرض کیا کہ جی ہاں لیکن پاکستان میں بھی اسی سال چھپ گئی تھی۔

پوچھنے لگے کہ خاصی ضخیم ہو گی؟

عرض کیا کہ نہیں باقی جلدوں کے مقابلے میں مختصر بھی ہے اور نا تمام بھی۔ یہ جلد صرف 214 صفحات پر مشتمل ہے۔

سوال کیا کہ یہ کس موضوع پر ہے؟

جواب دیا کہ ''معاملات'' پر

اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر مظفر عباس کی طرف رخ کر کے اشارہ کیا کہ وہ سوال پوچھیں۔ ڈاکٹر مظفر عباس نے بھی سیرت النبیؐ پر ہی لیکن ایک دوسرے سیرت نگار کے حوالے سے سوال کیا کہ سر سید احمد خان کی ''خطبات احمدیہ'' اردو میں سیرت کی پہلی باقاعدہ اور مکمل کتاب کہی جاتی ہے۔۔۔''

میں نے پھر قطع کلامی کی کہ ''نہیں جناب! یہ نہ سیرت پر پہلی کتاب ہے اور نہ یہ سیرت کی

باقاعدہ مکمل کتاب ہے۔''

ڈاکٹر مظفر عباس مسکرا کر بولے: ''ہم نے تو یہی سنا تھا۔ اچھا تو بتایئے کہ یہ باقاعدہ سیرت کی کتاب کیوں نہیں ہے؟''

میں نے احتراماً جواب دیا کہ: ''ڈاکٹر صاحب! ''خطباتِ احمدیہ'' میں آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ کے پہلے بارہ برس کے واقعات بیان کیے گئے ہیں اور وہ بھی آخری خطبہ میں۔ اصل کتاب کل بارہ خطبوں پر مشتمل ہے، اور اس میں سر ولیم میور کی انگریزی تصنیف ''دی لائف آف محمدؐ'' میں موجود اسلام اور بانیٔ اسلام پر کیے گئے تمام اعتراضات کا محققانہ جواب دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مظفر عباس نے پھر پوچھا کہ کیا ''خطباتِ احمدیہ'' سے پہلے بھی کوئی اچھی کتاب سیرت کے موضوع پر لکھی گئی تھی؟''

میں نے عرض کیا کہ ''جی ہاں! ''خطباتِ احمدیہ'' سے پہلے بھی سیرت پر اردو میں بیسیوں کتابیں لکھی گئیں لیکن ان میں قاضی بدرالدولہ کی کتاب ''فوائد بدریہ'' زیادہ اہم ہے جو 1839ء میں لکھی گئی اور جنوبی ہندوستان میں بے حد مقبول ہوئی۔ یہ کتاب مدراس، بمبئی، بنگلور اور حیدرآباد دکن میں بار بار چھپی ہے۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ اسلام آباد کے کتب خانے میں بھی اس کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔ یہ چار سو صفحات کی کتاب ہے اور چار حصوں پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر مظفر عباس نے اب پروفیسر صابر لودھی کو مزید سوالات کے لیے کہا اور انہوں نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا کہ'' آپ خود بھی شاعر ہیں۔ یہ بتایئے کہ آپ کو اردو میں کون کون سے شعرا پسند ہیں؟''

میں نے جواب میں غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ کے نام لیے۔

فیضؔ کے نام پر صابر لودھی صاحب کی آنکھیں چمک اٹھیں اور انہوں نے فیضؔ کی رومانویت اور انقلاب پسندی اور اختر شیرانی اور فیض کے رومانوی تصورات میں فرق کے بارے میں سوالات کیے۔ اس زمانے میں فیضؔ میرے پسندیدہ شاعر تھے اور مجھے ان کا بیشتر کلام حفظ تھا۔ میں نے فیضؔ کی نظموں کے حوالے سے صابر لودھی صاحب کے سوالات کے جوابات دیے اور فیضؔ اور اختر شیرانیؔ کے کلام کے متعلقہ حصے بھی انہیں سنائے۔

ماہرینِ مضمون کے سوالوں کے بعد انٹرویو بورڈ کے دیگر اراکین، خصوصاً چیئرمین صاحب نے بھی کئی سوالات کیے، جن کے میں نے بساط بھر جوابات دیے۔ بہرحال نتیجہ نکلا تو میں انیسویں گریڈ میں پروفیسر منتخب ہو چکا تھا۔ بیسواں گریڈ مجھے 1996ء میں جا کر ملا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن بخوبی جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے میری پروفیسر شپ کے لیے پنجاب پبلک سروس کمیشن کے سلیکشن بورڈ میں شامل ہو کر مجھے ممنون احسان ہونے کا موقع دیا تو اسی پنجاب پبلک سروس کمیشن لاہور کے سلیکشن بورڈ میں میں بھی ممبر کی حیثیت سے بار ہا جاتا رہا اور ڈاکٹر سید معین الرحمن کے واحد احسان کا بدلہ چکانے کی نہ صرف حتی المقدور کوشش کرتا رہا بلکہ سود در سود ان کا قرض اُتارتا رہا۔

ایک میں ہی کیا؟ ڈاکٹر سید معین الرحمن تو اب یہ دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ پورا پاکستان ان کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اپنی نئی متعارفہ و مخزونہ کتاب: ''صد رنگ' سدا بہار خط'' میں شامل ملتان کی ایک ریسرچ سکالر محترمہ صباحت مشتاق کے نام ڈاکٹر معین الرحمن اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر روبینہ (ترین) سے ہمارا عجب رشتہ ہے۔ ان کے پروفیسر شپ کا معاملہ طے پانے میں کچھ دخل ہمارا رہا۔ ان کے کاغذات حتمی رائے کے لیے ہمارے پاس آئے۔ وہ پروفیسر شپ کے منصب کی واحد امیدوار تھیں۔ ہماری تجزیاتی رپورٹ اور رائے' خدا کا احسان ہے کہ من و عن سنی گئی اور وہ پروفیسر شپ پر متمکن ہوئیں۔۔۔ اب اگر وہ کوئی اچھا کام کرتی یا کراتی ہیں تو اس سے ان کی شوبھا تو بڑھتی ہی ہے' ہمیں بھی در پردہ ایک روحانی بالیدگی میسر آتی ہے کہ ہمارا انتخاب اور فیصلہ صحیح تھا۔

یہی رشتہ ہمارا' اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے ڈین آف آرٹس سے ہے۔ یہی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ اردو و اقبالیات کے صدر سے۔ یہی شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی جام شورو کی چیئر پرسنز سے رہا۔۔۔ اور بالکل یہی صورت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے پروفیسر و صدر یا اس شعبے کے بعض سینئر اساتذہ سے ہے۔ ان عزیزوں میں سے کوئی بھی کسی علمی خدمت یا معاونت کے امیدوار ہوتے ہیں تو ہم اسے ''بیگار'' نہیں خیال کرتے' اُن کا حق جانتے ہیں۔۔۔ اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کر کے خود کو تازہ دم محسوس کرتے ہیں۔'' (صفحہ 124)

یہ ایک نجی خط کا اقتباس ہے جو اب کتاب میں چھپ کر سامنے آیا ہے۔ ملتان' بہاولپور' جام شورو اور اسلام آباد کی جن یونیورسٹیوں اور ان سے وابستہ جن افراد کا نام لے کر یا نام لیے بغیر ذکر کیا گیا ہے' اب یہ ان کا فرض ہے کہ حقائق کی روشنی میں ڈاکٹر معین الرحمن صاحب کے دعووں کی تائید یا تردید کریں۔ ہمیں تو اپنا اور فیصل آباد کے دیگر پی ایچ ڈی اساتذہ کا پتہ ہے جن کے بارے میں معین صاحب نے جو دعویٰ بھی کیا ہے وہ سو فیصد جھوٹ ہے۔ مشہور قول ہے کہ جو شخص ایک چیز کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے' اُس کی دوسری باتوں کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ مجھے تو معین صاحب کے سب دعوے پادر ہوا نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے بارے میں اُن کا یہ بیان ہے کہ:

''میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو ''اقبالیات'' کی جانب لایا۔'' (مکتوب ڈاکٹر سید معین الرحمن

مطبوعہ کالم ''محفلِ احباب'' ماہنامہ ''الحمرا'' لاہور شمارہ اپریل 2005ء صفحہ 90) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے چند روز پہلے راقم الحروف نے ٹیلی فون پر بات کی اور اس جملے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ معین صاحب کی پرانی عادت ہے کہ وہ ہر حال میں اپنی ٹانگ اُوپر رکھنی چاہتے ہیں۔ جس زمانے میں معین صاحب نذر سنز' اردو بازار' لاہور کے لیے درسی اور تالیفی نوعیت کا کام کرتے تھے' میں نے بی اے اور ایم اے (اردو) کے طلبہ کے لیے اقبال کی طویل اردو نظموں پر کتاب لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا کیونکہ یہ نظمیں ان کے نصاب میں شامل تھیں اور الگ سے ان کے تجزیاتی مطالعے اور پس منظر پر کوئی کتاب مارکیٹ میں موجود نہیں تھی۔ مَیں نے اس ضرورت کا ذکر معین صاحب سے کیا تو انہوں نے میری تائید کی' چنانچہ مَیں نے ''اقبال کی طویل نظمیں'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس کے دیباچے میں ڈاکٹر معین صاحب کا بھی شکریہ ادا کیا۔ یہ کتاب بعد ازاں سنگِ میل پبلی کیشنز' لاہور نے شائع کی اور اس کے متعدد ایڈیشن چھپے۔ حال ہی میں مَیں نے اس پر نظرِ ثانی کی ہے اور جا بجا اضافے کیے ہیں۔ معین صاحب نے اپنی کتابوں میں کئی اور جگہ بھی مجھ پر احسان جتایا ہے' خصوصاً میرے ایم اے (اردو) کا امتحان دینے پر ان کا اصرار اور نتیجہ میں میرے یونیورسٹی میں اوّل آنے پر فخر کا اظہار وغیرہ۔ مَیں چاہتا تو ''اقبال کی طویل نظمیں'' کے دیباچے سے معین صاحب کے شکریے والا حصہ نکال سکتا تھا لیکن میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ جو بات مَیں نے رسمی اور اخلاقی طور پر کتاب کے پہلے ایڈیشن میں لکھی تھی' اُسے کتاب کے نئے ایڈیشن سے حذف کردوں۔''

ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی صاحب سے بھی میری چند روز پہلے ریڈیو سٹیشن فیصل آباد کے ایک مذاکرے میں ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر ریاض مجید بھی گفتگو میں شریک تھے۔ ریکارڈنگ سے پہلے مَیں نے ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی صاحب کو بتایا کہ میرے' ڈاکٹر ریاض مجید' ڈاکٹر ریاض احمد ریاض اور فیصل آباد کے دیگر اساتذہ کے علاوہ' آپ کے بارے میں بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے آپ کو تحقیق کے کام پر لگایا اور اگر وہ فیصل آباد نہ گئے ہوتے تو آپ کو کبھی نہ ہائر ریسرچ ڈگری کا خیال آتا اور نہ اس کا موقع ملتا۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی کہنے لگے کہ نہ جانے معین صاحب ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ میری پی ایچ ڈی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مَیں نے تو ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کی فیصل آباد آمد (1974ء) سے بہت پہلے' جب مَیں گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں عربی کا استاد تھا' ''الشعر الصحابہ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں مَیں نے خاکہ (مع کتابیات) تیار کر کے مولوی محمد شفیع صاحب کو دکھا بھی دیا تھا اور انہوں نے میرا نگران بننے پر آمادگی کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن چند ہفتوں بعد مولوی محمد شفیع صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کے جانشین نے یہ کہہ کر مجھے خاکہ واپس کر دیا کہ اب مرحوم کے پائے کا کوئی

اور سکالر نظر نہیں آتا جو آپ کے تحقیقی کام کی نگرانی کر سکے' اس لیے آپ کسی اور موضوع کا انتخاب کر لیں۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی نے مزید کہا کہ میں نے بددل ہو کر اس وقت پی ایچ ڈی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ البتہ فیصل آباد میں جب آپ لوگوں نے پی ایچ ڈی کی تو میں بھی کر سکتا تھا' لیکن کالج کی مصروفیات کی وجہ سے مجھے وقت نہ مل سکا۔ تاہم میں نے آپ لوگوں کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے کے بعد اپنا خاکہ پنجاب یونیورسٹی میں جمع کرایا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب تو اُس سے بہت پہلے لاہور واپس جا چکے تھے۔ انہوں نے مجھے تحقیق کام پر کیا لگانا تھا؟ پھر میرا موضوع ''برصغیر پاک و ہند میں عربی نعتیہ شاعری'' تھا۔ معین صاحب کو تو عربی نہیں آتی۔ وہ عربی کی نعتیہ شاعری پر تحقیق کے سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے تھے؟''

ڈاکٹر ریاض مجید اور ڈاکٹر ریاض احمد ریاض دونوں میرے انتہائی قریبی دوست ہیں۔ تیس تیس برس گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں میرے رفقائے کار رہے ہیں۔ ایک سے روز فیصل آباد میں ملاقات ہوتی ہے اور دوسرے سے ہفتے میں ایک بار اسلام آباد' ٹیلی فون پر' رابطہ ہوتا ہے۔ دونوں نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اس دعویٰ پر تعجب بلکہ افسوس کا اظہار کیا اور اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر معین صاحب ''نارمل'' نہیں رہے' جبھی تو وہ فیصل آباد کے ہر استاد کو پی ایچ ڈی کرانے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ ہم چاروں (ریاض مجید' ریاض احمد ریاض' محمد اسحٰق قریشی اور راقم الحروف) کے علاوہ فیصل آباد سے ڈاکٹر احسن زیدی نے ''اردو میں منقبت نگاری'' ڈاکٹر سردار علی نے ''آغا شورش کاشمیری'' اور ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے ''اردو میں تاریخی ناول'' کے موضوع پر (ہمارے بعد) پی ایچ ڈی کر کے ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کو تحقیقی کام کی طرف مائل کرنے میں بھی ڈاکٹر معین صاحب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے کیونکہ وہ اس زمانے میں فیصل آباد میں تھے ہی نہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے اردو بورڈ آف سٹڈیز میں ہمارے رفیق کار پروفیسر عبدالرحمٰن شاکر مرحوم بہت موثر رکن تھے۔ صدر شعبہ اردو' گورنمنٹ کالج فیصل آباد کی حیثیت سے (معین صاحب کے لاہور چلے جانے کے بعد) پہلے (1981ء میں) پروفیسر عصمت اللہ خاں اور بعد ازاں (1989ء میں) راقم الحروف اردو بورڈ آف سٹڈیز کے' بر بنائے عہدہ' رکن بنے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اردو کے صدر اور چیئرمین اردو بورڈ آف سٹڈیز سمیت بورڈ کے سب ارکان ہمارے دیرینہ دوست تھے' اس لیے فیصل آباد کا کوئی ریسرچ سکالر اپنے خاکے کی منظوری کے لیے کسی معین الرحمٰن کا محتاج نہ تھا۔

جب اتنے زندہ لوگ گواہی دے رہے ہیں کہ ہمیں تحقیقی کام کی طرف مائل کرنے میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا کوئی ہاتھ نہیں ہے تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب جن دیگر دور افتادہ حضرات پر بھی پی ایچ ڈی کرانے اور اعلیٰ مناصب پر منتخب کرانے کے احسانات جتا رہے ہیں' اُن کی حیثیت بھی ''دن کے سپنے'' سے زیادہ نہیں۔ پتہ نہیں اس طرح کی دروغ گوئی سے وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے

ہیں اور اپنی ٹوپی میں مزید کون سے (سُرخاب کے) پَر لگانا چاہتے ہیں؟ کیا اُن کی شہرت (یا رسوائی؟) کے لیے اُن کی وہ ساڑھے چار درجن کتابیں کافی نہیں جنھیں وہ اپنے بیٹے کے اشاعتی ادارے (الوقار پبلی کیشنز لاہور) سے چھپنے والی ہر نئی کتاب میں بطور اشتہار درج کر کے نہال ہوتے رہتے ہیں؟

بعض سطح بین قارئین جو زندگی کو صرف سفید اور سیاہ خانوں میں بانٹ کر دیکھنے کے عادی ہیں' بڑی سادگی سے سوال کرتے ہیں کہ آخر "ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ––– تحقیق کے چراغ تلے۔۔۔" جیسی کتابوں کی کیا ضرورت ہے؟ میں انہیں یہی جواب دوں گا کہ اب ایسی کتابوں کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ آج کے برق رفتار زمانے میں جب بازار میں کھوٹے سکوں کا چلن عام ہے اور اُن کی کھنک اور مصنوعی چمک میں کھرے سکوں کی پہچان دشوار ہو گئی ہے' آج جب جعلی محققوں نے اخباری پروپیگنڈے اور تشہیری وسائل سے کام لے کر اصلی محققوں کو گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے' آج جب دوسروں کی عمر بھر کی محنت کے حاصل پر غاصبانہ قبضہ کر کے اور اس پر اپنے نام کا ٹھپہ لگا کر ڈھیروں مال کمایا جا رہا ہے' آج جب اعلیٰ عہدوں پر فائز نام نہاد ادباء کی جھوٹی اناؤں کے غباروں میں ہوا بھر بھر کر انہیں بڑا' بہت بڑا بنایا جا رہا ہے' آج جب خوشامدی تلامذہ' منافق رفقا اور حریص مدیرانِ جرائد' اپنے احمق ممدوحین کو عظمت کے فرضی تاج اور شہرت کی موہوم قبائیں پہنا رہے ہیں' کوئی تو ہو جو اُس مشہور' معصوم' حقائق بیں بچے کی طرح سچ بولے اور تالی بجا کر کہے کہ "دیکھو۔ بادشاہ ننگا ہے!"

(21-اپریل 2005ء)

---گزارشِ احوالِ واقعی!

زیرِنظر کتاب کی تسوید کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت وجود میں نہیں آئی بلکہ یہ ایک جذباتی اور اضطراری ردِعمل کا نتیجہ ہے جسے ایڈیٹر کے نام ایک مراسلہ میں بیان ہو جانا چاہیے تھا۔ عموماً ہر قسم کے جذباتی اور اضطراری ردِعمل کا ظہور ایسا اچانک ہوتا ہے کہ علم اور شعور بعد میں بیدار ہوتے ہیں۔ زیرِنظر کتاب کا محرک ایسی ہی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔ اس حوالہ سے آپ دیباچہ (پڑھوں میں شکوے سے---از: ڈاکٹر انور محمود خالد) میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ایک دلآزار وضاحتی نوٹ (مطبوعہ ماہنامہ ''الحمرا'' لاہور نومبر 2003ء) کا متن ملاحظہ فرما چکے ہیں---ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اس وضاحتی نوٹ کے ایک ایک لفظ سے مترشح ہے کہ انہوں نے یہ میلہ ڈاکٹر وحید قریشی کا کمبل (چرانے) چھیننے کے لیے لگایا ہے---ڈاکٹر وحید قریشی کی ممتاز علمی اور اہم ادبی شخصیت کو مطعون کرنے کے لیے شائع کیے گئے اس ''وضاحتی نوٹ'' کی خبر بہت دیر سے علمی حلقوں تک پہنچی کیونکہ:

(الف)۔ اس وضاحتی نوٹ کے حامل رسالہ کی اشاعت بہت محدود ہے۔

(ب)۔ یہ نوٹ متن کے ساتھ ملا کر دزدانہ انداز میں درج کیا گیا ہے' غالباً اسی لیے ایڈیٹر کی نظر سے اوجھل رہا۔

(ج)۔ عام قاری' ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مرتبہ' مشاہیر اور غیر معروف لوگوں کے غیر علمی خطوط اور مرتبہ متعارفات پر رسائل کے مشتمل صفحات کو Skip کر جاتے ہیں کیونکہ وہ ان مندرجات کو علمی یا ادبی تحریریں تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کے اس طریقِ کار کو دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر یا

مشاہیر سے خواہ مخواہ ایسوسی ایٹ (منسلک) ہو کر بڑا قرار پانے کا ایک حربہ گردانتے ہیں۔

بہر حال راقم الحروف کو تلاش بسیار کے بعد دو تین ماہ کی تاخیر سے محولہ بالا مضمون (مولانا حامد علی خاں کے چند خطوط) اور اس پر جناب عرفان احمد خان کے ردِ عمل پر مبنی مراسلہ کی فوٹو کاپی میسر آئی۔ اس مراسلہ میں حق گوئی کا اظہار دیکھ کر قلبی طمانیت کا احساس ہوا کہ ابھی اجتماعی اور انفرادی ضمیر میں رمق باقی ہے اور ابھی بری بات بننے سے انکار کرنے اور اُسے غلط کہنے کی ہمت رکھنے والے افراد زندہ ہیں۔

تاہم راقم الحروف کو اندیشہ ہے کہ اس کی زیرِ نظر تالیف کو بھی اس کی سابقہ تالیف: ''ناطقہ سر بگریباں'' (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تحقیق نگاری) کی طرح قارئین پہلی سطح پر ملاحظہ فرمانے کو ہی شاید کافی خیال کریں اور اس کے ثانوی اطراف کے مطالعہ کی طرف توجہ نہ فرمائیں۔ میں مختلف موقعوں پر ایک سوال کے جواب میں اس امر کا اظہار کرتا رہا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے کبھی کوئی سروکار نہ رہا' عناد کیا ہوتا؟ میں نے تو محض اُردو میں ترجمہ نگاری کی تاریخ کے ایک اہم کارنامہ کے باب میں ان کے ایک مضحکہ خیز مغالطہ کے ازالہ کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ میرا تجربہ ہے کہ کسی تحریر میں ایک بار بیان ہو جانے والے مغالطہ کا کبھی استیصال نہیں ہو پاتا۔ بہر حال ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے میری ازالہ کی کوشش پر اپنے ردِ عمل میں آداب' اخلاق' لحاظ اور شناسائی کو بالائے رکھ دیا اور اپنے علمی و ادبی استکبار کا اظہار کرتے ہوئے مجھے یوں ڈانا جیسے ''اُلٹا چور۔۔۔'' خدا نے میری مدد کی' سارے شواہد موجود تھے' ثابت ہو گیا کہ موصوف کی ''ڈانٹ ڈپٹ'' بجا نہ تھی۔ انہوں نے اپنے اسی ردِ عمل میں اپنی تمکنتِ علم اور جلالتِ تحقیق کا طعن و تعریض کے پیرائے میں اظہار بھی کیا تھا' جو ان کے ایک ہی کتابچہ: ''کتابیاتِ عزیز احمد'' پر راقم کے ایک تبصرہ نے ادھیڑ دیا۔

بہر حال میری تالیف: ''ناطقہ سر بگریباں'' کی دوسری' تیسری معنوی سطوح اگرچہ مخفی تھیں مگر بہت واضح! کہ ہمارے ملکی ادب اور قومی تعلیم و تدریس کے شعبوں میں انحطاط اور زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔

زیرِ نظر تالیف بھی ایک سے زیادہ سطوح رکھتی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر معین الرحمٰن کے شخصی رویئے' معاشرتی طرزِ عمل' علمی' تحقیقی اور تعلیمی کاموں کے جائزے اور تبصرے تک محدود سمجھ کر نہ پڑھیے' اسے علمی و ادبی معیار کی آخری حد تک بگڑی ہوئی صورتِ حال کا اشاریہ جانیے۔ قوم' حکومت' یونیورسٹیاں' اکادمیاں' تعلیمی ادارے' تحقیقی ادارے اور اشاعتی ادارے' اپنے علم و ادب اور تعلیم کی ہر ذمہ داری' معلمین' مدرسین' مصنفین اور محققین کے سپرد کر کے بری الذمہ ہو چکے ہیں اور ترقی و بہتری کی رپورٹوں پر شانت ہو جاتے ہیں۔ وہ اس سے بے خبر ہیں کہ ملک میں افراطِ زر کی طرح افراطِ تعلیم بھی پیدا ہو گئی ہے اور ادب کی ترقی کے جھوٹے اعداد و شمار (جائزے) تواتر سے شائع ہو رہے ہیں۔ اربابِ بست و کشاد کی ہمدردانہ پالیسیوں

سے مختلف اعلیٰ تعلیمی درجوں کے ''ڈگری ہولڈرز'' کی تعداد میں روز بروز اضافہ ضرور ہوتا جائے گا مگر آثار سے ہویدا ہے کہ معیارِ تعلیم تحلیل ہوتا جائے گا۔ یہ بات Universal Truth کی حامل ہے کہ جب کوئی چیز پھیلتی ہے تو اس میں سے گہرائی غائب ہو جاتی ہے' لہٰذا ایسے اقدامات ہونے چاہئیں کہ تعلیم تو خوب پھیلے مگر اس کے ساتھ ہی علم گہرا اور زیادہ گہرا ہوتا جائے کیونکہ تعلیم کی افادیت تو گہرائی سے بڑھتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ علم و ادب کی اس بگڑی ہوئی صورتِ حال کو کیسے سدھارا اور سنوارا جا سکتا ہے؟

اس کا ایک ہی جواب ہے:

''تعلیمی اور ادبی احتساب!''

مگر یہ کون کرے گا اور کیوں کرے گا؟ یہی لمحہ فکریہ ہے!

قارئین اور متعلمین ایک کام تو کر سکتے ہیں کہ وہ غیر معیاری تحریر' تصنیف' تالیف' تدوین اور تدریس قبول نہ کریں۔

مجھے اطمینان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیرِ نظر کتاب کی صورت میں مجھے فرضِ کفایہ ادا کرنے کی ہمت اور توفیق عطا کی۔

2 دسمبر 2004ء

صدیق جاوید

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن
— تحقیق کے چراغ تلے...

ڈاکٹر صدیق جاوید

قدرت کی کرشمہ سازیاں گوناگوں اور بوقلموں ہیں مگر انسان اس کے کسی ایک کرشمہ کا پورا بھید جاننے سے قاصر ہے۔ مثلاً قدرت کسی پر فیاض ہوتی ہے تو اس کی بے پایانی حساب میں نہیں آتی اور بخیلی پر اترتی ہے تو خلقِ خدا ایک ایک بوند اور ایک ایک تار کو ترس جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی ستم ظریفی قدرت نے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے ساتھ روا رکھی۔ قدرت ان پر فیاض ہوئی تو ان کے سر میں تصنیف و تالیف کا ایسا سودا بھر دیا کہ معلوم ہوتا ہے یہ پہنائے فلک میں بھی نہیں سمانے کا مگر اپنے امساک کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں شوقِ تصنیف کے ایک خصوصی لازمہ سے محروم رکھا یعنی انہیں ذہنی اپج اور تحریر کی انفرادی صلاحیت عطا نہ کی۔ سو اب برسوں سے معین الرحمٰن صاحب اپنے پسندیدہ اردو کے دو تین مشہور ادیبوں کے مضامین میں سے تراشے نکال نکال کر ترتیب دے رہے ہیں یا پھر اپنے انہی پسندیدہ ادیبوں کے اقتباس نقل کرتے کرتے اپنی انگلیاں چٹخا لیتے ہیں۔ جب یہ اقتباس نقل کر لیتے ہیں تو انہیں ان اقتباسات کی نقل نویسی اور مشقت کی بنا پر خود اپنی تحریر کا گمان (التباس) ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی طبیعت میں شوقِ تصنیف و تالیف سدا موجزن رہتا ہے۔ ہر ایک دو ماہ بعد ایک نئی کتاب پر اپنا نام دیکھنے کا اشتیاق انہیں بے بس کر دیتا ہے لہٰذا وہ کوئی نئی بات سوچنے' غور و فکر کرنے اور اس کے لیے کوئی موزوں پیرایۂ اظہار اختیار کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کوئی نیا خیال' نیا موضوع یا نیا مضمون اختراع کرنے کی صلاحیت قدرت کی طرف سے انہیں ودیعت نہیں ہوئی۔ کسی خیال کو سہولت سے قلم بند کرنے یعنی تصنیف و تحریر کے فن سے انہیں طبعی مناسبت نہیں ہے اس لیے ان کے نثری بیانات میں آورد اور کھینچ تان کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ قدرت نے ایک عام انسان کی طرح مختلف عناصر کے آمیزہ سے ان کا بھی مزاج تیار کیا ہے۔ ان کے مزاج کے غالب عنصر کو Sneakiness

سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مزاج کی اس خصوصیت کا بھرپور مظاہرہ ان کی ایک ''وادینی تحریر'' ''مولانا حامد علی خاں کے چند خطوط'' مطبوعہ ماہنامہ الحمراء لاہور بابت نومبر 2003ء میں ہوا ہے۔ مرحوم زعماء کے خطوط یقیناً تبرکات کی حیثیت رکھتے ہیں مگر محض خطوط کی ترتیب و تدوین' اشاریہ سازی' کتابیات وغیرہ کو تحقیق سمجھ کر اترانا تو مفلوج لوگوں کا وطیرہ ہے کیونکہ تحقیق ایک فعال ذہن' جاندار تصور اور متحرک خیال رکھنے والے کا مطالبہ کرتی ہے اور ذاتی محنت اور جستجو کے بعد نتائج حاصل کرتی ہے۔ پھر ان کا برملا اظہار کرتی ہے۔ اسی طرح تنقید و تعریض بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس میں مخالف کو طبل بجا کر للکارنا بنیادی شرط اور شیوۂ مردانگی ہے۔ یہ ساری باتیں معین الرحمٰن صاحب کے محولہ بالا ''مولانا حامد علی خاں کے چند خطوط'' کی اشاعت دیکھ کر ذہن میں آئیں۔

سید معین الرحمٰن manipulation اور Exploitation میں کافی مستعد ہیں۔ انہوں نے مولانا حامد علی خاں کے صاحبزادے شاہد علی خاں ایڈیٹر ''الحمراء'' لاہور کو ان کے والد مرحوم کے یہ خطوط اشاعت کے لیے بھجوا کر انہیں جذباتی مغالطے میں مبتلا کیا اور ان میں سے ایک خط کے حاشیے میں اپنی فطرت کے عین مطابق چوری چھپے (Sneakingly) ایک کافی طویل نوٹ ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف شامل کر دیا۔ بظاہر انہوں نے فنِ تحقیق کی ایک روایت یعنی وضاحتی حاشیہ کا سہارا لیا ہے لیکن اگر حاشیہ نگاری یا فٹ نوٹ کے فنی تقاضوں کی روشنی میں متذکرہ ''وضاحتی حاشیہ'' پر تنقیدی نظر ڈالیں تو صاف طور پر یہ نوٹ حاشیہ نگاری کی فنی حدود کی خلاف ورزی' تجاوز اور Violation کی ذیل میں آتا ہے او ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف ڈاکٹر معین الرحمٰن کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں بغض و کینہ اور دیرینہ عداوت کا مظہر اور ثبوت ہے اور ان کی اُس دلی آرزو اور بے تاب تمنا کی ناکامی اور شکست پر ملال اور دکھ کا اظہار ہے جو وہ گورنمنٹ کالج سے اپنی ریٹائرمنٹ سے قبل کے چار پانچ برسوں میں پرورش کر رہے تھے اور اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق ریٹائرمنٹ کے بعد گورنمنٹ کالج میں تاحیات اپنی موجودگی کا بقول (ان کے اپنے) نقشہ بنا رہے تھے۔ اس کا بالواسطہ ثبوت ان کا ''الحمراء'' فروری 2004ء میں مطبوعہ وہ جواب ہے جو انہوں نے جناب عرفان احمد خان (ناول نگار) کے ایسے ہی تاثر (مطبوعہ محفلِ احباب ''الحمرا'' دسمبر 2003ء) کے سلسلے میں دیا ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مولانا حامد علی خاں کے چند (5) خطوط مطبوعہ ''الحمراء'' نومبر 2003ء کے آخری خط میں (صفحہ 20 پر) مولانا مرحوم کے ایک تہنیتی فقرہ پر وضاحتی نوٹ لکھتے ہوئے زیرِ نظر شمارہ کے صفحہ 22-20 پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے اردو کی کلاسوں کے آغاز کا پس منظر بیان کیا ہے جو پس منظر کے ڈپلومیٹک نام کے پردے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی ہجو و ہزل اور ذم کا شرمناک اظہار ہے جس کے ذریعے وہ اپنی طالبات کو اپنی ''حب جی سی'' اور ایمان افروزی کا ثبوت باور کرانا چاہتے ہیں۔ عرفان احمد خان نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے متذکرہ بالا پس منظر یا ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف ہجویہ بیان کا نفسیاتی محرک بیان

کرتے ہوئے لکھا ہے:

''۔۔۔ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات گرامی اردو ادب میں اتنی متنازعہ نہیں جتنی خود معین صاحب کی ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی کا گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ایمریطس مقرر ہونا وہ دکھ ہے جس سے جانبر ہونے میں معین الرحمٰن کو ایک عرصہ لگے گا کیونکہ پہلے تو انہوں نے گورنمنٹ کالج میں توسیع حاصل کرنے کی ناکام کوششیں کیں۔بعد میں پروفیسر ایمریطس کی کرسی کو 'جپھا' ''ڈالنا چاہا اور بالآخر ناکام ہوکر' ٹھنڈے ٹھار ہوکر ''بے وقار'' پبلی کیشنز کو چلانے پر مجبور پائے گئے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا مسئلہ جہاں تک میری سمجھ میں آیا ہے یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے خبروں میں In رہنا چاہتے ہیں اور خبروں میں ان رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ویسے بھی معین صاحب جس عمر میں ہیں اس عمر میں انسان صرف مسئلہ ہی کھڑا کر سکتا ہے۔''

(الحمرا،دسمبر 2003ص 80)

اگر مندرجہ بالا سطور عرفان احمد خان کے شنیدہ احوال یا مشاہدہ اور تجزیہ ہیں تو ان کی ژرف نگاہی کی داد دینا پڑے گی۔جبکہ معین الرحمٰن صاحب نے ''الحمراء'' شمارہ فروری 2004ء میں خان صاحب کی تردید کرتے ہوئے ان کی تجزیاتی سطور کا بالواسطہ اثبات کیا ہے۔معین الرحمٰن صاحب کے حسب ذیل تردیدی بیان کو آخری حد تک ایک اقرار نامہ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔وہ ہمارے اور اپنے ماہر نفسیات رفیق کار پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر سے استفسار کر سکتے ہیں۔اب معین الرحمٰن صاحب کا متذکرہ اقرار نامہ یعنی عرفان احمد خان کے بیان کا استرداد ذرا غور سے مطالعہ کیجیے۔وہ لکھتے ہیں:

''عرفان احمد خان کی ان سطور میں اوپر تلے کئی صریح غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔خدا کا شکر ہے کہ میرا نقطۂ نظر چھپی ہوئی شکل میں بہت پہلے سے موجود اور ریکارڈ پر محفوظ ہے۔اپریل 2003 میں ایک بچی نے مجھ سے پوچھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا آپ اس کوشش میں ہیں کہ پھر کہیں کوئی تدریسی ذمہ داری قبول کر لیں؟

اس سوال کے جواب میں میرے لفظ (الفاظ) یہ تھے:

''آپ کوشش کہتی ہیں۔میں تو اس کے برعکس اس سے پناہ مانگتا ہوں۔میں اپنی اننگز بھلی یا بری کھیل چکا اب اس سے چمٹے رہنا کیا۔یہ اچھا بھی نہیں لگتا اور اپنی حد تک میں نہ چاہتا ہوں نہ اسے پسند ہی کرتا ہوں۔اب کہ ''آزادی'' ملی ہے میں ازسرنو کسی ''قید یا پابندی'' کا خواہاں نہیں۔اس کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا''''جی سی یو'' سے بھی' جہاں میری مدت ملازمت کا طویل ترین اور خوشگوار ترین دور گزرا' میں کوئی ''معاشی پیش کش'' Monetary Package قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر قطعاً آمادہ نہیں'' (کیا دلی طور پر ہمہ وقت آمادہ ہیں؟ مستفسر صدیق جاوید)۔[بے شک آپ اپنے اگلے پیرا کی پہلی دو سطروں میں اس کا ہاں میں جواب دے چکے ہیں۔]اب ان دو سطروں کے بشمول ان سے اگلی چار سطریں بھی ملاحظہ

فرمائیں:

"اگرچہ شعبے یا "جی سی یو" سے "کسی اعزازی" نسبت یا تحقیقی یا نصابی امور میں رہنمائی کے لیے میں رضا کارانہ ہمہ وقت تیار ہوں۔ اس نوع کی کوئی خدمت میرا اعزاز ہوگا لیکن

I must emphasize its being without any monetary remuneration.

(i)۔ نذر معین: مرتبہ محمد سعید مطبوعہ لاہور 2003ء ص 200

(ii)۔ مطبوعہ رسالہ "نگار" مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی' اگست 2003ء ص 81

میرے اس بہت واضح اور مطبوعہ اعلان کے ریکارڈ پر بہت پہلے سے موجود ہوتے ہوئے آپ ہی بتائیے کہ میں مراسلہ نگار موصوف کے "الزامات" اور "تہمتوں" پر ان سے معذرت خواہی کی توقع کروں یا نہ کروں؟"

(مطبوعہ ماہنامہ الحمرا لاہور' فروری 2004ء ص 71,70)

راقم نے ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں الحمرا نومبر 2003ء میں چھپی معین الرحمٰن صاحب کی ہجو و ہزل کی مذمت کے لیے نکات جمع کرتے ہوئے یہ خیال کیا تھا کہ وہ قارئین کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے اپنی قریبی اور گہری جان پہچان کی بنیاد پر بتائے گا کہ معین الرحمٰن کا انٹرویو کرنے والی بچی کا ان کی ریٹائرمنٹ کے حوالے سے جواب Prompted ہے۔ اور محمد سعید کی مرتبہ کتاب "نذر معین" ان ڈاکٹر معین الرحمٰن کی Commissioned کتاب ہے۔ راقم عزیزی محمد سعید کی مجبوریوں اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ہاتھوں ان کی Exploitation کی تفصیلات بیان کر کے محمد سعید صاحب کی عزت نفس کو مجروح اور ان کی ذہانت اور صلاحیت کی تحقیر نہیں کرنا چاہتا اور صرف اس قدر جان لینا شاید مفید ہو کہ محمد سعید دوران تعلیم ایک ضرورت مند طالب علم تھے اور معین الرحمٰن کی "صدارت شعبہ" کے زمانے میں گورنمنٹ کالج کے اس شعبہ کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جہاں تک رسالہ "نگار" اور اس کے مرتب جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کے خاندان کے باہمی تعلقات کا معاملہ ہے تو اس باب میں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ یہ تعلق گھر کی بات ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن' فرمان بھائی کو کچھ بھی برائے اشاعت بھجوائیں اسے چھپنا ہی چھپنا ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ثابت کرنے کے لیے کہ معین الرحمٰن صاحب نے اپنی شان بڑھانے کے لیے دوسروں کے نام سے جن کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے انہیں موصوف اکثر بہ نفس نفیس مرتب کرتے ہیں اور ایسی کتابوں کے اندر جو مواد' انٹرویوز یا مضامین کی شکل میں جمع ہوتا ہے' وہ ان کا اپنا لکھا ہوتا ہے مگر وہ ایسی تحریروں یا مرتبہ کتابوں پر اپنے کسی بچے یا بہن یا رفیق کار کا نام درج کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تاثر قائم کرنا ہوتا ہے کہ ان کی اپنی عظمت کے بلند آہنگ تذکرے' بے لوث' غیر جانبدارانہ ہیں اور کسی دوسرے کا کام ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اتنی محنت اور مشقت سے نقل نویسی (دیکھیے "الحمراء" نومبر 2003ء صفحہ 18 آخری ڈیڑھ سطر) کا کام

کرنے میں ساری عمر لگے رہے کہ انہیں اپنی تصنیف وتحریر کا ہوش نہ رہا۔ اپنی ذات پر مرتبہ کتب پر خصوصاً اپنے بچوں اور بہنوں کا نام دینے کا دوسرا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ وہ انہیں بطور ادیب Establish کر جائیں تاکہ جب وہ پبلک سروس کمیشن میں ملازمت کے لیے جائیں تو اپنا ریسرچ ورک ظاہر کر سکیں۔ یکسانیت سے بچنے اور بوقلمونی کا رنگ پیدا کرنے کے لیے اپنے بارے میں مرتبہ ایک کتاب ''دیوانِ غالب۔ تجزیہ وتحسین'' پر اپنے دو بے زبان ماتحتوں (پروفیسر اصغر ندیم سید اور پروفیسر معراج نیر زیدی) کا نام دے دیا اور دوسری مرتبہ کتاب ''نذرِ معین'' پر محمد سعید کا نام دے دیا۔ ان تینوں حضرات نے (جہاں کہیں انہیں بولنے کا یارا ہوا) بتایا کہ بس ہمارا تو نام ہی نام ہے' کام تو سید کرتا ہے۔ یعنی باقی آرٹیکلز کی جمع آوری' ان کی طباعت اور پروف ریڈنگ وغیرہ موصوف کا اپنا کام ہے۔ ہم انہیں اس سے منع کرنے یا اپنے نام کے استعمال سے انکار کرنے کی جرأت وہمت نہیں رکھتے تھے۔

عرفان احمد خان کے بیان کی ڈاکٹر معین الرحمٰن نے تردید کرتے ہوئے ایک بچی کے استفسار او راپنے جواب کو ''بہت پہلے سے موجود'' مطبوعہ اعلان کا ریکارڈ بتایا ہے۔ راقم اس کا تجزیہ وتحلیل کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ اپنی مستفسر کو وہ جو ایک بچی کی دبیز چادر میں لپیٹ رہے ہیں' وہ بچی کون ہو سکتی ہے؟ راقم شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے اردو کی تدریس کے پہلے گیارہ برس مسلسل اور متواتر دو پرچوں' ناول اور اقبالیات کی تدریس اور تھیسس کی نگرانی 1996ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک کرتا رہا ہے اور بعد کے پانچ سات برس کے طالب علموں کو بھی شعبہ میں اپنی آمد ورفت کے باعث جانتا ہے۔ اس نے اپنا خیال دوڑایا اور سوچا کہ وہ کون سی طالبہ ہو سکتی ہے جس کا ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ریٹائرمنٹ اور ملازمت میں توسیع یا پروفیسر ایمریطس کے عہدہ پر فائز ہونا ورد سر ہو سکتا ہے؟ اسی کشمکش اور ''سوز وساز'' میں راقم نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اپنے بتائے ہوئے حوالہ کے مطابق کتاب موسومہ ''نذرِ معین'' مرتبہ محمد سعید صفحہ نمبر 200 پر کھولی تو اس پر ایک شاندار انکشاف ہوا' جو یہ ہے کہ اس صفحہ پر ایک چھ لفظی عنوان ''ریٹائرمنٹ پر ابو سے ایک مکالمہ'' کے نیچے انٹرویو کنندہ کا نام صباحت معین سعد درج ہے۔ اُس کا پہلا سوال اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کا جواب وہی ہے جو انہوں نے عرفان احمد خان کے ''الزامات اور تہمتوں'' کو رد کرنے کے لیے ''الحمراء'' میں دیا ہے۔

پروپیگنڈا کے اصولوں کو اپناتے ہوئے توسیع ذات اور فیملی پروموشن کے لیے معین الرحمٰن صاحب بیماری کی حد تک اپنے اور متعلقین کے نام کو بیزار کن تکرار کے ساتھ پرنٹ میں لاتے ہیں۔ میری لائبریری' میرا مخزونہ' میرا ذخیرہ کتب اور میرے ذخیرۂ کتب کے اندر خصوصی گوشہ اور اس گوشے پر مضامین الگ ہیں۔ ایسا وطیرہ رکھنے والا شخص کیسے اور کیوں اپنا اور اپنی بیٹی کا نام پرنٹ میں لانے کا موقع ضائع کر سکتا ہے؟

سوال یا معمہ یہ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے دل کا وہ کون سا چور ہے جو انہیں اپنی فطرت اور عادت کے خلاف اپنی بیٹی صباحت معین سعد کا نام ظاہر کرنے سے روکتا ہے اور انہیں یہ لکھنے پر مجبور کرتا ہے کہ

''اپریل 2003ء میں ایک بچی نے مجھ سے پوچھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد۔۔۔'' آخر وہ راز کیا ہے جس کی یہ پردہ داری ہے؟ دراصل ڈاکٹر سید معین الرحمٰن آمدہ دنوں کے نقشے بنانے اور پیش بندی کرنے والے آدمی ہیں مگر وہ یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی اسے پس پشت ڈالتے رہتے ہیں کہ جو کچھ پردۂ تقدیر میں ہے وہ اس کا نقشہ بنانے اور اس کی پیش بندی کرنے سے قاصر ہیں۔ ''اس بچی'' کا استفسار بھی معین الرحمٰن کی کچھ ایسی ہی پیش بندی کا شاخسانہ ہے۔ کچھ ان کے اپنے ذاتی کارناموں اور کچھ خارجی حالات و واقعات نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ مستقبل قریب میں وہ نہ تو گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ایمریطس بننے میں کامیاب ہو سکیں گے نہ ہی کنٹریکٹ پر شعبہ میں آپائیں گے۔ حتیٰ کہ انہوں نے کسی ''اعزازی نسبت'' سے بلا تنخواہ کام کرنے کی پیش کش بھی ریکارڈ کر لی کہ کل کلاں ان کی اپنی انگیخت پر یا کسی اور سبب سے کوئی عرفان احمد خان ان کی ''جنت گم گشتہ'' سے دوری پر تالی پیٹے تو اس وقت اپنی خفت مٹانے کے لیے کچھ لوازمہ (ان کے الفاظ میں ''ریکارڈ'') تیار کر لینا چاہیے۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن ریٹائرمنٹ کے پانچ ماہ بعد تک اپنی ''جنت گم گشتہ'' میں واپس پہنچنے کے خواب دیکھتے رہے۔ وسط اپریل 2003ء میں جب انہیں یقین ہو گیا کہ ''جنت گم گشتہ'' سے دوری تو ہر روز زیادہ ہوتی جا رہی ہے تو مایوس ہو کر اس انٹرویو کا ڈول ڈالا گیا۔ اس خیال کی تائید و توثیق کے لیے درج ذیل چند تاریخیں ذہن میں رکھنی چاہئیں:

1۔ ریٹائرمنٹ بطور پروفیسر و صدر شعبہ اردو' گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور' 4 نومبر 2002ء (نذر معین: ص 534)

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

2۔ ریٹائرمنٹ پر ابو سے ایک مکالمہ

مقدمہ' 14 اپریل 2003ء (نذر معین: ص 210-200)

3۔ متذکرہ مکالمہ کی اشاعت: رسالہ نگار اگست 2003ء (بحوالہ الحمرا فروری 2004ء ص 71)

4۔ متذکرہ مکالمہ (شامل: نذر معین) سال اشاعت 2003ء

اس پس منظر اور پیش منظر سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی گورنمنٹ کالج میں بعد از ریٹائرمنٹ نئی Assignment کی ناکام کوشش کے بعد بے نیازی کا اظہار ایک After Thought بات ہے اور کسی ایسے ہی (جیسا عرفان احمد خان کے ریمارکس نے پیدا کیا) متوقع موقعہ کے لیے ایک جواز کے طور پر پیش کرنے کے لیے ہے۔

متذکرہ بالا سوال انٹرویو کا پہلا سوال ہے جسے ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ایک کارتوس سمجھ کر چلایا ہے مگر وہ یہ قیاس نہ کر پائے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کے پانچ چھ مہینوں میں یہ کارتوس نم خوردہ ہو چکا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ شاید عرفان احمد خان رازوروں سے باخبر ہیں اور ان کی ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بارے میں گفتگو کے انداز ایسے محرمانہ ہیں کہ معین الرحمٰن صاحب سے جھٹلائے نہیں بنتے۔ موصوف' خان صاحب کے جواب میں

ان ہی کو Quote کرتے ہوئے ان کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں (''الحمراء'' فروری 2004ء ص70):

''ڈاکٹر وحید قریشی صاحب پاکستان کے نمبر ون محقق ہیں۔''

اس پر معین الرحمٰن کا حاشیہ دیکھیے:

''میں نے انہیں دو نمبر کب کہا؟ ان کے محقق ہونے یا نہ ہونے کا تو میرے مفروضے میں ذکر تک نہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور اس کے شعبہ اردو سے ان کا جو سلوک عمر بھر رہا' اس کے اظہار میں کوئی ''کمی'' یا کسر رہ گئی ہو تو عجب نہیں'' (''الحمراء'' فروری 2004ء ص70)

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ''الحمراء'' نومبر 2003ء میں ڈاکٹر وحید قریشی پر جو خونریز حملہ کیا تھا' حملہ آور موصوف اس کے بارے میں یہ پوچھتے ہیں۔ کیا ہمارا وہ ''نشانۂ قتل'' جسے ہم نے مکمل طور پر کاٹ کر اطمینان کر لیا تھا' کیا عجب ہے کہ وہ ابھی تک سسک رہا ہے۔ جس طرح Vendetta اور Fued میں مخالف کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہر ہتھیار استعمال کر لیا جاتا ہے وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف ''الحمراء'' نومبر 2003ء میں استعمال کر لیا تھا۔

اب حاشیہ نگاری کے فنی حوالے سے بھی مولانا حامد علی خاں کے مکتوب نمبر 5 پر ڈاکٹر معین الرحمٰن (مرتب اور تعارف کنندہ) کے سوا دو صفحے پر مشتمل نوٹ کا جائزہ لینا مفید ہوگا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف یہ معاندانہ حاشیہ غیر مناسب اس لیے بھی ہے کہ یہ حاشیہ نگاری کی فنی شرائط سے تجاوز کی ایک افسوس ناک مثال ہے۔ اصولی طور پر یہ حاشیہ اپنی ابتدائی ڈھائی سطروں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھڑاس نکالنے کے لیے فٹ نوٹ کی شکل میں دیا گیا حاشیہ بھی کسی حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے مگر چاہیے یہ تھا کہ رسالے کے سوا دو صفحوں کا معاندانہ نوٹ مولانا حامد علی خاں کو شیلٹر بنا کر لکھنے کی بجائے ڈاکٹر معین الرحمٰن خود سامنے آ کر یہ کردار کش مضمون لکھتے۔ شنید ہے کہ وہ غیر معروف ماہناموں اور ہفت روزوں میں (جو ڈھونڈے بھی نہیں ملتے) کبھی صابر لودھی اور کبھی محمد خان اشرف جیسے اپنے سابقہ مخلص مشیروں اور محافظوں کے خلاف دو چار جملے چھپوا کر اپنی مخدرات کے درمیان بیٹھ کر شیخی بگھارتے ہیں کہ دیکھو میں نے فلاں فلاں کا دھڑن تختہ کر دیا۔ اگر وہ اشاریہ سازی' ترتیب کاری کرتے کرتے یہ سمجھ گئے ہیں کہ ان سے کچھ نہیں بن پایا تو چلو اب حاشیہ نگاری میں ہی قسمت آزمائی کرنی چاہیے تو اس کا بھی انہیں سلیقہ اور قرینہ سیکھ لینا چاہیے۔ اگر انہیں حاشیہ نگاری کا شعور ہوتا اور انہیں قارئین کی معلوماتی مدد اور راہنمائی کا احساس ہوتا تو مولانا حامد علی خاں کے ان 5 مکتوبات پر انہیں کم از کم مندرجہ ذیل پانچ حواشی کا تقاضا نظر آتا۔

1۔ خواجہ منظور حسین کی ماہر تعلیم' انگریزی کے ممتاز پروفیسر اور گورنمنٹ کالج کے نامور پرنسپل کے طور پر کیسی ہی اعلیٰ شہرت کیوں نہ رہی ہو نئی نسلوں کے قارئین کو ان کی ادبی خدمات سے روشناس کرانے کے لیے

خواجہ صاحب پر تعارفی حاشیہ ضروری تھا۔

2۔ میاں بشیر احمد کون تھے؟ اور اس مکتوب میں ان کی یاد کا سبب کیا ہے؟ اور ان کا خواجہ منظور حسین سے کیا رشتہ ہے؟ اس پر ایک مختصر نوٹ ضروری تھا۔

3۔ میاں محمد شریف مرحوم کے تعلیمی، علمی اور تحقیقی مرتبہ کے علاوہ یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ خواجہ صاحب کے نام مکتوب میں میاں صاحب مرحوم کو مہربان کہنے کی علت کیا ہے؟

4۔ خواجہ شاہد حسین کی والدہ ماجدہ کی رحلت کے اشارے سے شاید کچھ قارئین اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں کہ وہ خواجہ منظور حسین کے صاحبزادے ہیں مگر ان کی اپنی شخصیت اور اہمیت کے حوالے سے بھی کچھ بتانا ضروری تھا۔

5۔ انہی مکتوبات میں سے مکتوب نمبر 1 میں ''دیوانِ غالب'' کی اشاعت کا کیا معاملہ تھا۔ اس کی وضاحت بھی ضروری تھی مگر معین الرحمٰن صاحب اس وضاحت کے لیے کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔

(وضاحت: راقم کے قیاس کے مطابق ''دیوانِ غالب'' کی اشاعت اور اس میں مولانا حامد علی خاں کی مشاورت کا قصہ یہ ہے کہ معین الرحمٰن صاحب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مسروقہ دیوانِ غالب (مخطوطہ) کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھے لہٰذا انہوں نے اپنے خیال میں مضبوط ترین پناہ گاہ خواجہ منظور حسین کو سمجھا۔ ان کے حضور لے جا کر کہا ہوگا آپ کے ذوقِ علم و تحقیق کی تسکین کے لیے یہ مخطوطہ دکھانے کو حاضر ہوا ہوں۔ خواجہ شاہد حسین کا لندن میں ''آثارِ عتیق'' Antiques اور کتابوں کا وسیع کاروبار ان کے علم میں ہوگا۔ کیا عجب خود ہی تجویز کر دیا ہو کہ خواجہ شاہد حسین کے زیرِ اہتمام لندن سے شائع ہو جائے یا خواجہ منظور حسین ہی کی واقعتاً دلی تمنا ہو کہ ''دیوانِ غالب'' کے اس مخطوطہ کی اشاعت ان کے صاحبزادے کے ہاتھوں ہو۔ خواجہ صاحب کو اس پر ایک بڑی Investment کا بھی اندازہ ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے ضروری سمجھا ہوگا کہ وہ اپنے دوست مشہور ادیب و شاعر، مرتب دیوانِ غالب اور تجربہ کار طابع و ناشر (وہ امریکن ادارہ مکتبہ فرینکلن کے پاکستان میں مہتمم رہے تھے) سے ماہرانہ مشورے کے لیے مولانا حامد علی خاں مرحوم کے ساتھ اپنے بیٹے کی ملاقات کرائیں بقول مولانا ''پھر شاید کسی وجہ سے وہ بات رہ گئی'' پھر قیاس یہ کہتا ہے وجہ یہ ہوگی کہ معین الرحمٰن صاحب نے بیل منڈھے نہ چڑھنے دی ہوگی۔ ''دیوانِ غالب'' کے اس مخطوطہ کی اشاعت سے خواجہ شاہد حسین کو لاکھوں روپے کی یافت کا تصور کرتے ہوئے (اقبال کے واعظ سے بھی زیادہ معین الرحمٰن کی چالیں باریک ہیں) اب انہوں نے اس مخطوطہ کی ایسی اشاعت کی کوششیں شروع کیں کہ اشاعت کے بعد مخطوطہ اور اس کی عکسی اشاعت ان کی گرفت میں رہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مسکین پبلشر کو جو پہلے ہی ان کے پراجیکٹس کو عملی جامہ پہنا رہا تھا اس عکسی اشاعت کے لیے آمادہ کیا۔ اس غریب نے لاہور کے ایک ماہر طباعت سے رابطہ کیا۔ آرٹ پیپر پر اشاعت کے لیے پلیٹ سازی وغیرہ کا جائزہ لیا گیا اور تخمینہ لگایا گیا۔ وہ پبلشر مالی طور

پر زیادہ مضبوط نہ تھا۔ اس کے کاروباری مسائل اور اس کی اپنی غلط روش زندگی نے اس کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اُس کے اخراجات زیادہ تھے اور آمدن کم تھی۔ اس کے ادارہ کی لوٹ کھسوٹ بھی جاری تھی۔ وہ پہلے سے مقروض تھا آرٹ پیپر پر مخطوطہ چھاپنے کے لیے لاکھوں کا قرض کہاں سے لیتا۔ وہ بامروت آدمی انکار کی واضح پوزیشن میں نہ تھا۔ اس سارے دباؤ میں اس کے اعصاب ساتھ چھوڑ گئے۔ ایک رات ایک ہارٹ اٹیک کی تاب نہ لا سکا اُس کا بیٹا اور بیٹی چھوٹے تھے۔ اس کا ادارہ منتشر ہو گیا۔

اس پبلشر کی رحلت کے بعد فطری طور پر معین الرحمن اس مخطوطے کی اشاعت کے لیے کسی نئے پبلشر کی تلاش میں نکلے۔ اُن دنوں ان کے گھر کے قرب و جوار میں ایک نوجوان پبلشر کے نئے اشاعتی ادارہ کا بہت چرچا ہوا۔ اس ادارہ نے ادبی ناشرین کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ اُس ادارے نے حیرت انگیز طور پر مصنفین کو غیر متناسب شرح پر رائلٹی میں بڑی رقوم دیں۔ کتابوں کے نکاس اور اخراج کے لیے معلوم نہیں کیا کیا ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے ہوں گے۔ راقم 'محمد اکرام چغتائی صاحب (مشہور محقق و مرتب) کے ساتھ ایک ہی بار اس ادارے پر گیا ہے۔ مجھے شوروم میں بٹھا کر چغتائی صاحب ہٹ کر منیجر سے گفتگو کرنے لگے۔ ادارے کے مالک اس وقت موجود نہ تھے۔ بہر حال میں ان کے ساتھ پہلے سے اپنے ایک عزیز کے توسط سے متعارف تھا۔ میں نے ایک شیلف پر معین الرحمن کے نام سے دوسرے اداروں (غالباً "الوقار") کی کتابیں دیکھ کر کوئی کمنٹ کیا۔ منیجر نے جواباً بتایا:

"ہم ان کا رنگین "دیوانِ غالب" چھاپ رہے ہیں۔ تقریباً ساری پلیٹیں تیار ہو چکی ہیں۔ ہمارے صرف پلیٹ سازی پر 70 ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں۔"

پھر بہت جلد یہ سنا کہ وہ ادارہ دیوالیہ ہو گیا ہے۔ مالک / ڈائریکٹر ادارہ نے "غیر حقیقی" شرح منافع پر لوگوں سے کروڑوں روپیہ جمع کیا تھا۔ وہ ملک چھوڑ کر وسط ایشیا کی کسی ریاست میں ریسٹورنٹ کھول کر بیٹھ گئے۔ ادھر جس قرض خواہ / شیئر ہولڈر کے ہاتھ جو آیا وہ لے گیا۔

جب 1998ء میں معین الرحمن صاحب نے ایک مخطوطہ کو "دیوانِ غالب" "نسخہ خواجہ" کے نام سے شائع کیا اور 2000ء میں اس کا ڈی لکس ایڈیشن چھپا تو بعض باخبر مبصروں نے اس مخطوطہ کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ قرار دیا۔ اخبارات و رسائل میں بحث و تکرار اور تنقید و تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعد ازاں اس مواد سے کئی کتابیں مرتب ہوگئیں۔ اس سرقہ کا اخبارات و رسائل میں اتنی بلند آہنگی سے چرچا ہوا کہ اس کی گونج اب تک سنائی دے رہی ہے۔ معین الرحمن صاحب نے اپنی چند در چند مدافعانہ اور مزاحمانہ کوششوں سے اس شور و غوغا کو خاموش کرنا چاہا مگر وہ ناکام رہے۔ اس بحث و تکرار میں بار بار ڈاکٹر سید عبداللہ' قاضی عبدالودود' مولانا امتیاز علی عرشی' شیخ محمد اکرام اور پروفیسر حمید احمد خاں کے مقالات کے حوالے سے اس نادر مخطوطہ کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ کئی برس قبل یہ مخطوطہ پراسرار طور پر پنجاب

یونیورسٹی لائبریری سے غائب ہو گیا تھا۔ اب ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ہاں سے عکسی صورت میں برآمد ہوا تو اصل مخطوطہ کو مسروقہ نسخہ قرار دیا گیا۔ اس الزام پر پنجاب یونیورسٹی میں تحقیقات شروع ہوئیں۔ آخر معین الرحمٰن صاحب نے وہ مخطوطہ وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کو پیش کر دیا۔

1998ء اور خصوصاً 2000ء کے (''دیوانِ غالب'' نسخہ خواجہ) ڈی لکس ایڈیشن سے راقم کا تلازمہ خیال اسے اس دیوالیہ ناشر کے دفتر میں اس کے منیجر کی اس اطلاع پر لے گیا کہ ہمارے ہاں 70 ہزار روپے کی لاگت سے ''دیوانِ غالب'' کی پلیٹ سازی ہوئی ہے۔ اس دن سے میرے تصور میں نہیں آرہا تھا کہ معین الرحمٰن نے ''دیوانِ غالب'' کو کیا بنایا ہوگا جس کی صرف پلیٹیں 70 ہزار میں بن پائی ہیں۔ ''دیوانِ غالب'' نسخہ خواجہ کے متذکرہ دونوں ایڈیشن دیکھ کر 70 ہزار کا پلیٹوں پر خرچ فہم میں آیا پھر اس ''مسروقہ مخطوطہ'' کے سلسلے میں بہت سی بحثوں کا مطالعہ اور اس حوالے سے بہت سی شنید سے شعوری اور غیر شعوری طور پر ذہن میں ''دیوانِ غالب'' نسخہ خواجہ کی اشاعت کا مرتب ہوتا ہوا خاکہ مختلف مراحل سے گزر کر تشکیل پا گیا اور مولانا حامد علی خاں کے مکتوب نمبر 1 کے آخری پیرا کی پہلی دو سطور (اسی سال (1984ء) شاید جنوری میں ''دیوانِ غالب'' کی اشاعت کے سلسلے میں ان سے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ پھر شاید کسی وجہ سے وہ بات رہ گئی) سے مربوط ہو گیا۔ اس رابطہ کا سبب معین الرحمٰن صاحب کا وہ بیان ہے جو انہوں نے اپنے ایک فٹ نوٹ میں تحریر کیا ہے۔ علی گڑھ کے مشہور و معروف غالب شناس پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد نے 14 دسمبر 1998ء کو مبینہ طور پر ایک مراسلہ بسلسلہ نسخہ خواجہ معین الرحمٰن کو لکھا۔ جس میں ڈاکٹر نذیر احمد (مدیر ''غالب نامہ'' دلی) کے پاس ''دیوانِ غالب'' نسخہ خواجہ پہنچنے کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے غالباً آل احمد سرور کے پاس بھی نسخہ خواجہ کا پہنچنا لکھا ہوگا جسے معین الرحمٰن نے نقل نہیں کیا یا کمپوزنگ میں چھوٹ گیا۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے بیان میں آل احمد سرور اور ان کی بیگم صاحبہ کی علالت اور صحت کی خبر سے متصل یہ فقرہ ملتا ہے:

''یہ ''نسخہ خواجہ'' غالباً وہی ہے جو خواجہ منظور حسین مرحوم کے پاس تھا؟''

معین الرحمٰن ''تھا'' پر فٹ نوٹ کے لیے [1] کا نشان لگا کر درج ذیل الفاظ میں اپنا فٹ نوٹ تحریر کرتے ہیں:

[1] ''نسخہ خواجہ'' خواجہ منظور حسین کے پاس کبھی نہیں رہا۔ اُن کی خواہش ضرور یہ رہی کہ یہ اہتمام سے چھپ جائے۔ وہ اس کے لیے بھی کوشاں رہے کہ ''دیوانِ غالب'' کا یہ نسخہ مجھ سے لے کر ان کے بیٹے خواجہ شاہد حسین آب و تاب سے چھاپ دیں۔''

[دیوانِ غالب نسخہ خواجہ (تجزیہ و تحسین) مرتبین: ڈاکٹر سید معراج نیر، اصغر ندیم سید، الوقار پبلی کیشنز، لاہور 2000ء، ص 31]

نوٹ: اس فٹ نوٹ سے یہ واضح ہے کہ زیرِ نظر کتاب خود ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مرتب کردہ

ہے۔ معراج نیرّ اور اصغر ندیم سید کے اسماء برائے بیت ہیں۔ اوپر منقول فقرے "یہ نسخہ خواجہ غالباً۔۔۔ پاس تھا" میں "تھا" کے بعد سوالیہ نشان معین الرحمٰن کا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔

یاد رہے ڈاکٹر مختار الدین احمد کا علی گڑھ سے براہ راست یا مصر و عراق سے واپسی پر لاہور اکثر آنا جانا لگا رہا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ لاہور آئیں اور خواجہ منظور حسین کے ہاں تشریف نہ لے جائیں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کو عمر بھر نادر و نایاب کتب اور مخطوطات سے جیسی گہری اور قریبی دلچسپی رہی ہے اُس کی روشنی میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انہوں نے خواجہ منظور حسین کے پاس کوئی نادر و نایاب دیوان غالب کا مخطوطہ دیکھا ہو اور انہیں یاد نہ رہا ہو اور کسی دوسرے موقع پر انہیں اس کا مماثل اور مشابہ نسخہ یا اس کا عکس دیکھنے کو ملا ہو تو وہ اسے پہچان نہ سکیں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کی تحقیقی وجاہت اور علمی دیانت سے واقفیت رکھنے والے ڈاکٹر مختار الدین احمد کی یادداشت پر ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تردید کو ترجیح نہیں دے سکتے۔

راقم اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہے کہ اس نے میرے لیے ایک بار پھر اپنے وجدان اور بصیرت کی حفاظت پر اعتماد کا موقع پیدا کیا۔ میں نے تقریباً دو ماہ قبل زیر نظر حوالہ سے متعلق مندرجہ بالا سطور قلم بند کی تھیں۔ مجھے اپنی یہ "وجدانی تردید" تحقیقی اصول شہادت سے ہم آہنگ نظر نہ آتی تھی۔ اس پر مجھے کسی قدر بے اطمینانی کا احساس تھا مگر نامعلوم طور پر ڈاکٹر مختار الدین احمد کی یادداشت بسلسلہ مخطوطات' پر بہ حد ایمان' یقین بھی تھا۔

میں آج زیر نظر کتاب کے آخری صفحات میں "تحقیق نامہ" مجلہ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور پر ایک نوٹ تحریر کرنے کے لیے "تحقیق نامہ" کے شمارے دیکھ رہا تھا۔ ان میں پہلا شمارہ موجود نہیں۔ دوسرے شمارہ میں ایر کموڈور ریٹائرڈ انعام الحق کے مضمون" کچھ خواجہ منظور حسین کی یاد میں" سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے "فنون" لاہور کے شمارہ جون جولائی 1989ء میں پروفیسر خواجہ منظور حسین کے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ (صفحہ 41)

اسی شمارہ نمبر دو میں مدیر کے نام مختلف رسیدی خطوط بابت شمارہ اول سے معلوم ہوا کہ اس میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا مضمون "خواجہ منظور حسین۔ کچھ یادیں اور یادگاریں" شائع ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے حسب معمول "فنون" میں شائع ہونے والا مضمون ہی مکرر شائع کیا ہوگا۔ بہت دیر اس تقابلی مطالعے کے لیے بے چین رہا۔ اچانک یاد آیا میں نے "شخصی خاکوں اور یادوں" پر ڈاکٹر معین الرحمٰن کی کتاب موسوم بہ "محبتیں ہی محبتیں" خرید رکھی ہے۔ یہ کتاب نکال کر فہرست میں شمار گیارہ پر خواجہ منظور حسین کا نام دیکھا۔ اُس کے مطابق صفحہ 135 پر کتاب کھولی تو وہاں "صلے اور ستائش سے بے نیاز۔ خواجہ منظور حسین" کے عنوان سے موجود مضمون پڑھنا شروع کیا۔ صفحہ 137 کا آخری پیرا یوں شروع ہوتا ہے:

"خواجہ منظور حسین غالب کے بڑے مداح اور رمز شناس تھے اور غالبیات سے انہیں بطور خاص بڑا لگاؤ تھا۔ وہ "دیوانِ غالب" کے میرے ذخیرۂ غالبیات کے ایک نادر نسخے کی اشاعت کے دل سے

خواہاں تھے۔ اُن کا برابر یہ ارشاد اور اصرار رہا کہ اس کام کو میں اپنی پہلی ترجیح میں رکھوں۔ افسوس کہ ''دیوانِ غالب'' کی متنی ترتیب وتحقیق کا یہ مشکل کام میں ان کی زندگی میں نہ سمیٹ سکا لیکن میرے لیے اطمینان کا حوالہ یہ (صفحہ 138 شروع ہوتا ہے) ہے کہ ''دیوان غالب'' کا اصل خطی نسخہ اور اس کے تعارف پرمبنی میرے مقدمے کا ابتدائی مسودہ کچھ عرصہ ان کی تحویل میں رہا اور انہوں نے اسے دیکھنے کے لیے وقت نکالا۔ اس نسخے کی متوقع کتابی اشاعت کو ان کے نام سے موسوم کرنے کی میری محبت آمیز پیش قدمی اُن کے چہرے پر سرخی' لبوں پر سکوت اور آنکھوں میں کسی قدر نمی کا باعث ہوئی۔''

یہی مضمون ایک دوسرے عنوان ''پطرس بخاری اور خواجہ منظور حسین۔ چند یادیں' چند تبرکات'' سے ان کی کتاب ''شخصیات اور ادبیات'' شائع کردہ مکتبہ عالیہ لاہور' اشاعت اول 1995ء کے صفحہ 146-149 پر بھی ملتا ہے۔ اس مضمون میں نظیر صدیقی کا ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد مندرجہ بالا پیرا (جس میں ان کا اعتراف ہے کہ ''دیوانِ غالب کا اصل خطی نسخہ [یعنی نسخہ خواجہ] اور اس کے تعارف پر مبنی میرے مقدمے کا ابتدائی مسودہ کچھ عرصہ ان (خواجہ منظور حسین) کی تحویل میں رہا) کا اضافہ کرکے ''صلے اور ستائش سے بے نیاز۔ خواجہ منظور حسین'' کے عنوان سے کتاب موسوم بہ ''محبتیں ہی محبتیں۔ شخصی خاکے اور یادیں۔''میں شامل کیا گیا ہے۔

قدرت کا اپنا ایک نظام ہے دیکھیے اس نے ڈاکٹر مختار الدین احمد کے ایک بیان کی ڈاکٹر معین الرحمٰن کے قلم سے تردید کی۔ پھر ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اپنے قلم سے تکذیب کی کیسی صورت پیدا کی۔ شاید کوئی آدمی کسی گہری سازش کے تحت ایسی صورتحال پیدا کرنا چاہتا تو اسے ہرگز یہ کامیابی نصیب نہ ہوتی: بہرحال اس وقت تک کی معلومات کے مطابق ڈاکٹر معین الرحمٰن متذکرہ بالا ایک مضمون چار بار مختلف عنوانات کے تحت چھپوا چکے ہیں۔ [مرقومہ: 14 اگست 2004ء]

راقم ڈاکٹر معین الرحمٰن کی فطرت اور کیریکٹر سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔ ان میں اوچھاپن' شوبازی' احسان فراموشی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اگر ان سے کوئی احسان سرزد ہو ہی جائے تو وہ اسے بلند بانگ طور پر جتانے کی خوبی بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً معین الرحمٰن صاحب نے بہت اونچے سروں میں یہ کہا اور کہلوایا ہے کہ ''دیوانِ غالب'' کو نسخہ خواجہ (مراد منظور حسین) قرار دے کر انہوں نے بہت بڑے علمی ایثار اور علم دوستی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کے معاصر ناشرین اور کتب فروشوں کے تخمینہ کے مطابق ڈاکٹر معین الرحمٰن کو اس ''نسخہ خواجہ'' کی اشاعت کے لیے موصول ہونے والے عطیات اور اس نسخہ کی فروخت سے تقریباً ایک ملین روپے کی یافت ہوئی ہے۔ ''دیوانِ غالب'' نسخہ خواجہ کو مکتبہ' اعجاز' سمن آباد لاہور کے نام پر شائع کرنے میں جو بھی کاروباری مصلحتیں ہوں مگر پبلشر لوگ جانتے ہیں کہ اعجاز مرحوم ڈاکٹر معین الرحمٰن کے سمدھی تھے۔ اسی طرح وہ اپنے سب سے بڑے کرم فرما پر احسان جتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے جی۔ سی یونیورسٹی لاہور کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد فراہم کر کے ''سید وقار عظیم گولڈ میڈل'' کے اجرا کا بھی اہتمام کیا ہے جو۔۔۔'' (الحمرا، فروری 2004ء)

پہلے تو مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' کو نسخۂ خواجہ سے موسوم کرنے کی حقیقت اور علت سن لیجیے جو میں ان کی فطرت سے گہری واقفیت کی بنا پر بیان کر رہا ہوں۔ آپ اوپر ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ معین الرحمٰن صاحب نے جناب خواجہ منظور حسین کو (مسروقہ) مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' کی جھلک دکھائی پھر اس کو خواجہ شاہد حسین کے ہاتھوں اشاعت تک لائے اس کے بعد ان کے ہاتھ سے جھپٹ کر واپس لے گئے۔ لہٰذا انہیں خوب معلوم ہے کہ انہوں نے خواجۂ بزرگ اور خواجہ خورد کے ساتھ کیسی بے مروتی کا سلوک کیا ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم ایک وضع دار اور روایت پسند انسان تھے۔ ان کے شاگرد پروفیسر اسلوب احمد انصاری علی گڑھ سے اپنے رسالہ ''فکر و نظر'' کے پرچے وغیرہ معین الرحمٰن کے توسط سے بھجواتے تھے تو وہ انہیں پہنچانے کے بہانے خواجہ صاحب کے گھر جاتے رہے۔ خواجہ صاحب مرحوم وضع کے پابند بزرگ تھے۔ وہ موصوف کو خندہ پیشانی سے ملتے۔ موصوف کی نظر خواجہ صاحب کے پاس آئے ہوئے خطوط اور کتب و رسائل پر تھی اور وہ خواجہ صاحب کے لواحقین پر اپنی عقیدت مندی ظاہر کرتے رہتے۔ ''دیوانِ غالب'' مخطوطہ کی اشاعت اور اسے نسخۂ خواجہ سے موسوم کرنا ایک طرح سے حفظ ماتقدم کی کوشش ہے۔ یا یوں کہیے کہ خواجہ صاحب کے نام انتساب ایک طرح سے بنکر کی تعمیر ہے۔ کیونکہ خواجہ صاحب کی شخصی وجاہت' ذاتی حیثیت اور منصبی مرتبہ ایک بڑی طاقت کا سرچشمہ تھا۔ علاوہ ازیں خواجہ صاحب کی آبائی نسبت سے اور سسرالی رشتہ داروں (باغبانپورہ کی میاں فیملی' خواجہ صاحب علی گڑھ میں فلسفہ کے مشہور پروفیسر میاں محمد شریف کے داماد اور پنجاب کے مشہور ترقی پسند سیاستدان اور پروگریسو پیپرز لمیٹڈ لاہور کے مالک میاں افتخار الدین کے ہم زلف تھے) کے اثر و رسوخ' ان کے علی گڑھ اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شاگردوں کا وسیع حلقہ جن کی ایک بڑی تعداد دنیا کے ہر ملک میں موجود رہی ہے نیز اس تعداد کا ایک بڑا حصہ پاکستان بیوروکریسی میں کلیدی مناصب پر متمکن ہوا کرتا تھا۔ ان سب سے مربوط ہونے کے لیے معین الرحمٰن صاحب نے نسخۂ خواجہ کو خواجہ صاحب کے وزٹنگ کارڈ اور تعارفی خط کے طور پر محفوظ کر لیا۔

خواجہ صاحب کی بیٹی جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن کی بہو ہیں۔ ان کے ساتھ خواجہ صاحب کی وفات پر غم گساری اور خواجہ صاحب کے بعد نیاز مندانہ یادآوری کے اظہار کے بہانے وہ بیگم صاحبہ سے اپنے تعارف کو مدہم نہیں پڑنے دیتے۔ غرض خواجہ صاحب کے رشتوں اور ان کے وسیع تعلقات سے حسبِ ضرورت فائدہ اٹھانا خواجہ صاحب مرحوم کے پسماندگان سے ہر دم رابطہ تازہ رکھنے کا محرک ہے۔ دراصل ڈاکٹر معین الرحمٰن کو ایسے ہی بااثر مراتب رکھنے والے لوگوں کی پشت پناہی سے یہ ترقی اور عروج ملا ہے۔ وہ ایسے خفیف رابطوں اور کمزور Links کو ضروری موقعوں پر استعمال کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں مگر موصوف ایک بے حد

ٹیڑھے آدمی ہیں یا یوں کہیے کہ ان کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ ان کی کارروائی کا اُس وقت پتہ چلتا ہے جب ان سے ہاتھ ملانے والا آدمی اپنی انگلیاں گنتا رہ جاتا ہے۔

اپنی زندگی کے مختلف برسوں میں انسان کیا ہر ذی روح بدلتا یا بدلتی رہتی ہے' شجر تو شجر ہوئے حجر بھی بدلتے رہتے ہیں مگر انسانی معاشروں میں بعض معاشرتی اور اخلاقی روایات ایسی بھی ہیں جن کا قرار و دوام ہی مستحسن ٹھہرتا ہے۔ مثلاً خلوص و ایثار' وفا اور سچ' انصاف اور عدل و احسان وغیرہ۔ اسی طرح تصنیف یا تالیف کی دنیا میں اپنی شاعری' تخلیق و تحقیق اور تنقید وغیرہ کی بصورت کتاب اشاعت کا انتساب ایک پاکیزہ روایت ہے اور اس کا استقلال اسی روایت کا حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کتاب یا کوئی نظم و نثر پارہ اگر نئے ایڈیشنوں سے آشنا ہو جائے تو ہر ایڈیشن پر انتساب نہیں بدلتا۔ لیکن معین الرحمٰن صاحب اپنی کتاب (یہ الگ بحث ہے کہ ان کی اپنی تصنیف کون کون سی ہے؟) کے ہر ایڈیشن پر انتساب بدل دینے کے عادی ہیں کیوں کہ بدلا ہوا انتساب ان کی کسی وقتی ضرورت یا مصلحت کا نتیجہ ہوتا ہے اور کانٹے کی طرح دلِ یزداں میں کھٹکتا ہے یا نہیں مگر ایک باریک بین قاری یا وہ شخص جس کے نام سے انتساب ہٹا دیا گیا ہے اُس کے دل میں ضرور کھٹکتا ہے۔ انتساب معطل یا منسوخ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی سے اس کا عطا کیا ہوا اعزاز یا تمغہ واپس لے لیا جائے یا کسی کو حسنِ کارکردگی کی بنا پر ترقی دی جائے اور کسی ناشدنی ناپسندیدہ حرکت پر اسے معزول کر دیا جائے مگر معین الرحمٰن صاحب کے انتساب بدلنے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انتساب الیہ کی پوزیشن بدل گئی ہوتی ہے۔ معین الرحمٰن صاحب کے ہاں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ راقم ان میں سے اکثر مثالوں کے اہم محرکات بیان کر سکتا ہے کیوں کہ اسے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے رویوں' سوچ کے انداز اور واقعاتی مواقع سے خاصی واقفیت ہے۔ ممکن ہے ان کا ایک آدھ ایسا انتساب بھی برآمد ہو جائے جو بے لوث محبت یا خالص عقیدت کے اظہار کا ہی مظہر ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا ایک ایک انتساب Calculated ہے۔

اب یہاں معین الرحمٰن صاحب کے ایک انتساب کا بطور مثال جائزہ لیا جاتا ہے جو شاید قاری یا خود راقم کی اس الجھن کو دور کر دے کہ مسروقہ مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' کو نسخۂ خواجہ سے موسوم کرنے کا جو محرک اوپر بیان کیا گیا ہے وہ کس حد تک راقم کا قیاس یا کھینچ تان ہے اور کس حد تک امر واقع کے قریب ہے۔

خواجہ منظور حسین مرحوم اور معین الرحمٰن کے باہمی تعلقات کے پس منظر کی زیادہ معلومات راقم کے سامنے نہیں مگر وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ خواجہ صاحب اور معین الرحمٰن صاحب کے درمیان عمر' علم' منصب اور معاشرتی مرتبہ کا تفاوت ہے۔ اندازہ ہے کہ وہ 1965ء کے بعد کہیں سید وقار عظیم کے ہمراہ خواجہ صاحب کے ہاں گئے ہوں' یا وقار عظیم مرحوم نے انہیں کوئی کتاب' رسالہ یا مسودہ پہنچانے کے لیے بھیجا ہو یا وہ رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی انہیں (جسے مرتب نے علیگیرینز تک رسائی اور معرفت کا ذریعہ بنایا) پیش کرنے گئے ہوں۔ بہر حال خواجہ صاحب سے ان کی معرفت کا ایسا ہی کوئی سبب رہا ہوگا۔

سید وقار عظیم کا 17 نومبر 1976ء کو انتقال ہوا۔ 1977ء میں اقبال صدی کی تقریبات منعقد ہو رہی تھیں۔ اس موقع پر اقبال اکیڈمی پاکستان نے فیڈرل گورنمنٹ کی خصوصی گرانٹ سے متعدد کتابیں Commission کر کے لکھوائیں۔ یا مرتب کروا کر شائع کیں۔ انہی کتب میں سید وقار عظیم کے اقبال کے حوالے سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین پر مشتمل مجموعہ ''اقبالیات کا مطالعہ'' مرتبہ معین الرحمن (مرتب نے ٹائٹل کا موزوں اور مناسب عنوان قائم نہیں کیا کیوں کہ اقبالیات Iqbal Studies کے معنوں میں مروج ہے) شامل تھی جسے 1977ء میں اقبال اکادمی نے شائع کیا۔ 1976ء میں وفات سے قبل اس کتاب کے بعض شمولات میں اضافہ کرتے ہوئے اقبال پر ایک اور مجموعے کی اشاعت خود وقار عظیم صاحب کے پیش نظر تھی۔ (اقبالیات کا مطالعہ' اقبال اکادمی لاہور' 1977ء ص 31' بار دوم 1995ء ص 31)

بہر حال مرتب ''اقبالیات کا مطالعہ'' نے پیش کش کے عنوان سے مندرجہ ذیل الفاظ میں خواجہ منظور حسین کے نام انتساب کیا ہے:

''اقبال پر اپنے پہلے مجموعہ مضامین ''اقبال۔ شاعر اور فلسفی'' کا انتساب وقار عظیم صاحب نے پروفیسر حمید احمد خاں کے نام کیا تھا۔ اُن کے مرتبہ مجموعہ مضامین ''اقبال۔ معاصرین کی نظر میں'' کا انتساب ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام کے نام ہے۔

''میں چشم تصور سے دیکھتا ہوں کہ اگر مرحوم زندہ ہوتے اور ''اقبالیات کا مطالعہ'' کو خود ترتیب دیتے تو اسے خواجہ منظور حسین (علیگ) کے نام نامی سے منسوب فرماتے جن کی صحبت اور رفاقت افسانوی ادب اور اقبالیات سے وقار عظیم صاحب کے اولین تعارف اور تعلق کا ایک باعث ہوئی۔ خدا انہیں سلامت با کرامت رکھے۔'' ص 5

یاد رہے اس ایڈیشن کے ناشر ڈاکٹر محمد معز الدین ڈائریکٹر' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور تھے۔ جب زیر نظر کتاب کا 1995ء میں دوسرا ایڈیشن چھپنے کی نوبت آئی تو اس کے ناشر ڈاکٹر وحید قریشی ناظم (ڈائریکٹر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے) اقبال اکادمی لاہور پاکستان تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ''حرفے چند'' کے عنوان سے اس کتاب کا مختصر سا پیش لفظ لکھا۔ اس کی آخری تین سطور دیکھیے:

''۔۔۔ کتاب مدت سے ختم تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ اب ترتیب و تبویب کی جزوی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ ڈاکٹر سید معین الرحمان نے اقبال اکادمی کے لیے اس کا نیا ایڈیشن تیار کیا ہے جسے وقار عظیم مرحوم کی انیسویں برسی کے موقع پر شائع کیا جا رہا ہے۔''

ڈاکٹر معین الرحمن اور ڈاکٹر وحید قریشی کے آپس میں تعلقات کا پھیلا ہوا پس منظر ہے۔ راقم کے سامنے ان دونوں کے درمیان دوری کی وسیع و عریض خلیج کا منظر نامہ بہت واضح ہے۔ یہ دوری پاٹنے

میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی جان ہلکان کر دی۔ خوشامد کی ایسی آگ روشن کی جس کی تپش سے ایک ڈاکٹر وحید قریشی کیا' درجنوں بھی ہوتے تو پگھل کر بہہ نکلتے۔ بہر حال ان میں فاصلہ دور ہو گیا اور قربت کی منزل آ گئی' جس کا ثبوت متذکرہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی نے دوسرے کام التوا میں ڈال کر شائع کیا اور معین الرحمٰن کی مطلوبہ تاریخ کو' گیلی جلد ہی میں' ان کے سپرد کیا۔ نومبر 1995ء میں ڈاکٹر معین الرحمٰن صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور نے سید وقار عظیم کی انیسویں برسی اور ان کی کتاب ''اقبالیات کا مطالعہ'' (دوسرا ایڈیشن 1995ء) کی لانچنگ کے لیے اولڈ ہال گورنمنٹ کالج میں ایک جلسہ (غالباً مجلس اقبال گورنمنٹ کالج لاہور کے ذریعہ) کا اہتمام کیا۔ اس میں ڈاکٹر وحید قریشی بطور مہمانِ خصوصی تشریف لائے۔ اس تہری تقریب میں سید وقار عظیم مرحوم کے خاندان کے افراد نے بھی شرکت کی۔ ان افراد میں بڑے بیٹے سید انور عظیم' سید انور کی بیگم صاحبہ' غالباً دو دوسرے بیٹوں اور دو بیٹیوں نے بھی اس تقریب میں حصہ لیا۔ اس لیے بھی کہ اس جلسہ میں چند ماہ قبل رحلت فرمانے والی بیگم وقار عظیم کے لیے دعائے مغفرت ہو رہی تھی۔ ''اقبالیات کا مطالعہ'' کے پہلے ایڈیشن میں خواجہ منظور حسین کا نام خارج کر کے دوسرے ایڈیشن کا دوسرا انتساب مرحومہ بیگم عابدہ وقار عظیم کے نام بہ الفاظ زیریں کیا گیا ہے:

پیشکش:

''وقار عظیم صاحب کی شادی دسمبر 1938ء میں ہوئی۔۔۔ اس سال (جولائی 1995ء) میں ان کی اہلیہ عابدہ وقار عظیم اللہ کو عزیز ہوئیں۔۔۔ میں چشم تصور سے دیکھتا ہوں کہ اگر سید وقار عظیم ''اقبالیات کا مطالعہ'' کو خود ترتیب دیتے تو اس کے زیر نظر ایڈیشن کو وہ بیگم عابدہ وقار عظیم کے نام منسوب کرتے۔۔۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ انہیں آسودہ خاک رکھے اور ان کی یاد کو سارے پسماندگان کے لیے آسان بنائے۔۔۔ آمین''

(نومبر 1995ء ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' ص 5)

معین الرحمٰن صاحب نے موقع پرستی' مصلحت کوشی اور احسان جتانے کا یہ ہتھکنڈا بار بار استعمال کیا ہے اور انہیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ جس آدمی کو جگا کر اس کی ٹوپی میں انتساب کا پر لگایا تھا' آپ نے وہ پر اُس کے اونگھتے یا سوتے وقت اُچک لیا ہے۔ کسی شخصیت کے نام کیا ہوا انتساب ہٹانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخصیت اب ویسی قدر و منزلت نہیں رکھتی جیسی وقتِ انتساب تھی۔ اپنے ممدوحین کی تضحیک' تحقیر اور توہین کا یہ عمل انہوں نے بار بار دہرایا ہے۔ یقیناً انہوں نے اپنے اس حربہ سے سید وقار عظیم فیملی کے دل جیت لیے ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' کی اشاعت خواجہ شاہد حسین کے ہاتھوں سے جھپٹ کر معین الرحمٰن صاحب نے جس بے مروتی کا مظاہرہ کیا تھا' اس پر خواجہ فیملی کا ردعمل اور ان کی کڑواہٹ

کے آثار معین الرحمٰن صاحب نے دیکھے ہوں گے اور مسروقہ مخطوط ''دیوان غالب'' کی اشاعت کے نئے انتظام پر متوقع Public Reaction سے محفوظ رہنے اور اس خاندان کے ساتھ اپنی بے مروتی کے ازالہ کے لیے موصوف نے ایک انوکھی ترکیب نکالی۔ یوں بھی وہ ایک تیر سے دو دو نہیں بلکہ کئی کئی شکار کرنے میں مشاق ہیں۔ متذکرہ ترکیب کی ایک مثال دیکھیے:

ایک کتاب ''بازیافت غالب'' (1999ء) پر بطور مصنف اپنا نام لکھتے ہوئے [ان کے حوالے سے چھپنے والی تقریباً سبھی کتابوں پر خود کو مصنف دکھایا گیا ہے مگر حقیقت میں یہ مقام مرتب لکھنے کا رہا ہے۔ ان کے اس طریق کار نے ہمارے ایک بزرگ دوست اور کرم فرما ڈاکٹر فرمان فتح پوری (جو ایک سینئر سکالر، منکسر المزاج اور بے نیاز طبیعت کے مالک انسان ہیں) کو بھی غلط روش پر ڈال دیا۔ انہوں نے اپنی (ہماری دانست میں مرتبہ) کتابوں پر نہ مصنف لکھا ہے اور نہ مرتب۔ اس طرز اندراج سے ایک غیر مصنف کا مصنف خیال کیا جانا ناگزیر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جلد کے اندر موجود مواد / مضامین دوسرے لوگوں کے ہوتے ہیں] ان الفاظ میں اس کتاب کا ڈاکٹر وحید قریشی کے نام انتساب کیا ہے:

ڈاکٹر وحید قریشی کی نذر

1965ء میں ڈاکٹر وحید قریشی اور میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں اردو کے لیکچرار تھے۔
اس پچھلی ایک تہائی صدی میں ان کی ناراضی کے موسم بھی میں نے دیکھے لیکن ان کی رضا مجھے ہمیشہ عزیز رہی۔

یہ ہے مختصر کہانی!
''چیت بیساکھ یادیں بازپھگن
عشاق عشقاں وچ مگن (شہزاد قیصر)''
دستخط معین الرحمٰن

لاہور 18 جون 1998ء

یہ مختصر انتسابی نوٹ بہت توجہ سے پڑھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں ایک تو ڈاکٹر وحید قریشی سے برابری کا داعیہ ہے۔ معین الرحمٰن صاحب، مولوی عبدالحق، سید وقار عظیم، رشید احمد صدیقی اور خواجہ منظور حسین کے حوالے سے اقدار، شائستگی، روایات اور وضعداری کا یوں ذکر اور ان کے فرمودات اور اقوال اپنی تحریروں میں یوں نقل کرتے رہتے ہیں گویا وہ ان زعما کی عملی شرافتوں کے امین اور پاسدار ہیں اور وہ ان بزرگوں کے فراہم کردہ اخلاقی سانچوں میں ڈھل چکے ہیں۔ مگر جب وہ عملی امتحان میں اترتے ہیں تو ان کی فرشتہ سیرتی کا سارا میک اپ دنیاوی ترجیحات اور بے حد معمولی مفادات کی بارش میں اتر جاتا ہے۔ ان کو یاد نہیں رہتا کہ ان کی ماڈل شخصیات کو اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں، ان کی بزرگی اور سینارٹی کا خیال، لحاظ اور احترام تھا۔ معین

الرحمٰن صاحب سنین کی جمع تفریق میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ان کے حافظے سے یہ کیوں اتر گیا کہ 1950ء میں جب معین الرحمٰن کی عمر آٹھ برس کی ہوگی اُس وقت ڈاکٹر وحید قریشی کی ہنگامہ خیز کتاب ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' چھپ چکی تھی۔ جب وہ نو برس کے تھے اس وقت ڈاکٹر وحید قریشی اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں تاریخ کے لیکچرار تھے۔جب معین الرحمٰن اردو کالج کراچی میں بی۔اے کے طالب علم تھے؟ جس وقت وہ کراچی یونیورسٹی کے خارجی امیدوار (شاید مراد پرائیویٹ) کی حیثیت سے ایم۔اے اردو کرنے کی کوشش میں تھے ڈاکٹر وحید قریشی اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں صدر شعبہ فارسی تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اور ینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں 21 دسمبر 1962ء تا 20 دسمبر 1966ء لیکچرار اردو تھے۔وہ ایک درمیانی مدت 2 دسمبر 1963ء تا 2 ستمبر 1964ء سیکرٹری اور ڈائریکٹر (ایسوسی ایٹ پروفیسر/ریڈر کے مساوی عہدہ) ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان' محکمہ اوقاف لاہور رہے۔1965ء میں سید وقار عظیم قائم مقام صدر شعبہ اردو ہوئے تو ان کی عنایات اور سفارشات سے معین الرحمٰن کو حمید احمد خاں نے خصوصی اختیارات کے تحت صرف چھ ماہ کے لیے لیکچرار کی ایک خالص عارضی پوسٹ پر تعینات کیا۔انہوں نے غالباً جون 1965ء تا دسمبر 1965ء اس عارضی آسامی پر چھ ماہ کام کیا۔انہیں مزید توسیع نہ مل سکی کیوں کہ وہ راقم کی طرح ایم۔اے میں سیکنڈ ڈویژن تھے اور یونیورسٹی کیلنڈر کے مطابق لیکچرار کے تقرر کے لیے بنیادی شرط فرسٹ ڈویژن ہے۔موصوف یونیورسٹی میں اس چھ ماہی ملازمت کا اتنی بلند آہنگی اور تکرار سے تذکرہ کرتے ہیں جیسے یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ تھا۔(اس چھ ماہ کے عرصہ کو خود معین الرحمٰن اُن کی ہمشیرہ اور دوسرے مرتبین نے ان کے سوانحی خاکہ میں ایک برس (1965ء۔1966ء) دکھایا ہے جو درست نہیں) اس سوانحی خاکہ میں ایک برس (1966ء۔1967ء) خالی ہے اس کا مطلب ہے انہوں نے تقریباً یہ ایک برس بے روزگار رہ کر گزارا پھر پروفیسر سید وقار عظیم صاحب نے ادھر اقبال احمد خان صدر شعبہ اردو ایف۔سی کالج لاہور سے سفارش کی۔ ادھر پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پرنسپل ایف۔سی۔کالج پروفیسر سنکلیر کو کہلوایا جو حمید احمد خاں صاحب کے پرانے دوست بھی تھے۔ان راستوں اور واسطوں سے معین الرحمٰن صاحب نے تعلیمی سیشن 1967ء سے ایف سی کالج لاہور میں بطور لیکچرار تدریس کا کام شروع کیا۔

یہاں ایک چھوٹی سی Digression ضروری ہے۔یوں تو شاید یہ صورت حال دنیا کے ہر ملک اور ہر معاشرہ میں موجود چلی آ رہی ہو مگر ہمارے ملک اور معاشرہ میں یہ صورت حال مکروہ شکل اختیار کر لیتی ہے۔اشارہ ہے انتظامی اور غیر انتظامی اداروں کے اسٹاف ممبران کے درمیان ترقی یا دوسرے مفادات کے لیے چپقلش اور باہمی عداوت کی طرف' جو دن رات ایک دوسرے کے خلاف ایک جگہ کام کرنے والوں کو چھوٹی بڑی سازشوں میں مصروف رکھتی ہے۔یہ صورتحال پنجاب یونیورسٹی کے ہر شعبہ میں مدتوں سے موجود

چلی آ رہی ہے۔ راقم کو اسے اپنی ننگی حالت میں یونیورسٹی اور ینٹل کالج لاہور میں سرگرم دیکھنے کا موقع ملا۔ غالباً 1963ء میں ریڈر شعبہ اردو کی اسامی کے لیے سید وقار عظیم اور ڈاکٹر وحید قریشی مدمقابل تھے۔ سید وقار عظیم کو وائس چانسلر حمید احمد خاں صاحب کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ کامیاب ٹھہرے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو Compensate کرنے کے لیے انہیں سیکرٹری اور ڈائریکٹر (ایسوسی ایٹ پروفیسر/ریڈر کے مساوی عہدہ) ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان [محکمہ اوقاف لاہور/مجلہ "نوادر" لاہور شمارہ ششم فروری 2003ء تا اپریل 2003ء] بھجوا دیا گیا اور انکی یہ شرط مان لی گئی کہ وہ چند پیریڈ لینے کے لیے اور ینٹل کالج آتے رہیں گے۔ 1964ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے حمید احمد خاں وائس چانسلر سے دوستی کے علی الرغم اختلافات کی بنا پر اور ینٹل کالج کی پرنسپلی، صدر شعبہ اردو۔ عربی سے استعفیٰ پیش کر دیا اور ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کے بعد سینیئر ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے مگر وہ شعبہ الشرقی والافریقی لندن میں اردو تدریس کی ایک اسائنمنٹ پر گئے ہوئے تھے للہذا سید وقار عظیم قائم مقام صدر شعبہ اردو ہو گئے اور ان کا زمانہ صدارت اواخر 1964ء اور اوائل 1966ء پر محیط ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے وقار عظیم صاحب نے معین الرحمن کو ستمبر 1965ء میں چھ ماہ کے لیے عارضی لیکچرار کے طور پر بھرتی کروا لیا جو قبل ازیں گورنمنٹ کالج بہاول نگر میں عارضی پوسٹ پر چھ ماہ کے لیے تعینات ہوئے تھے اور موسم گرما کی چھٹیوں میں فارغ ہو گئے ہوں گے اور اگلے چھ ماہ کے لیے توسیع کے منتظر کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اوائل 1966ء وطن مراجعت کے بعد صدر شعبہ اردو اور ینٹل کالج کا منصب سنبھال لیا۔ انہوں نے معین الرحمن کی ایک بڑے پریشر کے باوجود توسیع ملازمت کے لیے سفارش نہ کی۔ ان کا عذر یہ تھا کہ معین الرحمن کا تقرر ضابطہ (فرسٹ ڈویژن) کے مطابق نہیں ہے۔ اس دوران ڈاکٹر وحید قریشی اور سید وقار عظیم کے تعلقات میں تلخی اور کڑواہٹ میں اضافہ ہوا ہوگا۔ راقم نے اس تلخی اور بدمزگی کا عروج 1969ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ راقم ان دنوں گورنمنٹ کالج لائل پور میں اردو لیکچررکی عارضی اسامی پر اڑھائی تین سال سے کام کر رہا تھا۔ مسعود مفتی ڈپٹی کمشنر لائلپور نے بھی اپنے اس "زیر انتظام" شہر میں غالب صدی (1969ء) کی تقریبات کے انعقاد کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ پروفیسر مختار محمود قریشی مرحوم پرنسپل گورنمنٹ کالج لائل پور کے ساتھ خواجہ کرامت حسین پروفیسر انگریزی اور سید شہزادہ حسن لیکچرار اردو بھی میٹنگوں میں جاتے تھے۔ آخر طے پایا کہ اس موقع پر آل پاکستان مشاعرہ کا اہتمام وانتظام ضلعی انتظامیہ کی ذمہ داری ہوگی اور اس سے پہلے اکیڈمک سیشن/علمی مذاکرہ کا انعقاد ہوگا جس میں ریسرچ اسکالرز اپنے اپنے مقالات پیش کریں گے۔ اکیڈمک کمیٹی کے صدر پرنسپل مختار محمود قریشی اس کے انتظام وانصرام کے لیے سید شہزادہ حسن پر انحصار کر رہے تھے۔ شہزادہ حسن نے بر ملا کہہ دیا کہ اکیڈمک سیشن کے لیے سکالرز کو بلانا میرے بس میں نہیں۔ صدیق جاوید سے کہا جائے اس کے لاہور میں علمی حلقوں سے رابطے ہیں۔ اور ینٹل کالج کے پروفیسر اس کے استاد ہیں اور اس پر بہت شفقت

فرماتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال راقم اور شعبہ اردو کے ایک اور استاد انور محمود خالد اسکالرز کو مدعو کرنے کے لیے لاہور گئے۔ میرے اساتذہ نے بکمال شفقت حامی بھری۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دوسری مصروفیات کا عذر پیش فرمایا۔ تقریب کے مقررہ دن راقم' انور محمود خالد اور عصمت اللہ خان لاہور سے تشریف لانے والے اساتذہ کے استقبال کے لیے اسٹیشن پہنچے۔ مہمان لاہور سے صبح چلنے والی تیز رفتار ریل گاڑی سے تشریف لا رہے تھے۔ جب گاڑی رکی تو اگلے ڈبوں سے ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر ممتاز منگلوری اترے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے راقم سے ملتے ہی پچھلے ڈبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جاؤ اپنے استاد کا استقبال کرو وہ تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ میں ریل کے پچھلے حصہ کی طرف بھاگا۔ سید وقار عظیم' پروفیسر سجاد باقر رضوی اور معین الرحمن صاحب چلے آ رہے تھے۔ استقبالیہ سلام کا جواب دیتے ہوئے وقار عظیم نے ذرا خفگی کے انداز میں کہا' لو بھئی ہم تمہارے بلانے پر آ گئے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا ان لوگوں کا الگ الگ ڈبوں میں سفر محض اتفاق ہے۔ میں ان دونوں گروپوں میں ٹینشن دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ مجھے اس خیال نے بہت پریشان کیا کہ اگر کسی بھی وجہ سے کوئی ناگوار صورتحال پیدا ہوئی تو میں کیا کروں گا۔ دوپہر کو میرے گھر پر لاہور کے مہمانوں' مقامی سینئر اساتذہ' ادیبوں اور ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کے تین چار لوگوں کا کھانا بھی تھا۔ محمد طفیل (مدیر نقوش) براہ راست مسعود مفتی ڈپٹی کمشنر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اکیڈمک سیشن Lunch Break کے لیے بعد از دوپہر تک ملتوی ہوا۔ میرے لیے یہ بہت ہی عزت افزائی کی بات تھی کہ میرے اساتذہ کھانے کے لیے میرے گھر تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ مسعود مفتی صاحب کے ہمراہ ضلعی انتظامیہ کے تین چار لوگ' طفیل صاحب' خلیق قریشی' پرنسپل صاحب' کالج کے سینئر اساتذہ' میرے چند رفقائے کار اور ممتاز اخبار نویسوں نے شرکت کی۔ خدا کا شکر ہے کہ شام تک کوئی ناگوار صورتحال پیدا نہ ہوئی۔ البتہ لاہور کے اساتذہ کے دونوں گروہ سارا دن واپسی تک ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے اور ایک دوسرے سے دور دور رہے اور شام کی ریل گاڑی سے الگ الگ ڈبوں میں لائل پور سے رخصت ہو گئے۔

سید وقار عظیم اورینٹل کالج سے 1970ء میں ریٹائر ہو گئے۔ غالب قیاس ہے کہ وقار عظیم اور ڈاکٹر وحید قریشی کی باہمی چپقلش وقار صاحب کی ریٹائرمنٹ تک تو ضرور ہی باقی ہو گی۔ اگرچہ معین الرحمن ایف۔ سی۔ کالج میں لیکچرار تھے۔ بیرونِ اورینٹل کالج کے اردو لیکچرار وغیرہ اپنے اپنے تعلقات اور مفادات کے حوالے سے کسی ایک گروپ سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ سید وقار عظیم' معین الرحمن کی بھرپور سرپرستی اور مدد کر رہے تھے۔ لامحالہ معین الرحمن' سید وقار عظیم مرحوم کے وفاداروں اور طرفداروں میں سرگرم فرد ہوں گے اور ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف اپنی سطح اور حیثیت کے مطابق کچھ کہتے سنتے ہوں گے۔ چونکہ آغاز 1974ء تک ڈاکٹر وحید قریشی کا ان کے کسی کام سے تعلق نہ تھا۔ اس لیے معین الرحمن کی ان کے بارے میں جمع

کی ہوئی آراء انتسابات اور تحریروں میں وحید قریشی صاحب کے نام کا گزر نہیں۔ یہ دیکھنے کی چیز ہے کہ ان کا ذکر اور ان کے نام انتساب وغیرہ کس زمانے سے شروع ہوا اور کیوں ہوا۔ مگر اس سے پہلے ایک جملہ معترضہ Disgression ضروری ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن موقع بے موقع ڈاکٹر سید عبداللہ کو مطعون کرتے رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ہیڈشپ کے زمانے میں معین الرحمٰن صاحب کو مولوی عبدالحق پر سید وقار عظیم صاحب کی سفارش کے باوجود پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ یہی الزام ان دنوں کراچی کے صدر شعبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی حد تک راقم اپنے تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہے کہ وہ انتظامی معاملات میں وقار عظیم صاحب کے مشورہ کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ وقار صاحب جو کام چاہتے تھے سید صاحب سے کروالیا کرتے تھے۔ اس کے بعد سوال یہ ہے کہ کیا یونیورسٹی کے ہر شعبہ کا صدر پی ایچ ڈی کے ہر خواہش مند کو رجسٹر کرنے کا پابند ہے یا اس کے کچھ صوابدیدی اختیارات بھی ہیں؟ دوسرے اول تو 1964ء میں پی ایچ ڈی اتنی سستی اور عام نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی پی ایچ ڈی کی رجسٹریشن دنیا کے کسی بھی ملک میں کسی خواہش مند یا امیدوار کا استحقاق نہیں۔ یہ کسی شعبہ کے صدر کی صوابدید رہی ہے اور آج بھی ہے کہ وہ کسی موضوع پر تحقیق مناسب خیال کرتا ہے یا نہیں۔ یہ جائزہ لینا بھی اس کا فرض ہے کہ اس کے نزدیک امیدوار کا میرٹ بنتا ہے یا نہیں یا اس کی اہلیت کے شواہد اسے ملے ہیں یا نہیں۔ معین الرحمٰن' سید صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے خلاف بھی زبانی یا قلمی زہر افشانی کرتے رہتے ہیں یا اپنے ''متاثرین'' کو شہ دے کر اپنے تئیں ان زعماء کی کردار کشی کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال زیر نظر سوال کا مفصل جائزہ کسی اور موقع پر لیا جائے گا۔ وہ تو 1964ء کی بات تھی کہ ہمیں ذرا رک کر چند جملے کہنا پڑے۔ کیا یہ امر واقعی نہیں ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن اپنے شعبہ میں ایم۔ اے اردو کے اُن طلباء کی مقالہ نویسی میں بھی اڑچن ڈالتے رہے ہیں جو یونیورسٹی کے مقرر کردہ معیار پر پورے اتر کر اپنا استحقاق ثابت کر چکے ہوتے تھے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان کی نگرانی میں پیش کیے گئے ایم۔ اے کے بیشتر تحقیقی مقالات طالب علموں پر ٹھونسے ہوئے تھے یا کئی موضوع ان کی مصلحتوں اور مفادات کی پیداوار ہوتے تھے؟ انہوں نے متعدد ایسے مقالے بھی لکھوائے جو کسی بھی حوالے سے امتحانی تحقیقی مقالہ کا موضوع نہ بن سکتے تھے۔ انہوں نے کئی موضوعات پر مکرر مقالہ نگاری کی حوصلہ افزائی کی کیونکہ یا تو وہ کسی مقالہ نگار کو آسانی اور سہولت فراہم کرنا چاہتے تھے یا کسی موضوع شخصیت کو اپنے خلوص کا یقین دلانا چاہتے تھے یا اُسے زیر بار احسان کرنا چاہتے تھے۔ ایک نمونہ دیکھئے: ڈاکٹر معین الرحمٰن کا آنجہانی جگن ناتھ آزاد کے نام خط:

''7 جون 1992ء۔ محب گرامی جگن ناتھ آزاد صاحب' سلام شوق۔

پرسوں پنجاب یونیورسٹی بورڈ آف اسٹڈیز (اردو) کے اجلاس میں ایم اے (اُردو)

کے آپ کی نثر نگاری پر تھیسس کی تجویز زیر بحث آئی اور حسب خواہ منظور ہوئی' مقالہ نگار ہوں گی عاصمہ عزیز اور نگران کار رہیں گے ڈاکٹر سلیم اختر'' (ماہنامہ ''الحمرا'' لاہور ستمبر 2004ء صفحہ :17)۔ (یاد رہے یہ موضوع ڈاکٹر سلیم اختر نے تجویز کیا تھا۔ وہ پہلے ہی جگن ناتھ آزاد کو مطلع کر چکے تھے)

اس تکرار سے تحقیق میں کسی پہلو سے اضافہ نہ ہوا۔ (اگر وہ ارشاد فرمائیں تو راقم ایسے تمام مقالات کی نشاندہی کر سکتا ہے) وہ اپنے طلباء و طالبات کے ساتھ Foul Play سے بھی گریز نہ کرتے تھے مثلاً انہوں نے چند برس پہلے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کے لیے انٹرویوز میں گورنمنٹ کالج لاہور کی اپنی ایک ناپسندیدہ خاتون شاگرد کا کامیاب انٹرویو دیکھتے ہوئے دوسرے ممبران کو بتایا یہ خاتون اور ان کا کنبہ پیپلز پارٹی کے جیالوں کا خاندان ہے۔ اس پر ممبران نے پوچھا: آپ یہ بتائیں محترمہ کا پیش کردہ موضوع پی ایچ ڈی کے لیے موزوں اور مناسب ہے کہ نہیں تو انہیں خاموش ہو جانا پڑا۔ اس سے پہلے 1987ء میں وہ ''کسی'' کو یونیورسٹی میں پوزیشن دلانے کے لیے اپنے ایک سینئر کو لیگ ڈاکٹر سلیم اختر کی بیٹی اور اپنی شاگرد عزیزہ ارم سلیم [راقم ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی اجازت سے ان کا' ان کی صاحبزادی کا نام ظاہر کر رہا ہے مگر اس واقعہ کی تفصیل نہیں بیان کی گئی] کو viva میں اعلانیہ فیل کرانے کی کوشش کر چکے تھے۔ حالانکہ انہیں یقین کی حد تک علم ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ بعدازاں اس طالبہ کے والد گرامی کو Compensate کرنے کے لیے وہ برابر کوشاں رہے۔ انہیں جاننا چاہیے زخم بھر جائے تو بھر جائے نہ اس زخم کا ذمہ دار بھولتا ہے اور نہ اس کی یاد' اس کا احساس اور اس کا نشان مٹتا ہے۔ اگر ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال ڈاکٹر معین الرحمن یہ عمل دہراتے رہے اور نیک نام ہوتے رہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن نے گورنمنٹ کالج کے شعبہ اسلامیات کے نہایت مرنجاں مرنج اور ملنسار استاد پروفیسر محمد اسلم کے بیٹے کے ساتھ جو سلوک کیا وہ افسوسناک ہی نہیں عبرتناک ہے۔ 1996-97ء کے قریبی برسوں میں متذکرہ استاد کے ذہین صاحبزادے (سہیل سرور) جو اردو ادب سے فطری دلچسپی رکھتے تھے اپنے دوستوں سے مشورہ کے بعد امتحانی مقالے کے لیے ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس'' کے موضوع کی اجازت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے انہیں بہت سراہا اور زبانی اجازت دے دی۔ اس طالب علم نے اس موضوع کے گرد و پیش کا سارا مواد جمع کر لیا لیکن یونیورسٹی میں موضوع کی رجسٹریشن کے وقت اس عزیز سے کہا گیا کہ کسی اور موضوع کی طرف نکل جائے۔ قدرتی طور پر وہ بہت پریشان ہوئے۔ ایک دو اساتذہ اور اپنے دوستوں کے سمجھانے پر وہ دوسرے موضوع پر کام کرنے کے لیے رضامند ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''ممنوعہ موضوع'' اس کی ایک کلاس فیلو کے لیے یونیورسٹی سے

رجسٹر کروادیا کیونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ایک ''خدمت گزار'' استاد کی بھتیجی بھانجی تھیں۔ دراصل وہ ''بطور غالب شناسوں'' کے اپنی نگرانی میں لکھے گئے مقالات کے شمار میں اضافہ بھی چاہتے تھے۔ وہ حسب معمول یہ بھی ریکارڈ پر لانا چاہتے ہوں گے کہ خاتون مقالہ نگار کو فرمان فتح پوری کے حوالے سے لوازمہ ان کا فراہم کردہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال ان کا وہ مردود و معتوب شاگرد یونیورسٹی میں چوتھی یا پانچویں پوزیشن حاصل کرتے ہوئے کالج کے طلباء و طالبات میں سر فہرست رہا۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے اُس نوجوان کو College leaving اور کیریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کرنے میں حیل وحجت اور ٹال مٹول سے کام لیا۔ اُس کی کہیں درخواست جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ اُس کے ہاتھ سے صبر وتحمل کا دامن چھوٹ گیا۔ شنید ہے کہ وہ جو کچھ ڈاکٹر صاحب کو سنا گیا ہے' اس کو گوارا کرنے کا کسی شریف آدمی میں تو یارا نہیں ہو سکتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن جیسا مراسم ساز شخص(Relation Builder)وقت اور محنت سے بنائے ہوئے تعلقات کو اپنے کسی جذبے یا ایک عام سی کتاب کی Craze سے چشم زدن میں مسمار کر دیتا ہے۔ اسے اپنے معاشرتی تعلقات' رفاقتوں' مروتوں' شرافتوں اور وضع داری وغیرہ کی حساسیت اور نزاکت کا شمہ بھر احساس نہیں رہتا۔

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

وقار عظیم صاحب سے معین الرحمن کا تعارف کس نے کروایا؟ وقار مرحوم اتنا مائل بہ کرم کیوں ہوئے؟ وہ روایات کو محترم جاننے والے' خلوص اور وفا کی تکریم کرنے والے شخص تھے۔ ایک مفلوک الحال سیکنڈ ڈویژنر کی ایسی دستگیری کی کہ کریمی کی اعلیٰ مثال قائم کر دی۔ یونیورسٹی اور سینٹرل کالج اور ایف سی کالج میں لیکچررشپ دلوانے کے بعد' 1969ء میں غالب صدی کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی کی تقریبات اور مطبوعات کے پروگرام میں ''اشاریہ غالب'' کی ترتیب کا کام بھی معین الرحمن کے نام الاٹ کروا کر دیا۔ پبلک سروس کمیشن میں متوقع سینئر کلاس I کی آسامی کے پیش نظر خاموشی اور رازداری سے سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کروائی۔ اس کے لیے کون سا مقالہ کس عنوان سے پیش کیا گیا کسی کو عرصہ دراز تک معلوم نہیں ہو سکا۔ اب البتہ انھوں نے بعض کتابوں میں اُس کا حوالہ دینا شروع کیا ہے ان کے بقول اُن کے مقالہ کا عنوان ہے: ''غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔۔۔'' 1972ء (دیکھئے نیر پرویز کے ایم فل (اردو) کے مقالے کا ایک حصہ' مطبوعہ بہ عنوان: ''ڈاکٹر سید معین الرحمن اور کائنات غالب'' الوقار پبلی کیشنز لاہور' طبع 2002ء۔ ص 64 تا 66) یہ مقالہ (ان کے بیان کے مطابق) آٹھ ابواب اور 788 صفحات پر مشتمل ہے۔ تاہم اٹھارہ برس بعد ''غالب کا علمی سرمایہ'' کے نام سے کتاب کو پی ایچ ڈی کا مقالہ بتایا گیا ہے' جس میں قرائن کے مطابق اٹھارہ برس میں اتنا ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے کہ اصل تحقیقی مقالہ تقریباً معدوم ہو گیا ہے۔ یاد رہے کہ ''غالب کا علمی سرمایہ'' 1989ء میں پہلی دفعہ یونیورسل بکس' لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ 9 ابواب اور 624 صفحات پر مشتمل ہے۔

اپنے مقالہ پی ایچ ڈی کے باب میں سید معین الرحمٰن کے اپنے بیانات نے لوگوں کے اذہان میں شبہات پیدا کردیے ہیں۔ بعض لوگ تو اپنے شکوک کو مبالغے کی انتہائی حد پر لے جاتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ مقالہ رسمی طور پر پیش ہی نہیں کیا گیا۔ محض کاغذی کاروائی کافی سمجھی گئی۔ اس غلط فہمی اور مغالطے کی اشاعت میں سید معین الرحمٰن کا اپنا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ کئی غیر اہم باتوں کو مستند بنانے کے لیے جزئیات اور تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ ایک مؤرخ کا پوز اختیار کرنے کے لیے ضروری اور غیر ضروری تاریخوں کا اندراج کرتے رہتے ہیں مگر اپنے مقالہ پی ایچ ڈی کے ضمن میں ضروری معلومات اور کوائف کو اخفا میں رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہم جیسے نیاز مندوں کے ساتھ طویل تعلق، قربت اور رفاقت کے زمانہ میں اپنا ذخیرہ کتب اور مسودات کئی بار ہمارے معائنے کے لیے سامنے رکھ دیے مگر کبھی بھول کر بھی اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسز کے جزدان کی گانٹھ نہ کھولی کہ ہم اس علمی و تحقیقی صحیفے کو بوسہ دے کر اپنے مشام جاں کو تازہ اور معطر کر لیتے۔ انہوں نے یہ بات بھی معلوم نہ ہونے دی کہ ان کے مقالے کے خارجی ممتحن کون کون تھے۔ جب یہ 1989ء میں پہلی بار ''غالب کا علمی سرمایہ'' کے نام سے شائع ہوا تو اس کے دیباچے میں لکھا:

''یہ مقالہ جس پر 1972ء میں سندھ یونیورسٹی جام شورو نے پی ایچ ڈی کی سند فضیلت عطا کی تھی، تازہ مصادر سے استفادے کے بعد، اب کسی قدر ترمیم اور تخفیف کے ساتھ غالب کی ایک سو بیسویں برسی کے موقع پر شائع ہو رہا ہے۔ یہ غالب کی ان تصانیف کے جائزے پر مبنی ہے جو غالب کی زندگی میں یا مابعد منصۂ شہود پر آئیں۔'' (غالب کا علمی سرمایہ، ص 23)

''غالب کا علمی سرمایہ'' کی پہلی اشاعت کے پیش لفظ اور دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں اپنے تھیسز کا اصل عنوان نہیں لکھا۔ تاہم 25 مئی 2004ء کے ''نوائے وقت'' راولپنڈی کے ادبی صفحہ پر انٹرویو میں کہا ہے:

''غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی (توضیحی) مطالعہ'' میری ریسرچ کا موضوع تھا۔

پندرہ برس قبل حوالہ کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں، یونیورسل بکس لاہور، 1989ء، صفحہ 40

اہل نظر و بینش ہی بتا سکتے ہیں کہ کیا متذکرہ دونوں عنوان یعنی ''غالب کا علمی سرمایہ'' اور ''غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' دو مختلف تحقیقی سمتیں نہیں ہیں؟ گویا اس سے ہم یہ استخراج و استنباط کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ''غالب کا علمی سرمایہ'' معین الرحمٰن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ نہیں ہے۔

وقار عظیم صاحب کی اس پشت پناہی، دھکے اور سرپرستی سے معین الرحمٰن صاحب کا 1973ء میں

انیس گریڈ میں براہ راست سیلیکشن ہو گیا۔ کہا جاتا ہے پبلک سروس کمیشن کی اس آسامی کے لیے ایک شرط یعنی (پی ایچ ڈی) پوری کرنے والے وہ واحد امیدوار تھے لہٰذا کوئی مقابلہ نہ ہو سکا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس آسامی کے لیے دوسرے امیدوار' قادیانی عقیدے کے حامل ایک استاذ ڈاکٹر پرویز پروازی تھے۔ وہ فرسٹ ایئر سے ایم اے فائنل تک متحدہ پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے سالانہ مباحثوں کے ایک مشہور' ممتاز اور نمایاں Debator تھے اور سید معین الرحمن ایک شرمیلے' محجوب اور (بقول شریف اشرف) ''معشوق صفت نوجوان'' تھے۔ (دیکھیے ''نذر معین'' ص 223 پر شریف اشرف کا مضمون) قیاس کے مطابق ڈاکٹر پرویز پروازی کی انٹرویو میں پرفارمنس بہتر رہی ہو گی مگر چونکہ کمیشن کا فیصلہ ڈاکٹر معین الرحمن کے حق میں تھا (مبینہ طور پر اس انٹرویو میں پروفیسر محمد عثمان اور ڈاکٹر وحید قریشی Subject expert تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی معین الرحمن کو ناپسند کرنے کے باوجود غالباً عقیدہ کی بنا پر ڈاکٹر پرویز پروازی کے مقابلے میں ڈاکٹر معین الرحمن کو Favour کیا تھا۔ ان کی زندگی بھر کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی بنیاد یہی سیلیکشن ہے) اس پر انہوں (معین الرحمن) نے جنوری 1974ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور میں پروفیسر اردو کا عہدہ سنبھالا۔ لہٰذا شعبہ میں سینئر ہونے کے باعث وہ صدر شعبہ قرار پائے۔ یہ ایک روایتی منصب ہے ورنہ بحیثیت عہدہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ فطری طور پر شعبہ اردو کے امور کے انچارج ٹھہرے۔ لائل پور ابتداً ان چار اضلاع میں شامل تھا جہاں انگریزی' ریاضی اور اردو ایم۔ اے کی کلاسز کا اجرا ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی سے Affiliation کی بناء پر متعلقہ کالجوں کے ایم۔ اے کی سطح کے شعبوں کے انچارج یا صدر شعبہ' پنجاب یونیورسٹی کے متعلقہ شعبوں کے بورڈز آف سٹڈیز کے ممبر بھی قرار پاتے ہیں۔ اس حوالے سے ایم۔ اے کے ممتحن بھی بنتے ہیں۔ یونیورسٹی سے ملحق کالجوں میں ایم۔ اے کی سطح پر 25 طالب علم داخل کرنے کی حد مقرر ہے۔ عملی طور پر ایم اے اردو کی یہ کلاسز طالبات پر ہی مشتمل ہوتی ہیں۔ کبھی ایک کبھی دو تین طالب علم بھی داخلہ لے لیتے ہیں۔

ادھر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اتفاق سے ایسا ہوا کہ Rotation کے اصول کے تحت ڈاکٹر وحید قریشی یکم جنوری 1973ء تا 20 اپریل 1975ء صدر شعبہ اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ہوئے اور اس کی رو سے وہی یونیورسٹی بورڈ آف سٹڈیز کے کنوینیر بھی تھے۔ وہ بورڈ کی میٹنگوں میں ڈاکٹر معین الرحمن (شعبہ اردو گورنمنٹ کالج فیصل آباد) کو آفیشل معاملات تک محدود رکھتے تھے مگر معین الرحمن صاحب کا کچھ سہولتوں اور حاجتوں کے بغیر توسیع ذات کا کاروبار چلتا نہ تھا۔ موصوف کنوینر کے قریب آنے کے لیے مفاہمت' مصالحت اور خوشامد کے سب سے نچلے زینے پر بھی آ گئے مگر ڈاکٹر وحید قریشی نے انہیں اپنے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اورینٹل کالج سٹاف پر سید وقار عظیم کے نیازمندوں (مثلاً ڈاکٹر عبید اللہ خان) وغیرہ کا بھی ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی دوبارہ صدر شعبہ اور کنوینر بورڈ آف سٹڈیز ہوئے۔ ان سے بغض وعناد اور عداوت کے باوجود موصوف (معین الرحمن)

نے پینترا بدل کر قریب آنا چاہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ادھر 1975ء سے بعد کے چار برسوں میں ڈاکٹر وحید قریشی اورینٹل کالج میں مندرجہ ذیل عہدوں پر تعینات رہے:

☆ ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ' پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
20اپریل 1975ء تا یکم فروری 1981ء۔

☆ غالب پروفیسر' اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور 25اپریل 1973ء تا 13 فروری 1985ء۔

☆ صدر شعبہ پنجابی' اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور یکم مارچ 1976ء تا یکم مارچ 1977ء۔

☆ پرنسپل' اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور 13 اگست 1980ء تا 15 اپریل 1983ء۔

☆ صدر شعبہ اردو' اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور یکم مارچ 1979ء تا 15 اپریل 1983ء۔

ازاں بعد ڈاکٹر وحید قریشی صاحب جون 1997ء تک مختلف عہدوں پر (مثلاً ناظم اقبال اکادمی لاہور' چیئرمین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد' معتمد اعزازی بزم اقبال لاہور' پروفیسر (اعزازی) حمید نظامی چیئر شعبہ ابلاغیات' پنجاب یونیورسٹی لاہور اور جنرل سیکرٹری (اعزازی) اردو اکیڈمی پاکستان لاہور) متمکن رہے۔ اسی طرح وہ 1964ء سے تا حال مختلف ادوار میں مندرجہ ذیل تحقیقی' علمی و ادبی رسائل و جرائد کے ایڈیٹر رہے۔

☆ مجلہ ''علمی'' لاہور

☆ ''صحیفہ'' مجلس ترقی ادب لاہور

☆ مجلہ ''تحقیق'' جامعہ پنجاب لاہور

☆ اورینٹل کالج میگزین' یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

☆ اقبال ریویو (اردو' انگریزی' فارسی) اقبال اکادمی پاکستان لاہور

☆ اخبار اردو' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

☆ اقبال' بزم اقبال لاہور

☆ مخزن' قائداعظم لائبریری لاہور 2001ء تا حال۔

ڈاکٹر صاحب کی ان حیثیات سے معین الرحمٰن صاحب مخاصمت برقرار رکھتے ہوئے کوئی مفاد حاصل نہیں کر سکتے تھے اس کے لیے موصوف نے وقار عظیم صاحب کے اورینٹل کالج میں پرانے نیاز مندوں (ڈاکٹر عبیداللہ خان وغیرہ) کو Desert کیا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر وحید قریشی کے قریب آنے کے لیے انہوں نے اپنے معروف ہتھکنڈے بروئے کار لانے شروع کیے مثلاً

☆ اپنی So Called تصانیف و تالیفات باقاعدگی سے انہیں ارسال کرنے لگے۔

☆ مختلف موسموں اور تہواروں اور سالگرہ کے دنوں پر مبارکباد کے خطوط کی ترسیل۔

☆ مختلف مرتبہ کتابوں یا گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ ''تحقیق نامہ'' کی ترسیل۔

☆ مختلف اصحاب کی کتابوں پر تبصروں یا مضامین میں ڈاکٹر وحید قریشی سے متعلق حوالوں کی Cutting کی ترسیل۔

ان میں زیادہ موثر ہتھکنڈہ اپنی مختلف کتابوں کے انتساب اور آئندہ ایڈیشنوں میں بدلے ہوئے انتساب چھاپنا شامل ہے۔ پھر ان ارتسامات واندراجات کاHigh Light کرنے کے بعد متعلقہ افراد(یہ بات شاذ ہے کہ ان میں کوئی مرحوم ہو' اگر ہوتا ہے تو اس کے متعلقین بشرطیکہ ان کے اعلیٰ مناصب ہوں) کو ارسال کرنا ہے۔ ذیل میں ڈاکٹر وحید قریشی کے نام موصوف کے انتسابات اور ان کی کتب میں قریشی صاحب کے حوالے نقل کیے جا رہے ہیں۔ راقم کے سامنے موصوف کی ساری ''مطبوعات اور مرتبات'' نہیں ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے نام پہلا انتساب جو ہمیں دستیاب ہوا وہ اُس زمانے کا ہے جب قریشی صاحب 20 اپریل 1975ء تک صدر شعبہ رہنے کے بعد ڈین' غالب پروفیسر' پرنسپل اورینٹل کالج اور دوبارہ صدر شعبہ تھے۔ اس لیے موصوف ان کا دل موم کرنے کے لیے بھر پور کوشش کرتے رہے۔ اس کوشش کا پہلا قدم دیکھیے:

معین الرحمن کی کتاب ''تحقیق غالب'' طبع اول 1981ء ناشر اردو اکیڈمی سندھ کراچی کا انتساب بظاہر معصومیت اور اخلاص پر مبنی دکھائی دیتا ہے مگر اس کے باطن میں جو ریشہ دوانی چھپی ہوئی ہے وہ ذرا سے تامل پر روشن ہو جاتی ہے۔ بہر حال دیکھیے اور لطف اٹھایئے۔

''اردو تحقیق کے دبستان لاہور کے نام

ماضی:

حافظ محمود شیرانی

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع

پروفیسر سید وقار عظیم

حال:

ڈاکٹر وحید قریشی

مستقبل:

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

محمد اکرام چغتائی''

یہ درست ہے کہ انتساب ایک بہت ہی ذاتی فعل ہے مگر جب یہ انتساب ''اردو تحقیق کے دبستان

لاہور کے نام" ہے تو اس میں متعدد اہم ناموں کو نظر انداز کرنا محل نظر ٹھہرتا ہے۔ خصوصاً حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے لائق اور نامور جانشین ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کا نام خارج کر کے ڈاکٹر معین الرحمٰن نے سمجھ لیا ہے کہ اردو تحقیق کی تاریخ میں سے وہ صفحہ پھاڑ لیا ہے جس پر انمٹ سیاہی سے سید صاحب مرحوم کا نام لکھا جا چکا ہے۔

انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم سے اپنے خیال میں اپنے "پہلے عشق مولوی عبدالحق" پر پی ایچ ڈی کی اجازت نہ دینے کا انتقام لے لیا ہوگا۔ ضمناً سوال یہ ہے کہ جب وہ چوری چھپے سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے گئے تو انہوں نے اپنا موضوع "مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات" کیوں نہ منظور کرایا۔ جب منظوری دینے والی مہربان شخصیت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی تھی اور ان کے ہاتھ میں موصوف کا ہاتھ دینے والی شخصیت وقار عظیم مرحوم کی تھی تو عبدالحق پر کام کرنے کی درخواست مسترد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ یقیناً مولوی صاحب کی بجائے غالب کی تصنیفات پر اجازت لینے کا باعث کوئی دوسری مصلحت یا آسانی ہو گی۔ معین الرحمٰن ہر سیدھی بات میں ٹیڑھ میڑھ کیوں پیدا کرتے ہیں۔ یہ ان کے رفیق کار اور ماہر نفسیات ڈاکٹر سلیم اختر سوچیں؟

چونکہ بات سے بات نکلتی آ رہی ہے لہٰذا اس دباؤ اور بہاؤ کو روک کر اب یہاں ڈاکٹر وحید قریشی کا تذکرہ یا اندراج موصوف کی مرتبہ کتابوں میں جہاں آیا ہے اس کو بغیر تبصرہ یہاں نقل کرنے کو اولیت دی جائے گی۔ ممکن ہے اس ذیل میں سارے حوالے نہ آنے پائیں۔

1۔ کہا جاتا ہے کہ 1974ء میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مرتبہ (وہ اسے مصنفہ کے طور پر پیش کرتے ہیں) کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" شائع ہوئی تو ڈاکٹر وحید قریشی نے ریڈیو پاکستان لاہور پر تبصرہ میں اس کی تحقیقی و تاریخی غلطیوں اور کوتاہیوں اور اس کے بعض مآخذ کی طرف اشارہ کیا۔ ظاہر ہے انہیں یہ تبصرہ ناگوار گزرا۔ کیوں کہ پاکستان میں علمی اختلاف کا محرک دشمنی، حسد اور عناد ہی خیال کیا جاتا ہے۔ معین الرحمٰن نے اس کی طبع دوم لاہور 1976ء میں مورخہ 8 اگست 1975ء کو لکھا:

"کتاب کا پہلا ایڈیشن ایک سال کے اندر اندر ختم ہو گیا اور علی گڑھ کی اصطلاح میں موٹی عقل کے "عافیت سوز" اور بھاری بھرکم اور ان کے نیم ہم نوا "دراز قد" ناقد بھی کتاب کی کسی نہ کسی خوبی کے معترف ہوئے اور اسے یکسر نظر انداز نہیں کر سکے۔ اس ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ جہاں دل کی تنگی کا مظاہرہ ہوا' بحیثیت مجموعی اس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔"

بحوالہ: غالب اور انقلاب ستاون: الفیصل اردو بازار لاہور' جنوری 1989ء ص 22

ڈاکٹر وحید قریشی کی اس بالواسطہ مخالفت کے بعد جلی یا خفی انداز میں کس طرح یہ سلسلہ چلا' اس کی کڑیاں جوڑنے کی فرصت میسر نہیں ہے کیوں کہ کمپوزر اس رواں مسودے کی اگلی سلپس کا منتظر ہے۔ غالباً

معین الرحمٰن کو گورنمنٹ کالج فیصل آباد اور لاہور میں بی اے اور ایم اے اردو کلاسز کے حوالے سے اکیڈیمک معاملات و مسائل (نصاب' منظوری تحقیقی مقالات' پیپر سیٹر' ممتحین کا تقرر وغیرہ) میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ قارئین اندازہ نہیں کر سکتے کہ اپنے اپنے شعبہ جات کے اور یونیورسٹی سے منسلک ذاتی مفادات کے حصول اور تحفظ کے لیے ملحقہ کالجز کے صدور شعبہ کو یونیورسٹیوں کے صدور کی خوشنودی کا کتنا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ ان کی ساری کارگزاری یونیورسٹی کے صدر شعبہ کے ساتھ ساز باز پر منحصر ہوتی ہے' اور پھر جتنا کوئی معاملات اور اثر و رسوخ کے دائرہ کو وسعت دے لے یہ اس کی ''طرہ بازی'' ہے۔ چونکہ معین الرحمٰن کو بہت کام رفو کے ہوتے تھے اس لیے انہیں صدر شعبہ یونیورسٹی کی قربت اور دوستی کی ضرورت تھی۔ معین الرحمٰن' ڈاکٹر وحید قریشی اور خواجہ محمد زکریا سے مخاصمت کو محبت' قربت اور نیاز مندی کے مرحلہ تک کس طرح لائے' تاریخ کی ایک عجوبہ کاری ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے نام ''تحقیق غالب'' اور ''بازیافت غالب'' نامی کتابوں کے جو انتساب ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کیے' ان کی نقل پچھلے صفحات میں آ چکی ہے۔ اب ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مرتبہ یا مولفہ کتب پر ڈاکٹر وحید قریشی کی چند آرا ملاحظہ فرمائیں: پہلی رائے دیکھیے:

1۔ ''دیوانِ غالب نسخہ خواجہ'' کی صورت میں متنی تحقیق و تدوین کا اتنا بڑا کام معین صاحب کے ہاتھوں انجام پایا ہے کہ اب اس سے بہتر کام کرنا شاید خود معین الرحمٰن صاحب سے بھی ممکن نہ ہو۔ یہ گزشتہ پچاس برس میں ہمارے ہاں اردو تحقیق اور بالخصوص غالبیات کے میدان کا بہت قابل فخر کارنامہ ہے۔''

لاہور' 15 فروری 1999ء' پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی' مطبوعہ تحقیق نامہ (شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ) شمارہ 8' مدیر: پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ شعبہ اردو گورنمنٹ لاہور' 99-1998ء' صفحہ 82

2۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی مرتبہ کتاب: بازیافتِ غالب' الوقار لاہور' 1999ء' صفحہ 219,220 [ضابطہ کے مطابق: صفحہ 1 تا 240 پبلشر کا نام درج نہیں البتہ پشتہ اور جلد کے آخر پر یہ نام موجود ہے۔ صفحہ 4 پر ناشر: سید وقار معین اور طابع: گنج شکر پرنٹنگ پریس لاہور درج ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر تحقیق نامہ جرنل شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کے دو شماروں کی مجلد صورت معلوم ہوتی ہے]

اس کتاب کے صفحہ 213 پر ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مندرجہ ذیل تحریر بطور مضمون شائع ہوئی ہے

نمائشِ کتب بر غالب 1969ء تا 1982ء

(ذاتی ذخیرہ غالبیات ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

کچھ اس نمائش کے بارے میں: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

[صفحہ 213-214]

حصہ اول: (بلا حد زمانی):

چند متخصصین غالب کا تصنیفی اور تالیفی سرمایہ:

1۔مولانا غلام رسول مہر

8۔ڈاکٹر وحید قریشی' لاہور

9۔ڈاکٹر سید معین الرحمٰن [صفحہ 215' کتاب ہذا]

زیر نظر کتاب کے صفحہ 216 تا 221 پر ترتیب وار ہر متخصصِ غالب کے غالب پر تحقیقی و علمی کام کی فہرست مرتب کی گئی ہے۔شمار نمبر 8 پر ڈاکٹر وحید قریشی: غالب پروفیسر' صدر شعبہ اردو' پرنسپل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور: کی سرخیوں کے نیچے یہ تفصیل درج ہے:

1۔نذرِ غالب' طبع اول' لاہور' 1969ء

2۔نذرِ غالب' طبع دوم' لاہور 1970ء

3۔صحیفہ' غالب نمبر' حصہ اول' لاہور' جنوری 1969ء

4۔صحیفہ' غالب نمبر' حصہ دوم' لاہور' اپریل 1969ء

5۔صحیفہ' غالب نمبر' حصہ سوم' لاہور' جون 1969ء

6۔صحیفہ' غالب نمبر' حصہ چہارم' لاہور' اکتوبر 1969ء

7۔صحیفہ' غالب نمبر' حصہ پنجم' لاہور' اپریل 1973ء

8۔ارمغانِ ایران' (صفحہ 68-181) متعلق بہ غالب' لاہور' 1971ء

3۔جہانِ اقبال

یہ کتاب بظاہر ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصنیف کے طور پر شائع ہوئی ہے لیکن دراصل ایک مرتبہ کتاب ہے۔اس کے دیباچہ بعنوان حرفے چند میں ناشر ڈاکٹر وحید قریشی کا درج ذیل الفاظ میں شکریہ ادا کیا گیا ہے:

''یہ کتاب علامہ اقبال کے ایک سو بیسویں جشن ولادت کی مناسبت سے محترم ڈاکٹر وحید قریشی کے ایماء اور اہتمام سے شائع ہو رہی ہے۔جس کے لیے میں ان کا بہ دل ممنون ہوں''

معین الرحمٰن: یکم اکتوبر 1996ء [جہانِ اقبال' اقبال اکادمی پاکستان لاہور' 1997ء]

4۔ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: تحقیقِ غالب' مکتبہ عالیہ لاہور' تازہ اشاعت 1998ء

اعترافات: اس عنوان کے تحت (صفحہ 283 تا 288) ایک درجن اصحاب علم کی آرا درج کی گئی ہیں۔دوسرے نمبر پر ڈاکٹر وحید قریشی کی مندرجہ ذیل رائے 1981ء کی تاریخ کے ساتھ موجود ہے:

''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا شمار پاکستان کے ان نوجوان محققین میں ہوتا ہے جو اپنی وسعت

معلومات' محنت اور لگن کی بنا پر ادب میں ایک مقام حاصل کر چکے ہیں۔ غالبیات میں ان کی وقت نظر' چوٹی کے ماہرین سے داد وصول کر چکی ہے۔

زیر نظر کتاب ''تحقیق غالب'' غالب کے بارے میں ان کے دس تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں انہوں نے غالب کے بارے میں نئی معلومات کی فراہمی سے بعض مباحث پر دوبارہ فیصلہ کن نظر ڈالی ہے اور اپنے نتائج سے غالب شناسی کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ خصوصاً ''گل رعنا'' کے بارے میں مہیا کردہ شواہد اہم بھی ہیں اور قابل قدر بھی۔ ان کی گرفت نرم سہی' لیکن یہ نرمی ان کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں (ہوتی) انہوں نے مطالعۂ غالب میں نرم مزاجی کے ساتھ حق گوئی کا نرالا اسلوب نکالا ہے جو وقیع بھی ہے اور لائق تحسین بھی۔'' (کتاب ہذا' صفحہ 284)

☆ ☆ ☆

5۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ شخص اور عکس۔ از نائیلہ انجم' الوقار' لاہور' 2003ء

مندرجہ بالا کتاب کا اصل مرتب اور محرک اشاعت کون ہے؟ ایک تحقیق طلب بات ہے۔ بہر حال کتاب معین الرحمٰن کے زیر اہتمام ان کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی۔ کتاب کے آخر میں اس کی مصنفہ یا مرتبہ کا معین الرحمٰن کی کتاب ''غالب کا علمی سرمایہ'' پر تبصرہ ہے۔

اس تبصرہ کے ایک پیرا میں ڈاکٹر وحید قریشی کی ''تحقیق غالب'' پر رائے کے آخری تین فقروں کو دہرانے سے پہلے کہا:

''ڈاکٹر وحید قریشی نے ٹھیک کہا ہے کہ ''غالبیات'' میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی گرفت نرم سہی لیکن یہ نرمی۔۔۔لائق تحسین بھی ہے'' صفحہ 77

اردو میں تنقیدی شعور کے انجماد کا یہ عالم ہے کہ طالب علم ایم اے کا ہو یا ایم فل اور پی ایچ ڈی کا وہ دماغ کا فیوز اڑا کر اور آنکھیں بند کر کے مطالعہ کرتا ہے۔ خصوصاً کثرت سے اخبارات ورسائل میں چھپنے والے محققین' ناقدین اور مبصرین کی آراء قبول کرتے ہوئے وہ لحظہ بھر کے لیے نہیں سوچتا کہ ان میں کس قدر صداقت' سچائی' مدح' مبالغہ یا تعصب اور عناد کا حصہ ہے۔ یہی مبصرہ ایک اقتباس یوں نقل کرتی ہیں:

ڈاکٹر انور سدید نے بالکل درست کہا ہے کہ:

''ڈاکٹر معین۔۔۔ ہندوستان میں غالبیات کے سلسلے میں جو مقام مالک رام' مختار الدین احمد' اور مولانا امتیاز علی عرشی کا ہے وہی مقام مولانا غلام رسول مہر' شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ پاکستان میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو حاصل ہے۔'' صفحہ 179

6۔ ''بر سبیل غالب'': از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ مرتبہ سید وقار معین' الوقار لاہور' ستمبر 2000ء

اس کتاب کے صفحہ 208 پر جناب ناصر زیدی کا ایک اخباری کالم بعنوان ''ہم طرفدار ہیں غالب

کے۔۔۔‘‘ نقل کیا گیا ہے۔ اسی مضمون میں (صفحہ 212 پر) درج ہے:

ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں:

’’دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ کی تنی ترتیب و تدوین اور تصحیح کا کام ایک ایسا کارنامہ ہے اگر انہوں نے (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے) زندگی میں یہی کام کیا ہوتا تو بھی غالبیات کے حوالے سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔۔۔‘‘

☆ ☆ ☆

7۔ کتاب: نقوشِ غالب: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: الوقار پبلی کیشنز‘ 50 لوئر مال لاہور‘ 1995ء

متذکرہ کتاب کے ٹائٹل اور اندرونی ٹائٹل (صفحہ 3) سے بالکل یہی پتہ چلتا ہے کہ سید معین الرحمٰن اس کتاب کے بلاشرکت غیرے مصنف ہیں۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب مجلّہ ’’تحقیق نامہ‘‘ ریسرچ جرنل شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کے مختلف شماروں کے مضامین کی مجلد شکل ہے اور متذکرہ ادارہ سے Sale ہو رہی ہے۔ اس کتاب کے مشمولات میں تقریباً پچاس لوگوں کی چھوٹی بڑی تحریریں شامل ہیں۔

کتاب کے صفحات 352 تا 359 ’’جا گیرِ غالب‘‘ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن پر ڈاکٹر وحید قریشی کے چھ صفحات‘ جناب مشفق خواجہ کی آٹھ سطروں اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی سات سطروں پر رائے محیط ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے میں دلچسپی رکھنے والے قارئین متذکرہ کتاب کا متعلقہ حصہ ملاحظہ فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

یاد رہے اس سے پہلے ’’نقوشِ غالب‘‘ میں ڈاکٹر وحید قریشی کا متذکرہ مضمون مجلّہ ’’تحقیق نامہ‘‘ شمارہ نمبر 4,3 کے صفحات 199 تا 204 پر شائع ہو چکا ہے۔

☆ ☆ ☆

8۔ تقاریر سربراہانِ پاکستان: (اولین خطابات 1947ء تا 1977ء)

مرتب و مترجم: لیاقت علی چودھری؛ ناشر: الوقار پبلی کیشنز‘ لاہور

تاثر: ڈاکٹر وحید قریشی

مشمولہ: ’’تحقیق نامہ‘‘ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور‘ شمارہ 7,6

معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر وحید قریشی نے ہمیشہ سید معین الرحمٰن کی فرمائش کا خیال رکھا ہے۔ زیرِ نظر کتاب پر ڈاکٹر وحید قریشی کے مرتبہ کے سکالر کا تاثر ریکارڈ کرنا‘ مرتب‘ مدیر اور ناشر ’’تحقیق نامہ‘‘ سید معین الرحمٰن‘ اور الوقار پبلی کیشنز کے لیے ایک اعزاز ہے۔

☆ ☆ ☆

9۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی مرتبہ کتاب ’’گورنمنٹ کالج‘ شعبہ اردو کوائف اور

کارکردگی'' یونیورسل بکس اردو بازار لاہور' دسمبر 1989ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کی گورنمنٹ کالج میں ایم اے اردو کلاسز کے اجرا کے سلسلے میں رپورٹ کے علاوہ صفحہ 25-26 پر قریشی صاحب کا یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے:

''۔۔۔جب عمر حیات ملک پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ستمبر (1947ء تا جون 1950ء) اُن کی اور بخاری صاحب کی ''رقابت'' زوروں پر تھی۔ نتیجے کے طور پر بخاری صاحب نے اعلان جنگ کر کے اردو ایم اے کی تدریس کا گورنمنٹ کالج میں الگ انتظام کر دیا اور ایم ایس سی کے یونیورسٹی کے طلبا پر گورنمنٹ کالج کی لیبارٹری کے دروازے بند کر دیے۔ عمر حیات ملک صاحب نے ایک طرف گورنمنٹ کالج کی ایم اے اردو کی کلاسوں کو غیر قانونی قرار دینے کے لیے اقدامات شروع کر دیے اور ساتھ ہی بخاری صاحب، کو جو ایم اے کو اپنے کالج میں پڑھانے بھی لگے تھے کم علم ثابت کرنے کی ٹھانی۔ بورڈ (آف اسٹڈیز) میں بخاری صاحب کا نام ایف اے اور بی اے کے لیے بطور ممتحن اردو خود ہی تجویز کرایا اور پھر ہر جگہ اس کے خلاف فیصلہ کروایا اور طے ہوا کہ بخاری صاحب کے پاس اردو کی کوئی ڈگری نہیں اس لیے نہ وہ ان کلاسوں کو پڑھا سکتے ہیں نہ ان کا امتحان لینے کے مجاز ہیں۔۔۔'' [نقوش' لاہور شمارہ 45-46 ستمبر اکتوبر 1954ء صفحہ 203]

منقول از'' ۔۔۔کوائف اور کارکردگی' صفحہ 25-26]

اسی کتاب کے صفحہ 85 پر مرتب کتاب ہذا نے اپنے مقالہ پی ایچ ڈی'' غالب کا علمی سرمایہ'' کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی مندرجہ ذیل توصیفی و تعریفی رائے مکرر درج کی ہے

''غالبیات میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی گرفت ۔۔۔ جو وقیع بھی ہو اور لائق تحسین بھی۔''

10۔ دل کی کتاب از ڈاکٹر معین الرحمٰن مرتبہ: انبساط امین عباسی' الوقار' لاہور 2000ء صفحہ 58

''اس دور کے نقادوں میں۔ غالبیات کے سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر اور اُن کے حلقۂ اثر کے علاوہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا نام قابل ذکر ہے''

[ڈاکٹر وحید قریشی' اردو تنقید کا پچاس سالہ سفر' نوائے وقت لاہور' 19 اگست 1997ء]

11۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ۔ تجزیہ و تحسین۔ مرتبین ڈاکٹر سید معراج نیر' اصغر ندیم سید

شمار نمبر 1 کے تحت ہماری زیر نظر کتاب کے صفحہ 35 پر درج ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے ان کے ڈھائی صفحہ پر مبنی مضمون بعنوان ''نسخۂ خواجہ کا خیر مقدم'' کی آخری سطور ہیں مگر یہاں آخری سطر کی شکل یہ ہے۔

''۔۔۔قابل فخر کارنامہ اور ایک بیش قیمت اضافہ ہے''

''اور ایک بیش قیمت اضافہ'' کا ٹکڑا بعد میں شامل کیا گیا ہے۔ یہاں تاریخ بھی مختلف ہے

[لاہور: 13 جون 1999ء]

[۔۔۔تجزیہ و تحسین۔۔۔الوقار' لاہور' 2000ء صفحہ 171-173]

12۔ مجلہ تحقیق نامہ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور 93-1992 شمارہ 2

''پاکستان میں اردو سے متعلق ڈی لٹ کی پہلی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1965ء میں ڈاکٹر وحید قریشی (ولادت گوجرانوالہ: 14 فروری 1925) کو میر حسن اور اُن کا کارنامہ پر دی گئی۔ انہوں نے 1952ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ''انشا لٹریچر ان پرشین۔ اے کرٹیکل اسٹڈی کے موضوع پر فارسی میں ڈگری حاصل کی۔ وحید قریشی نے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا تو ان کی عمر ستائیس برس اور جب انہوں نے اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری لی تو وہ عمر عزیز کے چالیسویں برس میں تھے۔ اس امتیاز میں کم لوگ ان کے شریک ہوں گے۔'' صفحہ 137

[مضمون: ''پاکستانی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کی روایت اور صورت حال'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن]

13۔ مجلہ ''تحقیق نامہ'' لاہور شمارہ 3-4 (95-1994)

''جاگیر غالب۔ ایک مطالعہ'' تبصرہ از ڈاکٹر وحید قریشی صفحہ 199-204

14۔ تحقیق نامہ غالب۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ الوقار لاہور 1998ء

ڈاکٹر معین الرحمٰن، پروفیسر منور علی ملک کے استفسارات کے آخری جواب میں لکھتے ہیں:

''عہد موجود میں غالب پر کام کرنے والوں میں آپ مجھے اہمیت دیتے ہیں۔ چلیے ایک نام میرا سہی لیکن عہد حاضر میں غالب پر زیادہ نمایاں کام کرنے والوں یا نام لیووں میں ڈاکٹر خلیق انجم، کالی داس گپتا رضا، پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، اکبر علی خاں عرشی زادہ، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر وحید قریشی، آفتاب احمد خاں (کراچی) اور ڈاکٹر آفتاب احمد (اسلام آباد) کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ خدا انہیں بہت عمر دے اور غالب پر سدا مہربان اور متوجہ رکھے۔''

مضمون (غالب آج بھی غالب ہے) صفحہ 432

15۔ دل کی کتاب از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: مرتبہ: انبساط امین عباسی، الوقار لاہور 2000ء

(ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ایوب ندیم سے ایک مکالمہ)

''ایوب ندیم: آپ کے خیال میں درج ذیل محققین کی حفظ مراتب کے اعتبار سے کیا ترتیب بنتی ہے؟ ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔

معین الرحمٰن: اس فہرست میں ایک آدھ نام تو میرے نزدیک کسی قدر زائد اور برائے بیت ہے، بایں ہمہ کم از کم ڈاکٹر عندلیب شادانی کو تو ضرور مقدم اور مجھے موخر رکھنا چاہیے۔ میرا نام لینا ضروری ہو تو اسے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے پہلے لینا تو بالکل ہی سوئے ادب (سوءِ ادب) ہے۔

ایوب ندیم: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب! آپ ممتاز محقق' نقاد ہیں۔ آپ کی خدمت میں اعزازات وایوارڈ وغیرہ؟ آپ کے نزدیک ایوارڈ اہم ہے یا ریوارڈ؟

معین الرحمٰن: پچھلے کچھ برسوں سے میں اپنے رفقائے کار اور اعلیٰ مدارج میں اپنے طلبا وطالبات کی زبان پر یہ سوال پاتا ہوں کہ پرائڈ آف پرفارمنس یا دوسرے سول اعزازات کے لیے میرا نام یا کام کیوں زیرِغور نہیں آرہا؟ میرا جواب ہمیشہ یہ رہا کہ مجھ سے بہت بہتر اور افضل تر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں' ڈاکٹر وحید قریشی' مشفق خواجہ' ڈاکٹر وزیر آغا اور جمیل الدین عالی وغیرہ ایسے بہت سے اکابر ہیں جو ان اعزازات کے مجھ سے کہیں زیادہ مستحق ہیں۔۔۔خدا کا کرنا یہ ہوا کہ آگے پیچھے ان بزرگوں کو اعزازات تفویض ہوئے۔ صفحہ 245-244] اور میں رہ گیا!]

16۔ شمار 14 کے تحت اقتباس قبل ازیں مجلہ تحقیق نامہ شمارہ 5' 1995-96ء میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ دیکھیے صفحہ 69] یہی اقتباس "دل کی کتاب" صفحہ 155 پر پہلے دو فقروں میں خفیف تبدیلی کے ساتھ موجود ہے۔]

☆ ☆ ☆

یونیورسٹیوں میں امتحانی ضرورتوں کے لیے لکھے جانے والے مقالات کا اردو کے روز افزوں تنقیدی اور تحقیقی سرمائے میں بڑا حصہ خیال کیا جاتا ہے یہاں ان مقالات کے معیار سے بحث ہے اور نہ ہی سفارش اور جانبداری کے منفی اثرات کا ذکر ہے۔ یونیورسٹیوں میں امتحانی تحقیقی مقالات کے ضمن میں سرگرمیوں سے عام لوگ واقف نہیں ہیں۔ امتحانی تحقیقی مقالات کے لیے کلاسیکی موضوعات یا قدیم وجدید نامور ادیبوں اور شاعروں کے احوال و آثار بطور موضوع' معدوم ہوئے' ریسرچ اسکالرز کی تعداد میں ناقابلِ یقین اضافہ ہوا تو زمانہ قریب یا زمانہ حال کے ادیب و شاعر موضوع قرار پائے۔ ادیب و شاعر تو فطری طور پر تعریف و تحسین کے خواہاں ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے ان میں سے کوئی کہیں موضوع قرار پاتا ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور متعلقہ شعبہ کے صدر اور نگران پروفیسر کا ناقابلِ یقین حد تک احسان مند ہوتا ہے۔ اگر قریبی زمانے میں وفات پانے والا ادیب یا شاعر موضوع قرار پاتا ہے تو اس کے لواحقین اپنے بزرگ یا عزیز کی قدر شناسی پر زر خرید غلام ہی تو بن جاتے ہیں۔ اس صورت حال سے کئی یونیورسٹیوں کے شعبوں کے کئی Manipulator کارپردازوں نے بہت مفادات حاصل کیے ہیں۔ یہ حکایت بھی لذیذ اور طویل ہے' شاید کسی دن یہ داستان کوئی داستان گو سنا ہی دے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا اتنا وقیع علمی کام ہے کہ ان کے احوال و آثار پر مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات قلم بند ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بھی اپنی نگرانی میں ایم اے کا ایک تحقیقی مقالہ "ڈاکٹر وحید قریشی بطور غالب شناس" ایک طالبہ سے لکھوایا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی یقیناً ان کے ممنون ہوں گے۔ معین

الرحمٰن نے اس احسان کو بڑھاتے ہوئے "تحقیق نامہ" کے شمارہ 5 میں اس مقالہ کا ایک حصہ شائع کیا ہے جو 5 صفحات اور 4 سطروں پر مشتمل ہے۔ مقالہ نگار محترمہ حنا انیس نے کئی صفحات پر انتظار حسین، ڈاکٹر خلیق انجم، رشید حسن خاں، ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمان، سید معین الرحمٰن اور غلام حسین ذوالفقار کی دو دو چار چار سطری آراء میں ڈاکٹر وحید قریشی کی بطور غالب شناس کی گئی تعریف نقل کی ہے۔

مقالہ نگار اس مضمون کے اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:

"۔۔۔ پچھلے پچیس برسوں میں ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب کے بارے میں گنتی کے چند مضامین یا تبصرہ کے علاوہ کچھ نہیں لکھا۔ پھر بھی غالب سے ان کا تعلق خاطر قابل لحاظ ہے۔ غالب پر جم کر وہ کچھ نہیں لکھ سکے لیکن غالب پر صحیفہ کے غالب نمبروں کی صورت میں انہوں نے بہت سا "ریڈنگ میٹریل" فراہم کرنے کی خدمت ضرور انجام دی۔"

یہ مقالہ نگار لکھتی ہیں:

"ڈاکٹر وحید قریشی ایسے بحر ذخار و زرخیز اور پچھلے پچیس تیس برس کا حاصل یہ "چند تحریریں"!۔۔۔ "سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم" والا مضمون اور کیا ہوگا!"

موصوف کو یا کنوینر بورڈ آف اسٹڈیز کو یہ سوال ڈاکٹر معین الرحمٰن سے پوچھنا چاہیے تھا کہ انہوں نے مقالے کے لیے یہ موضوع کیوں منظور کیا؟

اس کے بعد مقالہ نگار نے وحید قریشی کے مقام و مرتبہ کے باب میں دو مواقع پر معین الرحمٰن سے استفسار کیا۔ معین الرحمٰن کے جواب کے لیے درج ذیل سطور ملاحظہ فرمائیں:

"بطور غالب شناس' ڈاکٹر وحید قریشی کے مقام اور مرتبے کی اس بحث کو میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے کلمات پر ختم کرتی ہوں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی غالب شناسی کے بارے میں میرے ایک استفسار کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

"غالب سے ڈاکٹر وحید قریشی کی محبت' ایسی نہیں جسے کسی دلیل یا دستاویز کی ضرورت ہو۔ غالب شاعر دوزبان تھے۔ وحید قریشی اردو اور فارسی زبان و ادب کے منتہی ہیں۔ وہ فارسی میں پی ایچ ڈی اور اردو میں ڈی لٹ کی اعلیٰ ترین اسناد کے حامل ہیں۔ غالب کو سمجھنے کے لیے جیسی رچی تعلیم چاہیے' وحید قریشی اُس پر بہتوں کے مقابلے میں بہت بہتر طور پر پورا اترتے ہیں۔"

(گفتگو 22 جنوری 1996ء)

ایک دوسرے موقع پر غالب کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کے حوالے سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے کہا ہے کہ:

"غالب پر ہر لکھنے والے کو میں بہت عزیز جانتا ہوں لیکن اگر آپ 'تحقیق غالب' میں پاکستان کی

حد تک لکھنے والوں میں صرف "ایک" نام سننے پر اصرار کریں تو اس حوالے سے میں ڈاکٹر وحید قریشی کا نام بہت احترام سے لوں گا۔"

(نقوش غالب' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' الوقار پبلی کیشنز' لاہور' 1995ء' ص 358)

راقم کو اس مقام پر پہنچ کر اس تکلیف دہ حقیقت کا احساس ہوا کہ اردو ادب کا دامن بے لاگ' سچی اور دیانتدارانہ تنقیدی اور تحقیقی آراء سے خالی ہے یہاں ہر رائے مصلحت کی بھینٹ چڑھا دی جاتی ہے۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تحقیق کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی غیر مشروط توصیفی اور مبالغہ آمیز آراء کو پہلی بار توجہ سے دیکھا تو افسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ آراء محض ان کے زور بیان اور خطابت کا نتیجہ ہیں۔ ان آراء کو کسی حوالے سے بھی سوچی سمجھی آرا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی اور دوسرے بزرگوں کی Unqualified' محاکمہ' تجزیہ اور Evaluation کے بغیر محض مصلحت کوشی اور تعلق داری کی بنیاد پر قلم بند کی گئی Misleading آرا کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی' جناب معین الرحمٰن کی ایسی مبالغہ آمیز تعریف پر کیوں مجبور ہوئے' اسے عقل فہم سمجھنے سے قاصر ہے کیونکہ معین الرحمٰن انہیں حال اور مستقبل بعید میں کسی قسم کا فائدہ پہنچانے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اسکی ایک ہی صورت دکھائی دیتی ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے انہیں اپنی خوشامد کے ذریعہ شیشہ میں اتارا ہوگا۔

دنیائے ادب میں سینئر ادباء و شعراء ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتے آرہے ہیں۔ بزرگ اہل قلم نے مبتدی اور نو آموز مصنفین اور مولفین کی حوصلہ افزائی کے خیال سے ان کی تعریف و تحسین مختلف پیراؤں میں کی تھی۔ وہ وقت کے ساتھ ایک روایت کی حیثیت اختیار کر گئی مگر اس پاکیزہ روایت کا تقدس زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اس میں ایسا فساد اور بگاڑ پیدا ہوا کہ اس کی اصل اسپرٹ باقی نہ رہی۔ اس کے نتیجہ میں سچی' بے لاگ' بے لوث اور دیانتدارانہ رائے کے اظہار کا رواج ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ غیر ذمہ دارانہ' جھوٹی' سرسری اور رسمی آرا کو متعلقہ اشخاص پراپیگنڈے کی سطح پر استعمال کرتے ہیں۔

اس کارروائی میں ہمارے عہد کے نامور لوگوں کی مروت اور مہربانی کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ وہ اپنی ڈھلی ڈھلائی اور Unqualified رائے ایک فرمائشی خط پر بے دریغ ارسال کر دیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان زعما کو قطعاً احساس نہ ہونے پایا کہ ان کے اس مربیانہ طرز عمل سے بقول ڈاکٹر انور محمود خالد کتنے "تخریب کاروں" نے تدوین' تحقیق اور تنقید کی ریل پٹڑی اکھاڑ دی ہے۔ اس حادثہ نے ادب کے طالب علموں کے مطالعہ کا سفر کھوٹا کر دیا ہے۔ یہ بزرگ نہیں جانتے کہ ادب کے کتنے طالب علم اپنی منزل سے دور ہو گئے۔ اس سلسلے میں درج ذیل صورت حال کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

گزشتہ صفحات میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تحقیق غالب کو وسیع اور لائق تحسین قرار دیا ہے اور ان کے اسلوب کو "حق گوئی کا نرالا اسلوب" کہا ہے۔ ہمیں استاد گرامی کی اس نوعیت کی آرا

سے بصد احترام سخت اختلاف ہے۔ کبھی موقع ملا تو ہم اپنے تحفظات کا مفصل اور برملا اظہار کریں گے۔ کیونکہ ہمیں اردو میں بے لاگ رائے کے اظہار کا فقدان نظر آیا ہے۔

انہی صفحات میں ہم وہ اقتباس بھی دیکھ چکے ہیں جو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی نگرانی میں مکمل کیے گئے ایک تحقیقی مقالہ کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مشاورت اور نگرانی میں ''ڈاکٹر وحید قریشی بطور غالب شناس'' کے عنوان سے لکھے گئے تحقیقی مقالے میں ان کی شاگرد مقالہ نگار نے غالب پر ڈاکٹر وحید قریشی کے اپنے کام کو چند تحریروں پر مشتمل بتایا ہے جو امر واقعہ ہے مگر ایسی مثالوں کو شاگردوں کے نام سے منفی رنگ میں نمایاں کرنا یا شاگردوں کے امتحانی مقالوں میں ان کے نام پر اپنے دل کی بات کہلوانا ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ایک خاص طریق کار ہے۔ اسی مقالہ نگار کے ساتھ گفتگو میں نگران مقالہ نے (مقالہ نگار کی چند تحریروں کی نشاندہی کے باوجود) پاکستان کی حد تک ایک نام لینے کی شرط پر ڈاکٹر وحید قریشی کا نام لیا ہے

ہمارے ایک نامور محقق' مورخ اور نقاد دوست ڈاکٹر انور سدید نے اپنی خطیبانہ رائے کا اظہار کیا ہے' جسے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی کتاب ''غالب کا علمی سرمایہ'' ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تبصرہ نگار (نائلہ انجم) نے یہ کہہ کر کہ ''ڈاکٹر انور سدید نے بالکل درست کہا ہے۔'' ان کا وہ اقتباس نقل کیا ہے جو ہم پچھلے صفحات میں درج کر آئے ہیں:

''۔۔۔ ہندوستان میں غالبیات کے سلسلے میں جو مقام مالک رام۔۔۔ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ۔۔۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کو حاصل ہے۔'' [ڈاکٹر معین الرحمٰن۔ شخص اور عکس از نائیلہ انجم' الوقار لاہور' صفحہ 179

مندرجہ بالا سطور کے پیش نظر معلوم ہوا کہ ادبی تحریروں (کتب اور مضامین) اور ادیبوں کے بارے میں قلم بند ہونے والی مشہور و معروف اہل قلم کی آرا عموماً سوچی سمجھی (Considered) نہیں ہوتیں بلکہ ایک باہمی مصالحت (من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو) پر مبنی ہوتی ہیں۔ لہٰذا عام قارئین کے لیے گمراہ کن ثابت ہوتی ہیں کیونکہ وہ قریبی مطالعہ Close Study کا حاصل ہونے کی بجائے محض خطابت کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ بہر حال ان مبالغہ آمیز آرا سے جو صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے وہ سنجیدہ غور و خوض کے بعد سچ بولنے اور کھری رائے کے اظہار کی دعوت دیتی ہے۔

اردو میں دیباچہ نگاری' فلیپ نگاری اور تبصرہ نگاری مدلل مداحی کا مترادف کب اور کیوں بنی؟ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ اس کے منفی اثرات نے ادب کے عمومی معیار' اعتبار اور ساکھ کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اب اس کا احساس تو ہونے لگا ہے مگر اس کا باقاعدہ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ شروع نہیں ہو سکا۔ احباب پرستی اور دوست نوازی اپنی جگہ' معاشرتی حسن عمل کی اعلیٰ قدر سہی مگر ادب میں رو رعایت کا چلن کبھی نیک فال ثابت نہیں ہوا۔ دراصل اس رعایتی تنقید' رسمی تبصرہ اور سفارشی تعارف' تحسین اور تبصرہ کا

سرچشمہ وہ معاشرتی' اخلاقی اور سماجی رویہ ہے جس کی رو سے حوصلہ افزائی اور مربیانہ حمایت کو بزرگی اور سرپرستی کی علامت اور منصب خیال کیا جاتا ہے۔ استاذ گرامی سید وقار عظیم مرحوم نے شاید اس منصب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سید معین الرحمٰن کی دستگیری' سرپرستی اور مربیانہ حمایت کو اپنا وطیرہ بنایا۔ اس طرز عمل میں سرپرست کی نظر اپنے زیر سرپرستی فرد کی غیر مشروط تعریف اور اس کی ترقی و بہبود پر زیادہ رہتی ہے۔ معاشرتی اخلاقیات میں رو رعایت' نرمی اور سفارش کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر ادبی اخلاقیات میں کسی بھی طرح کی جانبداری' بے جا اور غیر مطلوبہ تعریف و تحسین کو جائز قرار نہیں دیا گیا۔ خواہ ایسی تعریف صادر کرنے والی شخصیت کیسی ہی محترم اور بلند مقام کیوں نہ رکھتی ہو۔

سید وقار عظیم مرحوم کا معین الرحمٰن کی کتاب ''مطالعہ یلدرم'' پر دیباچہ بہر حال ان کی نیک خواہشات کا آئینہ دار ہے مگر سراسر سفارش پر مبنی ہے لیکن انہوں نے اپنی تچی رائے کو ہمیشہ جانبداری پر قربان نہیں ہونے دیا۔ ایک موقع پر وقار عظیم مرحوم نے اپنے دھیمے لفظوں میں سید معین الرحمٰن کی ایک ایسی رائے کی تردید بھی کی جس پر آخر الذکر کو بے جا ناز رہا ہے (دیکھیے اگلے صفحات میں ''غالب اور انقلاب ستاون'' پر ٹی وی پروگرام کی رپورٹ میں وقار عظیم مرحوم کی اختلافی رائے کا حوالہ) ادبی معاملات کے علاوہ معین الرحمٰن کی ملازمتی اور عملی زندگی کی ساری تعمیر و تشکیل کا سید وقار عظیم کی مدد اور حمایت پر دارومدار ہے۔ اس احسان کی ممنونیت کے اظہار کے لیے معین الرحمٰن کی ہوشیاری اور چالاکی نے کیا کیا صورتیں اختیار کیں' چونکہ یہ ان کا نجی معاملہ ہے اس کی تفصیلات صرف وہ جانتے ہیں البتہ اس ضمن میں دو باتیں اب تک پبلک ہوئی ہیں: 1) سید وقار عظیم کی وفات کے بعد ان کے مسودات کی اشاعت۔ 2) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں سید وقار عظیم گولڈ میڈل کا اجراء۔

کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی ریٹائرمنٹ کے آخری دنوں میں اپنے شعبہ کی طرف سے ''وقار عظیم گولڈ میڈل'' کے اجراء کے لیے کالج انتظامیہ کو ایک چٹھی لکھی۔ غالباً ان کا خیال رہا ہوگا کہ ان کی تجویز ہی اس میڈل کے اجراء کے لیے کافی ہے مگر جب اس تجویز کی حامل چٹھی مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی متعلقہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی تو اس سلسلے کے رولز اور ریگولیشن سامنے آئے۔ غالباً اس اثناء میں ڈاکٹر معین الرحمٰن ریٹائر بھی ہو گئے۔ بہر حال کافی رد و کد کے بعد یہ طے پایا کہ اس میڈل کے اجراء میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے کے فنڈز فراہم کرنا لازمی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر معین الرحمٰن اس کیس کی پیروی کر رہے تھے وہی یہ فنڈز جمع کروانے کے مکلف ٹھہرتے تھے۔ چنانچہ خدا بہتر جانتا ہے انہوں نے کسی کے تعاون سے یا خود بخوشی یا بہ امر مجبوری وقار عظیم گولڈ میڈل کی مد میں مطلوبہ فنڈز جمع کروا دیے تاہم ان کے بعد کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ممنونیت کا یہ ایک نیک کام انہوں نے ذاتی سطح پر انجام دیا تھا۔

سید وقار عظیم مرحوم کے سید معین الرحمٰن پر اتنے اور ایسے احسانات ہیں کہ موصوف کی نسلیں بھی

اگر چاہیں تو ان کے کسی ایک احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتیں۔ وقار صاحب کا یہ عمل ان کی نیک نفسی' رحمدلی اور وفاداری بشرط استواری کی روشن مثال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی جزا دی ہوگی کہ یوں بھی یہ وقار صاحب اور سید معین الرحمٰن کا نجی معاملہ تھا مگر سید معین الرحمٰن ''جی سی یونیورسٹی لاہور کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ ''نقد'' فراہم کر کے ''سید وقار عظیم گولڈ میڈل'' کے اجراء کا اہتمام'' کرنے پر جو قلمی اور زبانی پراپیگنڈہ کر رہے ہیں اس کے پیچھے متعلقہ خاندان پر جو احسان جتانے کا جذبہ کارفرما ہے وہ بہت تکلیف دہ ہے۔ معین الرحمٰن نہیں جانتے کہ ہمارے ہاں معاشرتی اور اخلاقی سطح پر احسان جتانے کو قبیح اور مکروہ سمجھنے کی تہذیبی روایت موجود ہے۔ موصوف اس ایک ڈیڑھ لاکھ روپے کو نہیں بھول پا رہے جب کہ یہاں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو کروڑوں روپیہ عطیات میں دیتے ہیں اور اپنے نام کا ایک حرف نہیں لینے دیتے۔ راقم سمگلروں' جعل سازوں' بلیک مارکیٹروں کا ذکر نہیں کر رہا۔ اس کے علم میں متعدد ایسے لوگ ہیں جو سو فیصد حلال کمائی کے لاکھوں روپے سیکریسی کی شرط پر ہسپتالوں' یتیم خانوں' تعلیمی اداروں اور ضرورت مند طالب علموں کی نذر کرتے ہیں اور اپنی زندگی نہایت سادہ طریقے سے بسر کرتے ہیں۔

ایک اور زاویے سے اگر اس ڈیڑھ لاکھ روپے کا جائزہ لیا جائے تو وقار عظیم مرحوم کی اُن کتابوں پر کئی ڈیڑھ لاکھ روپے رائلٹی نکلے گی جو ڈاکٹر معین الرحمٰن نے یونیورسل بکس لاہور اور الوقار پبلی کیشنز لاہور سے چھپوائیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس رائلٹی کا کچھ فیصد حصہ وہ وقار عظیم خاندان کے کسی فرد کو ادا کر چکے ہوں۔ علاوہ ازیں پروفیسر معین الرحمٰن نے سید وقار عظیم کے صاحبزادوں سے جو جو مفادات اٹھائے ہیں وہ بہت سے اہلِ نظر و خبر اصحاب کے سامنے ہیں۔

دوسری طرف گورنمنٹ کالج لاہور اور جی سی یو کے اردو ریسرچ فنڈ سے چھپنے والی سید وقار عظیم کی متعدد تصانیف اور غالب پر شائع ہونے والی وہ کتابیں ہیں جو شعبہ اردو کے ریسرچ جرنل ''تحقیق نامہ'' کے اسٹاک میں مختلف شماروں کو جلد بنوا کر معین الرحمٰن کے ذاتی اشاعتی ادارے الوقار پبلی کیشنز ۵۰ لوئر مال لاہور سے فروخت کی گئی ہیں' جو شمارے سٹاک میں زیادہ تعداد میں نہیں تھے ان کو کتابی صورت میں شائع کرتے ہوئے گورنمنٹ کالج کے متذکرہ ریسرچ فنڈ سے کروائی گئی کمپوزنگ اور جڑی ہوئی کاپیاں استعمال میں آئی ہوں گی اور ان کی فروخت سے ہونے والا منافع الگ ہے۔ اگر ان متفرق اخراجات اور ان پر منافعوں کا میزان کیا جائے تو کئی لوگوں کے نزدیک ٹوٹل کئی ڈیڑھ لاکھ روپے بنے گا۔

جہاں تک پروفیسر وقار عظیم کی غیر مدون کتابوں کو مرتب کرنے اور ان کے حواشی قلم بند کرنے کا تعلق ہے' راقم کے پیشِ نظر پروفیسر وقار عظیم کی ''اقبالیات کا مطالعہ'' مرتبہ معین الرحمٰن اور اس کتاب کے مضامین پر معین الرحمٰن کے حواشی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان ضروری اور بیشتر غیر ضروری حواشی سے سید وقار عظیم کے مطالعہ اقبالیات کے زاویے زیادہ واضح اور نمایاں نہیں ہوئے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم ان چار پانچ شخصیات میں شامل ہیں جن کے ناموں کا صبح و شام ورد کر کر کے معین الرحمٰن تعلیمی، تحقیقی اور علمی دنیا میں معتبر بنے ہیں۔ علاوہ ازیں 1964ء میں کراچی یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر سیکنڈ ڈویژن میں ایم۔اے اردو کرنے کے بعد بے روزگار معین الرحمٰن کو وقار عظیم صاحب نے کامیاب زندگی کے جن پہلے تین زینوں پر چڑھا دیا وہ پروفیسر حمید احمد خاں کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا یعنی

1۔ 1965ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں چھ ماہ کے لیے بطور عارضی اردو لیکچرار تقرر۔

2۔ 1967ء میں ایف۔سی۔کالج میں بطور اردو لیکچرر تعیناتی

3۔ 1969ء میں پنجاب یونیورسٹی کی غالب صدی تقریبات کے لیے شائع ہونے والی مطبوعات کے پروگرام میں معین الرحمٰن کے نام "اشاریۂ غالب" مرتب کرنے کی الاٹمنٹ۔

ان حمید احمد خاں کے ساتھ موصوف نے احسان شناسی کا جو ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا، اسے ایک نظر دیکھتے ہیں:

پروفیسر حمید احمد خاں کی وفات پر "حمید احمد خاں یادگار کمیٹی" قائم کی گئی جس کے متفقہ طور پر سیکرٹری، مرحوم کے 1940ء سے دوست پروفیسر وقار عظیم مقرر ہوئے۔ خاں صاحب کی پہلی برسی فری میسن ہال میں منائی گئی۔ اس موقع پر اعلان کیا گیا کہ خاں صاحب کے مدون اور غیر مدون مسودے سید وقار عظیم کی نگرانی میں شائع کیے جائیں گے۔ 1976ء میں وقار عظیم کے انتقال کے بعد معین الرحمٰن صاحب حسبِ عادت وقار عظیم صاحب اور خاں صاحب کے کاغذات کے علاوہ بعض دوسرے مسودات سمیت گراں کی جلد اشاعت کا وعدہ کر کے لے گئے۔ وقار صاحب کے مسودات کئی کئی برس کے وقفہ سے شائع ہونے لگے مگر نیاز مندانِ حمید احمد خاں کو ان کے غالب پر مجوزہ مضامین کی اشاعت کا بے چینی سے 20 برس انتظار رہا۔ اس طویل دورانیے میں فطری طور پر اکثر لوگ فراموش کر بیٹھے کہ خاں صاحب بھی اہم غالب شناس تھے۔ کہا جاتا ہے کہ معین الرحمٰن نے یہ مسودہ ایسا دبایا کہ خاں صاحب کے صاحبزادے سعید احمد خاں کو اس کی بازیابی کے لیے مسلسل دس بارہ برس کاوش کرنا پڑی۔ آخر وہ 2003ء میں پروفیسر حمید احمد خاں کا وہ مسودہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جس کی معین الرحمٰن کے حواشی نے شکل مسخ کر رکھی تھی۔ سعید احمد خاں نے ایک خطیر رقم کے صرف سے مشہور سابق ناظم مجلسِ ترقی ادب لاہور کا یہ مجموعہ "مرقعِ غالب" کے نام سے مجلس ہی سے شائع کروایا اور 28 فروری 2003ء کو P.C. میں اس کی تقریبِ رونمائی مجلس یادگار حمید احمد خاں کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی جس کے سیکرٹری اب وقار عظیم کے بڑے صاحبزادے انور عظیم ہیں۔ عبرت ناک بات یہ ہے کہ معین الرحمٰن اس تقریب میں دور دور نظر نہ آئے۔ اس تقریب میں ایک باخبر معزز مقرر (ڈاکٹر تحسین فراقی) نے یہ انکشاف کیا کہ مخطوطہ "دیوانِ غالب" جو نسخۂ خواجہ کے نام سے معین الرحمٰن نے شائع کیا ہے وہ خاں صاحب کی میز سے کھسکایا گیا تھا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے مولانا حامد علی خاں کے خط نمبر 5 ''مع توضیحات مطبوعہ ''الحمرا'' نومبر 2003ء پر انور سدید کے معصوم اور بے ضرر جواب اور عرفان احمد خان کے ردِعمل کی ''مزید توضیحات'' کی ہیں مگر وہ یہ خط رقم کرنے کی چھپی ہوئی غلط تاریخ کی وضاحت نہ کر سکے۔ اس خط میں اوپر دائیں طرف مولانا نے اپنا ایڈریس لکھا (اگر لیٹر پیڈ مطبوعہ نہیں ہے۔) اس کے نیچے 16 نومبر 1975ء کی تاریخ درج ہے۔ ایک غیر محتاط محقق اس تاریخ اور خط کے نفسِ مضمون میں عدم مطابقت کی بنا پر اس خط کو جعلی قرار دے سکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ پروف ریڈنگ کی غلطی ہے کیوں کہ ''الحمرا'' نومبر 2003ء کے صفحہ 20 پر توضیحات میں تاریخ 16 نومبر 1985ء لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن اس خط کے دو پیراگراف ایک دوسری جگہ نقل کرتے ہوئے یہ تاریخ 16 نومبر 1985ء ہی لکھتے ہیں مگر وہاں ایک غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکت کرتے ہوئے اپنی طرف سے ایک فقرہ (بیشک کتنا ہی بے ضرر سہی) کا اضافہ کرتے ہیں۔ جو چودہ برس قبل مولانا کے متذکرہ خط کے پیرا اول کی پہلی تین سطروں کے بعد ان کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ہمیشہ سے عام لوگوں میں سید معین الرحمٰن کے خطوط کے Quoted اقتباسات کے بارے میں یہ شک پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے ان کی کتر بیونت یا ان میں اضافہ کرتے ہیں۔ متذکرہ تین سطور ''الحمرا'' نومبر 2003ء صفحہ 19 پر یوں درج ہیں:

''محبی ومکرمی! السلام علیکم۔ اخبارات میں یہ پڑھ کر بہت مسرت ہوئی کہ گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے اردو کی جماعتیں شروع ہو رہی ہیں اور آپ اس شعبے کے سربراہ مقرر ہوئے ہیں۔ یہ تو خیر ایک حقیقتِ متوقع ہی تھی مگر ہماری حکومتیں قومی زبان کو انگریزی کے مقابلے میں بہر حال پس پشت ڈالنے اور ڈالے رکھنے کا مستحکم ارادہ رکھتی ہیں۔۔۔''

اب دیکھیے ڈاکٹر معین الرحمٰن نے چودہ برس قبل یہ سطریں اس طرح درج کی ہیں:

''محبی ومکرمی ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب۔۔۔ اخبارات میں یہ پڑھ کر بہت مسرت ہوئی کہ گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے اردو کی جماعتیں شروع ہو رہی ہیں اور آپ اس شعبے کے سربراہ مقرر ہوئے ہیں یہ تو خیر ایک حقیقتِ متوقع ہی تھی (مگر میری دلی مبارکباد اور دعائیں آپ سب کے لیے)۔۔۔

مولانا حامد علی خاں

لاہور 16 نومبر 1985ء

(ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (مرتب) گورنمنٹ کالج لاہور' شعبہ اردو' کوائف اور کارکردگی' یونیورسل بکس 40 اے اردو بازار لاہور۔ اشاعت اول دسمبر 1989ء صفحہ 40

معین الرحمٰن صاحب کا اضافہ دیکھیے:

1۔ مجی ومکرمی کی جگہ ''مجی ومکرمی ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب''

2۔ (مگر میری دلی مبارکباد اور دعائیں آپ سب کے لیے)

تبصرہ: اندراج نمبر 2 میں مولانا حامد علی خاں جیسے زباندان سے 'مگر' کا منسوب استعمال قابل افسوس ہے۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اخبارات میں ایم۔اے کی کلاسز کے اجرا اور شعبہ کی سربراہی کی خبر موصوف کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے۔

معین الرحمٰن صاحب کی توضیحات (صفحہ 20) کے پیرا نمبر ۴ کا یہ بیان بھی ہرگز درست نہیں ہے کہ:

''میں 1981ء کے اوائل میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے جہاں ایم۔اے (اردو) کی کلاسز تھیں 'سات آٹھ برس کا تعلق منقطع کر کے' اس یقین دہانی پر لاہور آیا تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے (اردو) کی کلاسز کا آغاز کیا جا سکے۔۔۔۔''

راقم 1974ء میں سید معین الرحمٰن کے لائل پور پہنچنے کے وقت شعبہ میں آٹھ سال سے بطور عارضی لیکچرار کام کر رہا تھا اسی طرح موصوف کے 1981ء میں گورنمنٹ کالج لاہور آنے سے چھ سال پہلے ہی وہاں Regularize ہو کر کام کر رہا تھا۔ لیکن ان سے 1965ء سے بحوالہ سید وقار عظیم متعارف تھا۔ سو ان سے اعتماد اور مشاورت کے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ اس لیے اس دعویٰ کا استحقاق رکھتا ہے کہ معین الرحمٰن صاحب کا بیان درست نہیں۔ اس کے برعکس صحیح صورت حال یہ ہے کہ وہ فیصل آباد میں اپنے بعض شاف ممبرز اور طالب علموں کے ہاتھوں بہت تنگ تھے۔ انہوں نے سات برس قیام کے ایک ایک لمحہ میں لاہور تبادلے کی ناکام کوششیں کیں۔ مجھے یاد ہے انہوں نے رسالہ ''دھنک'' لاہور میں اپنے بہاول نگر کے شاگرد پرویز حمید (جو غالباً دھنک کے ملازم تھے) کے ساتھ ایک انٹرویو چھپوایا جس کے آخر میں انٹرویو کرنے والے نے Conclude کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کے صوبائی وزیر تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق سے اپیل کی تھی کہ غالب کا ایک ماہر فیصل آباد میں ضائع ہو رہا ہے۔ اس کا لاہور تبادلہ سود مند ثابت ہو گا۔ (اس وقت لاہور میں پنجاب یونیورسٹی سے باہر کسی کالج میں ایم۔اے اردو کی کلاسز نہ تھیں اور نہ ہی لاہور میں کوئی غالب اکیڈمی موجود تھی)

ڈاکٹر معین الرحمٰن کبھی گورنمنٹ کالج لاہور نہ آنے پاتے اور شاید فیصل آباد ہی میں ریٹائر ہوتے اگر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر میرزا ریاض صدر شعبہ کی جگہ جولائی 1979ء میں سینارٹی کی بنیاد پر خواجہ محمد سعید صدر شعبہ نہ بن جاتے۔ ایک دو برس بعد میرزا ریاض مرحوم نے 19 ویں گریڈ میں ترقی پائی تو انہوں نے اپنے کلاس فیلو جناب مسعود نبی نور چیف سیکرٹری پنجاب کی حمایت سے خواجہ محمد سعید کا گورنمنٹ کالج سرگودھا تبادلہ کروا دیا۔ خواجہ محمد سعید نے پرنسپل سے لکھوایا کہ چیف سیکرٹری کی کالج کے معاملات میں مداخلت مناسب نہیں۔ نتیجہ کے طور پر میرزا ریاض مرحوم' خواجہ محمد سعید کی ماتحتی میں صرف تدریسی فرائض انجام

دینے پر مجبور ہو گئے۔ خواجہ محمد سعید نے 25 فروری 1981ء کو ریٹائر ہوتے سے قبل پرنسپل کی مدد سے D.O لکھ کر (علاوہ دوسری کوششوں کے) ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اپنی جگہ تبادلہ کے احکام جاری کروا لیے اور میرزا ریاض کے دوبارہ صدر شعبہ بننے کا راستہ روک کر اپنا انتقام لے لیا۔ (دیکھیے معین الرحمٰن کے اصرار پر لکھی گئی خواجہ محمد سعید کی آپ بیتی ''گورنمنٹ کالج اور میں'' شائع کردہ الوقار پبلی کیشنز لاہور)

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے 25 فروری 1981ء کو شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور جوائن کیا۔ وہ خود سات ماہ بعد 22 ستمبر 1981ء کے محررہ خط میں Initiate کرتے ہوئے پرنسپل (ڈاکٹر عبدالمجید اعوان صاحب) کو لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کالج میں بارہ مضامین میں ایم۔اے/ایم۔ایس سی کی سطح پر تدریس کا کام ہو رہا ہے اور اسی سال ایم۔اے (فارسی) کی کلاسز کا اجراء ہوا ہے۔ لہٰذا ''مناسب ہوگا کہ ہم اپنے ہاں' اپنی قومی زبان اردو میں ایم۔اے کی سطح پر تدریس کا اہتمام کریں'' اسی خط میں انٹر میں اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائے جانے کے ساتھ انٹر میں اردو اعلیٰ اور بی۔اے میں اردو انتخابی اور اختیاری کے طور پر پڑھائے جانے کا ذکر ہے مگر یہ اطلاع Supress کی گئی ہے کہ اردو اعلیٰ میں عموماً پانچ سات اور بی۔اے انتخابی میں تین چار طالب علم ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال پنجاب میں لڑکوں کے اکثر کالجوں میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محکمہ تعلیم کے زیرِ انتظام کالجز میں ایم۔اے اردو میں 25 کی کلاس میں 'یک' دو یا تین طالب علم ہی آتے ہیں اور غالب اکثریت طالبات کی ہوتی ہے۔

اگر معین الرحمٰن صاحب کی نیک نیتی پر شک نہ بھی کیا جائے کہ وہ واقعتاً اردو کے فروغ اور اردو سے محبت کی بنا پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے اردو کی کلاسز کا اجرا چاہتے تھے پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ لائل پور (فیصل آباد) میں تلخی' Teasing' مخالفت' بیوی' بچوں اور لاہور کے ناشرین سے دوری' رہائش کے لیے دو تین سال کی دربدری وغیرہ (غالباً آخری چار سال بیگم صاحبہ کے تبادلہ کے بعد وہ باقاعدہ مکان کرائے پر لے کر رہے) کے باوجود گورنمنٹ کالج لائل پور اور اس کے اردو ڈیپارٹمنٹ میں انہوں نے خوشگوار وقت گزارا۔ سٹاف کے اکثر سینیئر لوگ بھی ان سے جونیئر ہو گئے۔ طالبات سے تفاعل Interaction' ان کے والدین اور بھائیوں سے رابطے' کسی کی سالگرہ' کسی کی منگنی پر کیک اور مٹھائی' کبھی پر پولیس کو استقبالیہ تو فائنل کو الوداعیہ (Fare.well) کی پارٹیاں' کسی کو یہ کتاب اور کسی سے اُس کتاب کا وعدہ' مقالہ نگار طالبات کی ناتجربہ کاری پر ان کی پریشانی بھانپ کر ان کو دلاسوں کے مختلف انداز' ہر سال مقالہ نگاروں کی معیت میں Viva کے لیے لاہور جانا۔ اُن کو قبل از نتیجہ نمبر بتاتے ہوئے یہ باور کرانا کہ خارجی ممتحن یا کنوینز بہت تھوڑے نمبر دے رہے تھے' اُن سے لڑ جھگڑ کر مشکل سے اتنے نمبر کروائے ہیں۔ اسی طرح ہیڈ شپ کی رو سے (By virtue of) انٹرمیڈیٹ بورڈ سرگودھا میں اردو کی کنوینرزی' یونیورسٹی میں بورڈ آف سٹڈیز کی ممبری' کنوینر بورڈ آف سٹڈیز کی حمایت کر کے ان کی خوشنودی کا حصول' بی۔اے کے پرچہ کی

ہیڈ شپ' پنجاب اور دوسری یونیورسٹیوں میں ایم۔اے اردو کے پرچوں میں بطور داخلی یا خارجی ممتحن نامزدگی' مقالات کےVivas کے لیے جہازوں کا سفرٹی اے ڈی اے اس پر مستزاد جب چاہا کلاس لی جب جی نہ چاہا تو کہلوا دیا کہ آج یہ میٹنگ ہے کل وہ میٹنگ ہوگی۔نہ پرنسپل پوچھے نہ طالبات ناراض کرنے کی جرأت کریں۔لاہور میں علمی اور ثقافتی اداروں کے بورڈ آف گورنرز کی ممبر شپ کی یقینی توقعات' لہٰذا وہ گہما گہمی اور Importance کی زندگی گزارنے کے لیے ایم۔اے اردو کی کلاسز کے اجرا کی کوشش کیوں نہ کرتے۔معین صاحب! ٹھیک ہے اگر اجرا نہ ہوتا تو خیال کیجیے طالب علموں نے جو پچاس ساٹھ امتحانی مقالے لکھے ہیں ان کے ٹائٹل پر اندر اور باہر جلی حروف میں بطور نگران آپ کا نام بھی نہ ہوتا۔ان کے شروع میں حرفے چند لکھ کر ان کے نیچے دستخط ثبت کر کے بار بار جو آپ نے خوشی حاصل کی وہ کہاں سے ملتی۔طلباء و طالبات نے نمبر حاصل کرنے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر آپ کی جو خوشامد میں لتھڑی ہوئی مبالغہ آمیز تعریفیں لکھی ہیں وہ آپ کہاں سے لکھواتے۔[یہ بھی کہا جاتا ہے وہ طالبات کی طرف سے اپنے لیے تشکر کے الفاظ خود لکھا کرتے تھے] ایک اخبار نویس نے اپنی خدمات جتلاتے ہوئے کہیں یہ لکھا ہے کہ میں نے اپنے اخبار میں3000 شذرے تحریر کیے۔ان سے کوئی پوچھے کہ بھائی بھلا کوئی دوسرا کیوں کرتا؟ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کوئی مزدور یہ جتلائے کہ میں نے اب تک 5 لاکھ اینٹیں ڈھوئی ہیں۔کوئی اُسے بتائے' بھئی نہ ڈھو کر دیکھ لیتے۔یہ بات البتہ ضرور قابلِ تعریف اور قابلِ داد ہے کہ کوئی شخص اپنی جگہ اپنا کام دیانتداری' تندہی' ذمہ داری' سچے دل اور محنت سے کرتا ہے۔بہت Simple اور سادہ بات ہے اگر مشین میں کوئی چھوٹا یا بڑا پرزہ کام نہیں کرتا تو اسے نکال کر Scrap میں پھینک دیا جاتا ہے۔(یہ جملہ ہائے معترضہ برطرف!)

اب پھر مولانا حامد علی خاں کے خط نمبر 5 پر ڈاکٹر معین الرحمٰن کی توضیحات کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر وحید قریشی نے جب تک وہ یونیورسٹی اور اورینٹل کالج لاہور میں شعبہ اردو کے سربراہ رہے' 'جی سی' کی درخواست اور کوشش کو لیت و لعل اور حیلوں بہانوں سے ٹالے رکھا۔سال 1965ء۔66 کے سیشن میں بھی گورنمنٹ کالج لاہور کی اسی نوعیت کی ایک تجویز اور تحریک کو وہ حتمی طور پر رد[1] کر چکے تھے۔'' (کیا درخواستوں' تجویزوں اور تحریکوں کے کوئی خاص سیشن ہوتے ہیں؟)

مندرجہ بالا پیرا میں ''۔۔۔رد کر چکے تھے'' پر فٹ نوٹ کا نشان لگا کر نیچے حاشیہ میں یوں وضاحت کرتے ہیں:

[1] اس ضمن میں دیکھیے مراسلہ رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی لاہور نمبر 2346۔پی مورخہ 20 اگست 1965ء بنام پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور' جس میں کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر وحید قریشی کو انسپکشن پر مامور کیا تھا۔انہوں نے اس بارے میں جو تحریری رپورٹ پیش کی ہے۔اس کی روشنی میں گورنمنٹ کالج میں

ایم۔اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء/ الحاق کی اجازت/ سفارش نہیں کی جاسکتی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ تحریری رپورٹ چھپ چکی ہے اور جی سی شعبہ اردو کی تاریخ کا حصہ ہے۔ دیکھیے: ''گورنمنٹ کالج لاہور' شعبہ اردو کوائف اور کارکردگی'' مطبوعہ یونیورسل بکس لاہور 1989ء ص31۔ 27 [منقول از الحمراء لاہور' نومبر 2003ء صفحہ 20]

پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے یہاں پورا پس منظر یا صحیح تناظر پیش نہیں کیا۔ اگر وہ ابلاغ کی اہمیت سمجھتے ہیں اور ان کے دل میں مغالطہ انگیزی کا خیال نہیں ہے اور وہ وحید قریشی کے خلاف دل میں کدورت نہیں رکھتے اور وہ انسپکشن رپورٹ کے فنی تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور اگر انہیں رپورٹ کے لیے معروضیت کی اہمیت کا احساس ہے' اگر وہ رپورٹ کنندہ کے لیے لازم سمجھتے ہیں کہ اسے درخواست گزار کی حسب منشاء رپورٹ پیش کرنی چاہیے تو انہیں ڈاکٹر وحید قریشی کو ملزم نہیں بلکہ مجرم کے طور پر پیش کرنا چاہیے جیسا کہ معین الرحمٰن اینڈ کو ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف اپنے پروپیگنڈا میں کوشش کر رہے ہیں۔

کیا گورنمنٹ کالج کے افسران کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی کی رپورٹ پر صاد کرتے ہوئے رجسٹرار کی الحاق سے معذرت کو قبولیت بخشنا لازم ولابد تھا؟ رجسٹرار کی اس معذرت پر پروٹسٹ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی کی پیش کردہ رپورٹ کی خامیوں' کوتاہیوں اور غلط بیانی کو طشت از بام کیوں نہیں کیا گیا۔ اس رپورٹ کو ٹھنڈے پیٹوں خاموشی سے قبول کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی رپورٹ کی ہر تفصیل درست تھی۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مندرجہ بالا اقتباس سے ایک عام قاری یہ سمجھتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی سے کسی مضمون کی تدریس کا الحاق یونیورسٹی کے اُس مضمون کا صدر شعبہ کرتا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر وحید قریشی 1965ء۔66 سے Undefined مدت تک یا 1985ء تک صدر شعبہ رہے لہٰذا انہوں نے الحاق نہ ہونے دیا۔ معین الرحمٰن صاحب کے کتابچہ ''کوائف اور کارکردگی'' کا دقت نظر سے مطالعہ کر لیا جائے (اخبار یا رسالے کا عام قاری کہاں پڑھتا ہے) تو پتہ چلتا ہے کہ ایسی ساری باتیں/ تاثر غلط ہیں۔ کیونکہ معائنہ کمیٹی/ فرد کی نامزدگی یونیورسٹی (یعنی رجسٹرار) کرتی ہے۔ یہ متعلقہ صدر شعبہ کا اختیار یا کام نہیں ہے۔ یوں بھی ڈاکٹر وحید قریشی صدر شعبہ نہیں تھے' شعبہ اردو میں لیکچرار تھے (اس عرصہ میں معین الرحمٰن صاحب چھ ماہ کے لیے ان کے ہم رتبہ مگر عارضی رفیق کار تھے) ڈاکٹر سید عبداللہ اپریل 1965ء میں ریٹائر ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ''یونیورسٹی مکتوب 1884/ پی مورخہ 28 جون 1965ء'' (کوائف اور کارکردگی ص28) کے حوالہ سے معائنہ رپورٹ لکھی (بحوالہ مندرجہ بالا صفحہ 28) یاد رہے اس وقت خواجہ محمد سعید صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور تھے۔ وقار عظیم مرحوم صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اور پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر تھے۔ خواجہ محمد سعید' مرحوم وقار عظیم کے 'مرید خاص'۔ جن پر وقار صاحب بطور خاص ملتفت تھے (دیکھیے معین الرحمٰن کے

مسلسل اصرار پر لکھی گئی خواجہ محمد سعید صاحب کی واحد کتاب ''گورنمنٹ کالج اور میں'') حمید احمد خاں صاحب پروفیسر وقار عظیم کے خاص مربی تھے۔ وقار صاحب کی Recommendation پر یونیورسٹی میں لیکچرار کے لیے فرسٹ ڈویژن کی شرط Relax کر کے معین الرحمٰن سیکنڈ ڈویژن کو چھ ماہ کے لیے رکھا گیا تھا۔ حمید احمد خاں صاحب فائنل اتھارٹی تھے۔ وہ الحاق کی متذکرہ رپورٹ کو منسوخ کرتے ہوئے اجازت مرحمت فرما سکتے تھے یا نئی معائنہ ٹیم نامزد کر سکتے تھے۔ خواجہ محمد سعید نے ان رابطوں سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا؟

ڈاکٹر معین الرحمٰن کتابچہ (کوائف اور کارکردگی) کے ''حرفے چند'' (دیباچہ) میں لکھتے ہیں:

''شعبہ اردو میں ایم۔اے کی کلاسز کا آغاز قیام پاکستان کے فوراً بعد پطرس بخاری کے ہاتھوں ہو گیا تھا لیکن بعض وجوہ سے اُس وقت اُن کلاسز کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے منظور نہیں ہوا۔۔۔ 1985ء میں بالآخر پطرس بخاری کا یہ خواب پورا ہوا۔۔۔'' صفحہ (10)

مولف کتابچہ ہذا ''حرفے چند'' کے مندرجہ بالا دو پیراگراف اپنے شوق فضول کی تسکین کے لیے کتابچہ کے صفحہ 20 پر دوبارہ دہراتے ہیں اور نیچے مسلسل عبارت سے الگ مگر نمایاں کر کے پھر اپنا نام لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن گورنمنٹ کالج کے مظلوم شعبہ اردو پر ظلم کی داستان بیان کرتے ہوئے یونیورسٹی کا پہلا ظلم 1949ء کا واقعہ بتاتے ہیں:

''1948ء میں 'جی سی' میں ایم۔اے (اردو) کی بسم اللہ ضرور ہوئی لیکن اس کے باوجود کہ پطرس بخاری جی سی میں شعبہ اردو کے صدر تھے۔۔۔ یونیورسٹی سے ایم۔اے کی جماعت کے الحاق کی منظوری حاصل نہ کی جا سکی اور جی سی میں یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر ایم۔اے کی سطح پر تدریس کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا اُسے اگلے برس 1949ء ہی میں ختم کر دینا پڑا۔۔۔'' ('گورنمنٹ کالج شعبہ اردو' کوائف اور کارکردگی' یونیورسل بکس لاہور' دسمبر 1989ء' صفحہ 25)

اب اسی صفحہ پر پطرس بخاری کی تدریسی ٹیم کے ایک اہم رکن ڈاکٹر آفتاب احمد کا اس معاملہ میں انداز فکر اور طرز احساس ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب جس شعبہ کا صدر پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس ہو' یونیورسٹی کی کیا مجال کہ اسے تسلیم نہ کرے۔۔۔'' کئی دوسرے بیانات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ خود پطرس بخاری کی بھی یہی سوچ اور طرز احساس تھا۔ پطرس بخاری بہت بڑے آدمی تھے۔ حد خیال کے آخر تک بڑے مگر ان کے غیر مناسب رویے اور غلط اقدام کو Condone نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا حامد علی خاں کے خط نمبر 5 پر پروفیسر معین الرحمٰن کی توضیحات کا اگلا پیرا ملاحظہ فرمائیے:

''اب اس توے اور تصویر (کیا کراہت انگیز اور جمال سوز پہلو نکالا اور تحریر کو اپنے تئیں موثر

بنانے کے لیے ایسے ان مل بے جوڑ محاورات کا استعمال بھی قابل داد ہے) کا دوسرا رخ: شعبہ اردو' گورنمنٹ کالج لاہور میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز شروع ہونے پر ڈاکٹر وحید قریشی نے پہلی فرصت میں مجھے ''اعتماد اور راز'' میں لے کر اپنی مجبوری اور معذوری یا کمزوری کا پس پردہ قصہ سنا کر اعتراف کیا کہ یہ ''دراصل'' خواجہ زکریا تھے جو کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ 'جی سی' میں ایم۔اے (اردو) کی کلاسز ہوں۔ 1965ء۔66 میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے کہنے پر اور پھر مابعد اپنے زمانہ صدارت اور اختیار میں' میں خواجہ زکریا کے دباؤ کے تحت 'جی سی' میں ایم۔اے (اردو) کی کلاسز کے اجرا کی درخواست سے اتفاق نہیں کر سکا۔ میں لاہور میں رہتے ہوئے خواجہ زکریا کی مخالفت کو Afford نہیں کر سکتا تھا'' (ماہنامہ الحمرا لاہور' نومبر 2003ء' صفحہ 21)

ڈاکٹر معین الرحمٰن کو کون بتائے کہ پلاٹ اور حقیقی واقعات میں کیا فرق ہوتا ہے؟ کیسا کیسا بڑا سازشی پلاٹ تیار کرتا ہے مگر کوئی نہ کوئی کھانچا رہ جاتا ہے۔ آپ تو ایسی بھولی بھالی صورت والے ہیں کہ پروفیسر شریف اشرف نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو

انہیں غزل کہنے کی تحریک ہوئی!۔

دیکھیے ''نذر معین'' مرتب: محمد سعید' الوقار لاہور 2003ء

پروفیسر شریف اشرف کا یہ پورا پیرا دیکھیے؛ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور مرتب ''نذر معین'' محمد سعید کی نکتہ رسی کی داد دیجیے۔ شریف اشرف 'معین الرحمٰن پر اپنے شخصی مضمون کا پہلا پیرا یوں لکھتے ہیں:

''بالوں کا قدرتی حسن اور اس کے ساتھ ہی ان کی ترتیب و آرائش کا قرینہ' کھلتی ہوئی تابناک پیشانی' چمکتی ہوئی نجیب آنکھوں میں شعور حسن اور حسن شعور سے تشکیل پانے والی ہلکی مسکراہٹ کی لکیر' غزل کی تحریک دیتے ہوئے عارض ولب' چھریرا بدن' قامت جیسے قافلہ وفا کا۔۔۔ اس معروض کو روبرو پا کر ہم کہنے ہی والے تھے' وہ تمام روئے نگار ہے۔۔۔ کہ ہمارے دوست اے بی اشرف نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے فوراً تعارف کروا ڈالا'' آپ ہیں سید معین الرحمٰن صاحب۔ آپ نے آج ہی لیکچرار اردو کی حیثیت میں یہاں جائن (Join) کیا ہے'' ہم نے اولین ملاقات کے تمام تکلفات کو ایک طرف رکھتے ہوئے فارسی ادب کے اچھے طالب علم کی طرح ان سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔''

ڈاکٹر صاحب اور مرتب ''نذر معین'' نے پروفیسر شریف اشرف کے اقتباس کے آخری فقرہ کو شاید سمجھا نہیں۔ راقم کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایسے جلیل القدر پروفیسروں کو کن الفاظ میں سمجھائے۔ اس فقرہ کی تفہیم کے لیے ہم اردو کے صاحب اسلوب ادیب مہدی افادی کے مشہور مضمون ''آدھ گھنٹہ پروفیسر شبلی کے ساتھ'' کے درج ذیل دو جملے یہاں نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ایک خاص امر جس کی طرف ناظرین کو اس وقت متوجہ کرنا منظور ہے یہ ہے کہ

''عربی کا یہ فاضل پروفیسر نہایت سخت عجمی ہے'' توبہ! کیا کہہ گیا'' افادات مہدی صفحہ 97

اسی لیے اس طرف خیال کم جاتا ہے کہ آپ Concoction بھی کرتے ہوں گے۔ معین الرحمٰن کے اوپر والے اقتباس کے حوالے سے ان سے پوچھیے:

1۔ صاحب آپ نے جنوری 1974ء میں لائل پور میں شعبہ اردو جوائن کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی 20 اپریل 1975ء تک پنجاب یونیورسٹی شعبہ اردو کے بورڈ آف اسٹڈیز کے کنوینر تھے آپ EXOFFICIO اس بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر تھے۔ آپ نے ڈاکٹر وحید قریشی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا کیا حیلے استعمال کیے؟ کن کن لوگوں کو بیچ میں ڈالا؟ ان کے بعد باری باری سوا پانچ سال ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور ڈاکٹر عبادت بریلوی صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی رہے۔ ان دونوں کا آپ کے ہاں کوئی ذکر نہیں۔ کیا ڈاکٹر وحید قریشی سے زیادہ سہولتیں میسر آئیں؟ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب سے تو آپ ان کی وفات بلکہ بعد تک ناراض رہے اور ان کے خلاف جو بول سکتے تھے بولتے رہے البتہ اپنی خوشامدانہ فطرت کے مطابق شاید بوساطت ڈاکٹر عبیداللہ خان ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہیں کتابیں پیش کر کے اور ان کی آراء حاصل کر کے اپنی کتابوں کی توقیر بڑھانے کے لیے انہیں اپنی کتابوں میں چھاپا۔ آپ نے 25 فروری 1981ء کو شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور میں جوائننگ رپورٹ دی تو پھر آپ کو ڈاکٹر وحید قریشی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ دوسری بار یکم مارچ 1979ء تا 5 اپریل 1983ء شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کے صدر رہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنی آمد کے سات ماہ بعد 22 ستمبر 1981ء کو اپنے پرنسپل کو ایم اے اردو کی کلاسز کے اجرا کی تجویز یادداشت Proposed DFA پیش کیا۔ اس کے بعد محولہ بالا کتابچہ صفحہ 33 پر جلی حروف میں دو سطروں سے معلوم ہوتا ہے۔ پرنسپل صاحب نے ڈائریکٹر اور ڈی پی ای وغیرہ کو لکھا ہوگا۔ جنہوں نے حکومت پنجاب سے اجازت چاہی۔ کتابچہ میں اس سلسلے کے متعلقہ Documents موجود نہیں ہیں تاہم سیکرٹری تعلیم کو ایڈریس کیا گیا مکتوب' کسی مالی مطالبہ کے بغیر: اردو میں بخط معین الرحمٰن (شاید گورنمنٹ کالج میں انگریزی ٹائپ مشین نہ تھی۔ اگر تھی تو معین الرحمٰن نے ڈرافٹ رومن میں منتقل نہ کیا تھا) پرنسپل کے دستخطوں کے ساتھ بمطابق نمبر 2019 / پی آر مورخہ 15 اکتوبر 1981ء بھیجا گیا۔ 9 فروری 1982ء کو سیکشن آفیسر محکمہ تعلیم حکومت پنجاب نے پرنسپل کو لکھا (دستخط انڈر سیکرٹری کالجز) کہ اخراجات کے بغیر اگلے سیشن سے اجازت دی جاتی ہے' کوئی اضافی اسٹاف نہیں ملے گا۔ ہدایت کی جاتی ہے معاملہ الحاق کے لیے مقررہ قواعد کے مطابق پنجاب یونیورسٹی کے پاس لے جایا جائے۔ انڈر سیکرٹری کے اس انگریزی خط کے نیچے نسبتاً جلی حروف میں انڈر لائن کرتے ہوئے مندرجہ ذیل پانچ سطریں ہیں:

''محکمہ تعلیم' حکومت پنجاب سے ہمیں 1982ء کے اوائل میں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز کی اجازت ملی لیکن پنجاب یونیورسٹی سے اس کے الحاق میں بوجوہ کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور

یونیورسٹی سے منظوری حاصل کرنے میں کئی برس مزید لگ گئے لیکن یہ وقت بھی بہر حال گزر گیا اور کوئی تین چار برس کی مسلسل پیروی' مساعی اور سفارت کاری کے نتیجہ میں بالآخر 1985ء۔86 کے تعلیمی سیشن سے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اس کا باقاعدہ الحاق ممکن ہوا''

ان سطور کے بعد پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انگریزی میں اجازت نامہ کا عکس ہے۔اس اجازت نامہ پر I.H. Zaidi ڈپٹی رجسٹرار (ایڈمن I) نے دستخط کیے ہیں۔اس کا پہلا پیرا ریفرنس نمبر وغیرہ پرمبنی ہے۔اگلا پیرا اصل مضمون پر مشتمل ہے' دیکھیے:

In excercise of the powers vested in him under Section 15(3) of the University of the Punjab Act 1973,the VicChancellor has been pleased to grant extension of affiliation to your college in anticipation of the approval of the Syndicate, to teach the subject of Urdu upto M.A. level,with effect from the academic session1985-86,subjectto the condition that keeping in view of the existing workload the number of teachers in urdu be increased.

کتابچہ کا یہ باب بعنوان ''جی سی میں ایم۔اے اردو کی تدریس: خیال سے عمل تک'' پروفیسر خواجہ منظور حسین کے خط کی مندرجہ ذیل سطور پر ختم ہوتا ہے:

''۔۔۔شکر ہے کہ آپ کی کاوش سے کالج کو وہ حق مل گیا' جس کا وہ ایک عرصے سے حقدار تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پروفیسر پطرس بخاری کے زمانے میں یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر' اس تدریس کی بسم اللہ ہوئی تھی جس میں میں بھی شریک تھا۔۔۔'' (13 اگست 1985ء)

سوال یہ ہے کہ بغیر اجازت کے تدریس کا آغاز کر کے اس پر اصرار کیوں کیا گیا۔قدرتی اور اصولی طور پر کمپیٹنٹ اتھارٹی نے متوقع منظوری نہ دی۔یوں بھی یہ دو آدمیوں پطرس بخاری اور ڈاکٹر عمر حیات کی معاصرانہ چپقلش تھی۔اتفاق سے وائس چانسلر کے ہاتھ میں قانونی' اخلاقی اور ضابطہ کی طاقت بھی تھی۔ پطرس بخاری اپنی ساری شخصی وجاہت' سماجی حیثیت' سیاسی اثر ورسوخ اور طاقت ور بیوروکریسی کی حمایت کے باوجود جیت نہ سکتے تھے۔ان کے یو۔این۔او میں جانے کے بعد اگلے صدر شعبہ ڈاکٹر محمد صادق نے افہام و تفہیم کے بعد یونیورسٹی کا موقف تسلیم کر لیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے 1965ء میں ضابطہ کے مطابق معائنہ رپورٹ قلمبند کی۔اس رپورٹ کی آخری سطور ملاحظہ فرمایئے:

''ان کوائف کی روشنی میں میرے لیے ایم۔اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء کی سفارش مشکل ہے۔مجھے معلوم نہیں کہ صوبے کے دوسرے کالجوں کو کن حالات میں ایم۔اے (اردو) کی تدریس کی اجازت دی گئی ہے۔آیا ان کے سلسلے میں قواعد کے استعمال میں کوئی نرمی برتی گئی ہے یا وہ ان شرائط کو بھی پورا

کرتے تھے۔

بہر حال گورنمنٹ کالج لاہور کے موجودہ نظام کو ناکافی خیال کرتے ہوئے میں اردو کلاسوں کے اجراء کی تجویز سے اتفاق نہیں کرتا۔

دستخط ڈاکٹر وحید قریشی

28 جولائی 1965ء

ان سطور سے دو باتیں متبادر ہوتی ہیں کہ مبینہ طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ کے منظوری رد کرنے کی Prompting نظر نہیں آتی (یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ سید صاحب اپریل 1965ء میں ریٹائر ہو چکے تھے) اگر ایسا ہوتا تو وحید قریشی آخری سے پہلے پیرا "ان کوائف کی روشنی میں ۔۔۔ کو بھی پورا کرتے تھے" کبھی نہ لکھتے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان چند ممتاز اولڈ راوینز میں ہوں گے جو سات برس (سال اول تا ڈبل ایم اے) گورنمنٹ کالج کے ROLLS پر رہے۔ راقم سمجھتا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے سینیئر راوین ہونے کے ناطے صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور خواجہ محمد سعید/ متعلقہ کالج اتھارٹی کو اپنی رپورٹ کے آخر میں Clue دیا کہ وہ یونیورسٹی سے استفسار کریں کہ صوبے کے دوسرے کالجوں کو کن حالات میں ایم۔ اے (اردو) کی تدریس کی اجازت دی گئی ہے۔ محولہ بالا کتابچہ کے متذکرہ باب سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کو کلاسوں کے اجراء سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ اگر یہ کلاسیں شروع ہو جاتیں تو Incumbent صدر شعبہ کو صدارت سے الگ ہونا پڑتا۔ اس لیے انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کے فراہم کردہ Clue یا Hint سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

ڈپٹی رجسٹرار کے مندرجہ بالا انگریزی اقتباس میں اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کی عائد کردہ شرط سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ 20 / 22 برس قبل ڈاکٹر وحید قریشی کی رپورٹ غیر متعصبانہ مناسب اور درست تھی۔

اب آیئے معین الرحمن صاحب کی متذکرہ توضیحات کے اس مضحکہ خیز بیان کی طرف' جو ڈاکٹر وحید قریشی سے منسوب کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے گورنمنٹ کالج لاہور میں پوسٹ گریجویٹ (اردو) کلاسز شروع ہونے پر پہلی فرصت میں انہیں "اعتماد اور راز" میں لے کر اپنی برأت ظاہر کی اور اعتراف کیا [یاد رہے عموماً ملزم Torture کے بعد اعتراف کیا کرتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر وحید قریشی پر کوئی Torture نہیں ہوا تو معین الرحمن بتائیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی موصوف کو "اعتماد اور راز" میں لینے کے لیے کس وجہ سے یا کس کمزوری کی بناء پر مجبور ہوئے۔ معروضی حالات کے مطابق ڈاکٹر وحید قریشی کی یونیورسٹی میں پوزیشن زیادہ بہتر اور مضبوط ہو چکی تھی؛ اس سلسلے کی دلچسپ بات یہ کہ اپریل 1983ء میں ڈاکٹر وحید قریشی قومی سطح کے ادارہ "مقتدرہ قومی زبان" کے صدر نشین ہو چکے تھے اور 4 نومبر 1987ء تک اسی حیثیت میں کام کرتے

رہے۔ معین الرحمٰن نے 14 دسمبر 1989ء کو (دیباچہ (حرفے چند)۔ کوائف اور کارکردگی) میں لکھا ہے:

''یونیورسٹی سے باقاعدہ الحاق کے بعد ایم اے کا پہلا داخلہ ستمبر 1985ء میں ہوا'' گورنمنٹ کالج لاہور میں کلاسز شروع ہونے پر متذکرہ اعتراف کی ڈاکٹر وحید قریشی کو کیا ضرورت تھی۔ 1985ء میں الحاق کی رپورٹ OK کرنے والے خواجہ محمد زکریا کے بارے میں کسی نے معین الرحمٰن کو اعتماد میں لے کر یہ نہیں بتایا کہ جس خواجہ زکریا نے ڈاکٹر وحید قریشی کو گورنمنٹ کالج کی کلاسز کے اجراء کی درخواست سے اتفاق نہ کرنے دیا۔ معین الرحمٰن نے اُس خواجہ زکریا کو کس دھونس اور دباؤ سے رپورٹ پر انگوٹھا لگانے پر مجبور کیا۔ اگر وہ یہ بتا دیتے تو کہانی دلچسپ بن جاتی اور مکمل بھی ہو جاتی۔] کہ یہ:

''دراصل'' خواجہ زکریا تھے جو کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ 'جی سی' میں ایم۔اے اردو کی کلاسز ہوں۔۔۔ اپنے زمانہ صدارت اور اختیار میں (یکم مارچ 1979ء تا 15 اپریل 1983ء) میں خواجہ زکریا کے دباؤ کے تحت 'جی سی' میں ایم۔اے اردو کی کلاسز کے اجراء کی درخواست سے اتفاق نہیں کر سکا۔ میں لاہور میں رہتے ہوئے خواجہ زکریا کی مخالفت کو afford نہیں کر سکتا تھا۔''

چلیے یہ تو راز میں بتائی ہوئی بات ہوئی لیکن معین الرحمٰن صاحب نے کتابچہ میں محکمہ تعلیم کی ہدایت کے مطابق الحاق کے لیے گورنمنٹ کالج کی یونیورسٹی کی طرف کوئی پیش قدمی نہ دکھائی اور نہ بتائی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ 15 اپریل 1983ء (ڈاکٹر وحید قریشی کے بحیثیت چیئرمین مقتدرہ کراچی جانے) تک یونیورسٹی نے کسی کو معائنے کے لیے نامزد نہیں کیا۔ دریں حالت ڈاکٹر وحید قریشی سے منسوب بات''۔۔۔ اجراء کی درخواست سے اتفاق نہیں کر سکا۔۔۔'' درست نہیں۔ اسی طرح خواجہ زکریا کا ڈاکٹر وحید قریشی پر اس نوعیت کا دباؤ بھی بے معنی بات ہے۔ خواجہ محمد زکریا ایم۔اے میں ڈاکٹر وحید قریشی کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ بالخصوص خواجہ صاحب نے ایم۔اے کا امتحانی تحقیقی مقالہ انہی کی نگرانی میں لکھا۔ وہ تربیتِ تحقیق میں ان کے فیضان کا آج تک ذکر کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے 1964ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کی لیکچرر شپ منقطع کر کے اورینٹل کالج میں اردو لیکچرار کی حیثیت اختیار کی جہاں انہیں اپنے استاد کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ جو شعبہ تدریس میں اُن سے تیرہ چودہ برس سینئر تھے۔ فطری طور پر ان دونوں کا باہمی تعلق ایک شخصی اور ذاتی رشتہ میں ڈھل گیا۔ خواجہ صاحب نے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے تیرہ چودہ سالہ تدریسی تفاوت کو ملحوظ رکھا اور ان کی بزرگی کا ہمیشہ احترام کیا۔ سوچیے ایک جونیئر (شاگرد بھی ہو) اپنے سینئر پر کیسے اور کیوں کر دباؤ ڈال سکتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی شخصی 'خاندانی' سماجی' معاشرتی' تعلیمی اور ادبی و علمی لحاظ سے بہت مضبوط آدمی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ایک فعال اور سرگرم شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ وہ لاہور میں 1938ء سے رہ بس رہے ہیں۔ ان کا جماعت نہم سے پی ایچ ڈی تک طالب علمی کا زمانہ لاہور میں بسر ہوا۔ وہ 1951ء سے 1956ء تک پڑوسی شہر گوجرانوالہ میں ضرور رہے مگر لاہور کی تعلیمی، علمی اور ادبی سرگرمیوں سے ان کا تعلق اور رابطہ کمزور

نہ پڑا۔ انہوں نے 2 جنوری 1957ء سے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں کام شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب وسط 1957ء میں گورنمنٹ کالج میں بی۔اے کی کلاس میں داخل ہوئے۔ خواجہ صاحب چھ سات سال کے ہوں گے تب سے ڈاکٹر وحید قریشی کے علمی وتنقیدی مضامین ملک کے مشہور ادبی وعلمی رسالوں میں چھپ رہے تھے۔ راقم اور خواجہ زکریا پانچویں چھٹی جماعت میں رہے ہوں گے جب ڈاکٹر وحید قریشی حلقہ ارباب ذوق میں دھوم مچا چکے تھے اور انہی ایام میں مکتبہ جدید لاہور (1950ء) ان کی ہنگامہ خیز کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' چھاپ چکا تھا۔ کس بات پر اور کس حساب سے خواجہ محمد زکریا لاہور میں ڈاکٹر وحید قریشی کا رہنا حرام کر سکتے تھے۔ ایسا کہنا خواجہ صاحب کو در پردہ گالی دینا ہے۔ کیا معین الرحمن صاحب اپنے آپ کو ڈاکٹر وحید قریشی سے زیادہ طاقتور اور تعلق دار سمجھتے ہیں کہ خواجہ محمد زکریا سے خوفزدہ ہوئے بغیر اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ بالکل Absurd بات ہے کہ ''خواجہ زکریا کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ 'جی سی' میں ایم۔اے اردو کی کلاسز ہوں۔''

گورنمنٹ کالج کو جی سی' جی سی کہہ کر کوئی آدمی راوین نہیں بن سکتا۔ راوین خواجہ محمد زکریا ہیں جنہوں نے گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کی اور ساتھ ہی فارسی میں آنرز کا امتحان پاس کیا۔ 1964ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج سے فرسٹ ڈویژن میں ایم۔اے اردو کیا' فرسٹ پوزیشن حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی میں زیادہ نمبر لینے کا ریکارڈ قائم کیا۔ گورنمنٹ کالج کے اسی شعبہ اردو میں لیکچرار تعینات ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خواجہ غلام کبریا گورنمنٹ کالج سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن تک تعلیم پانے کے بعد اسی کالج کے شعبہ ریاضی میں لیکچرار ہوئے۔ وہ گورنمنٹ کالج شعبہ ریاضی کے لائق استاذ گورنمنٹ کالج اسٹاف کے فعال اور مقبول ممبر تھے۔ انگلستان سے ریاضی میں پی ایچ ڈی کر کے آئے' پھر گورنمنٹ کالج میں Serve کیا۔ چھوٹے بھائی ڈاکٹر خواجہ آفتاب نے گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا اور بورڈ میں فرسٹ رہے۔ کے ای سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد نیوجرسی امریکہ میں ایک Rare Speciality میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کی ہمشیرہ محترمہ نے بھی گورنمنٹ کالج ہی سے ایم ایس سی فزکس کیا۔ بعد ازاں خواجہ صاحب کے دونوں بیٹے فواد زکریا اور جواد زکریا بھی گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی اور بی ایس سی کر کے امریکہ سے MBA کرنے کے بعد بیرون ملک ہی ملازمت کر رہے ہیں۔ خواجہ غلام کبریا کی صاحبزادی نے بھی گورنمنٹ کالج سے پولیٹیکل سائنس میں پوسٹ گریجویشن کی تھی۔ ایسا نیک نہاد راوین خاندان اور خود خواجہ محمد زکریا صاحب راوین۔ وہ گورنمنٹ کالج کے مفاد کے خلاف سوچیں بھی؟ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر کوئی بات گورنمنٹ کالج کے نقصان میں ہو اور وہ اس کو روکنے کی پوزیشن میں ہوں تو اس کو علی الاعلان روکیں گے چاہے انہیں اس کے لیے کیسی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ خواجہ محمد زکریا ایک بے نیاز' نیک نفس اور خوددار انسان ہیں۔ وہ دوست نواز' متواضع اور مہمان نواز آدمی ہیں۔ وہ خلوص ومروت کے پتلے' ایثار پیشہ' وسیع القلب' عالی ظرف' لبرل اور غیر متعصب مگر اپنے خیالات' نظریات' عقاید اور نقطہ نظر کا بے جگری سے

دفاع کرنے والے 'منافقوں سے بھی رواداری برتنے والے انسان ہیں۔ سارا دن دوستوں' واقفوں' شاگردوں وغیرہ کو اپنے دفتر' پاک ٹی ہاؤس' شیزان اور فلیٹی وغیرہ میں چائے پلاتے ہیں۔ کھانے کا وقت آ جائے تو کھانا کھلاتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو حتی الامکان حد تک مقامی لوگوں کو ان کے مکان پر چھوڑتے ہیں۔ مفصل یا دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مہمانوں کو جہاں کہیں کام ہو وہاں ساتھ لے جاتے ہیں' ان کو ان کے میزبانوں کے ہاں یا اسٹیشن' اڈہ بس اور ایئر پورٹ وغیرہ پر چھوڑ کر آتے ہیں۔ یہ باتیں ڈاکٹر معین الرحمٰن جیسے جزرس' مٹھی بند انسان کی فہم اور سوچ سے زیادہ اونچی ہیں جو بقول کسے ''دریا کے تخی'' ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ مہمان نوازی ہوا کرتی تھی شعبہ اردو گورنمنٹ کالج کے ''چائے لنگر خانہ'' سے جو شعبہ اردو کے اساتذہ کی کنٹری بیوشن سے چلتا تھا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن بھی معمول کے کنٹری بیوٹر تھے۔ چونکہ چائے ان کے مہمانوں کے لیے صدر شعبہ کے کمرے میں پہنچتی تھی۔ اطراف سے آنے والے یہی سمجھ کر جاتے تھے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کینٹین سے چائے منگوائی ہے۔ وہ ان کی مہمان نوازی اور گرمجوشی سے متاثر ہو کر جاتے اور جہاں جاتے ہوں گے ان کی حاتمیت کا ذکر بھی کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے ایک نکتہ کی وضاحت میں یہ انداز گفتگو یا طرز دلیل ایک سطحی اور کم ظرفی کی بات ہو لیکن اپنی جگہ یہ نکتہ بڑا اہم ہے کہ جو آدمی دریا دل اور فیاضانہ فطرت کا مالک ہو اس کی فطرت میں بدخواہی نہیں ہوتی۔ تنگدلی تو بخیل' خود غرض اور کینہ جو لوگوں کی خصوصیت ہے۔ خواجہ محمد زکریا اپنے مزاج کے خلاف اپنی مادرِ علمی کو کوئی نقصان پہنچانا تو دور کی بات ہے اس کو کبھی نقصان پہنچتا ہوا دیکھ بھی نہیں سکتے۔ اس سلسلے میں سیدھا سا سوال یہ ہے کہ خواجہ محمد زکریا کو گورنمنٹ کالج میں کلاسز کے اجراء سے' کس نقصان سے دوچار ہونا پڑتا اور الحاق نہ ہونے سے کیا فائدہ ہوتا؟ اگر خواجہ صاحب واقعتاً اور دل سے یہ محسوس کرتے کہ اس الحاق سے ان کو ذاتی طور پر نقصان پہنچے گا۔ یا وہ یہ بھی سمجھتے کہ اس سے ان کے ادارہ (یونیورسٹی اور اورینٹل کالج) کو کسی طور بھی خطرہ ہے تو وہ بلا تامل مثبت رپورٹ کیوں لکھتے؟ کیا اُن کے سر پر معین الرحمٰن ننگی تلوار لے کر کھڑے تھے؟ خواجہ محمد زکریا نے نہایت خوشدلی سے الحاق کی منظوری کے لیے سفارش کی۔ اب یہ ڈاکٹر معین الرحمٰن پر لازم آتا ہے کہ وہ بتائیں کہ انہوں نے الحاق منظور نہ کرنے پر ڈاکٹر وحید قریشی کو مطعون کیا اور ''الحمراء'' میں مولانا حامد علی خاں کے خط پر وضاحتی نوٹ میں بھی اس الزام کی تکرار نہیں چھوڑی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' جنہوں نے خواجہ محمد سعید اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کی دلی آرزو پوری کی' ان کا چھوٹے منہ سے بھی آج تک شکریہ ادا نہیں کیا اور نہ یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ خواجہ محمد زکریا کے اس مثبت اقدام سے پروفیسر پطرس بخاری کی روح کس حد تک آسودہ ہوئی۔

اب ''توضیحات'' صفحہ 21 کا پیرا نمبر 3 دیکھیے' سید معین الرحمٰن لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر وحید قریشی کی اس ''ذہانت'' کو میں نے ان کے خیال خاطر سے ''مان لیا''۔۔۔ وہ مجھے اپنے تئیں یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ خواجہ زکریا مجھ سے شدید معاصرانہ چشمک رکھتے ہیں اور مجھے اپنا

واحد شریک اور حریف سمجھتے ہیں۔"

تجزیہ: معین الرحمٰن صاحب اس سے پہلے پیرا میں لکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اعتماد میں لے کر بتایا۔۔۔خواجہ زکریا کسی قیمت پر گورنمنٹ کالج میں ایم اے کلاسز کا اجرا نہیں چاہتے تھے۔۔۔وحید قریشی' خواجہ زکریا کے دباؤ کے تحت 1965ء کے بعد 9 فروری 1982ء (محکمہ تعلیم کی اجازت کی تاریخ) تا 15 اپریل 1983ء (وحید قریشی کی اورینٹل کالج سے رخصتی) کلاسز کے اجراء کی درخواست سے اتفاق نہ کر سکے کیوں کہ لاہور میں رہ کر وہ خواجہ صاحب کی مخالفت afford نہ کر سکتے تھے۔[دیکھیے: "الحمراء" نومبر 2003ء صفحہ 21]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ محکمہ تعلیم کا اجازت نامہ فروری 1982ء گورنمنٹ کالج میں کب پہنچا؟ محکمے کی ہدایت کے مطابق یونیورسٹی سے مقررہ رولز کے تحت الحاق کی درخواست' کس تاریخ کو یونیورسٹی بھجوائی؟ یونیورسٹی میں معائنہ کمیٹی کی تشکیل میں کتنا وقت لگا؟ یونیورسٹی کی متعلقہ مجاز اتھارٹی نے ڈاکٹر وحید قریشی کو معائنہ پر جانے کے لیے کس تاریخ کو مکتوب لکھا؟ اور کس تاریخ کو ڈاکٹر وحید قریشی نے وصول کیا؟ جس کے مطابق ڈاکٹر وحید قریشی گورنمنٹ کالج گئے۔ وہ کون سی تاریخ تھی؟ اور انہوں نے کس تاریخ کو رپورٹ پیش کی؟

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مرتبہ کتابچہ "کوائف اور کارکردگی" (مطبوعہ دسمبر 1989ء) میں اس قسم کی کوئی تفصیل درج نہیں۔ خواجہ محمد زکریا کے دباؤ کے تحت ڈاکٹر وحید قریشی کے الحاق کی درخواست مسترد کرنے کی کوئی تحریر موجود نہیں جبکہ منظوری کے کوائف بتاتے ہوئے اس سلسلے کی خط کتابت کے عکس فراہم کیے گئے ہیں جو بیان کردہ کوائف کو مصدقہ ثابت کرنے کا تاثر دینے کے لیے چھاپے گئے ہیں۔ آخری عکس یونیورسٹی کے مکتوب نمبر 1367 محررہ 1985-5-28 کا عکس ہے جس کے مطابق گورنمنٹ کالج کے پہلے سے الحاق (غالباً بی اے سطح تک) میں توسیع کرتے ہوئے ایم اے کی سطح تک تدریس کی اجازت' سنڈیکیٹ کی منظوری Anticipate کرتے ہوئے دی گئی مگر اس کا سرے سے کوئی ذکر یا اشارہ تک نہیں کیا گیا کہ یونیورسٹی نے کون سی معائنہ ٹیم نامزد کی تھی۔ جس کی رپورٹ کی بنیاد پر کلاسز کا الحاق ہوا۔ الحاق کی اس اجازت کے تحت تدریس کا آغاز ہوا۔ پہلی کلاس میں مقررہ تعداد کے مطابق 20 طالبات اور 5 طالب علم داخل ہوئے جنہوں نے "یونیورسٹی لاہور کے ایم اے اردو پارٹ II فرسٹ اینول امتحان 1986ء منعقدہ جولائی اگست 1987ء میں شرکت کی" (کوائف اور کارکردگی ص 42)

پھر مندرجہ بالا "توضیحات" ("الحمراء" نومبر 2003ء ص 21 پیرا 3) کی تشریح رہ گئی۔ اس میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کہتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کی شرارت (ذرفتنی' منو بھٹائی کی Coined اصطلاح) کو "وسیع القلبی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے (تاکہ وحید قریشی کا دل برا نہ ہو) "مان لیا" جب کسی متن

کا کوئی لفظ یا ٹکڑا اوا دین میں لکھ دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ یہاں اس لفظ یا ٹکڑے کے لغوی معنوں سے الگ کوئی مرادی معنی لیے جائیں۔ یہاں مراد ہے 'میں نے دل سے نہیں' 'اوپر اوپرے'' دکھاوے کے لیے اس شرارت (ورفتنی) کو مان تو لیا ہے لیکن دل سے نہیں مانا۔ لہٰذا میں نے خواجہ محمد زکریا کی شدید معاصرانہ اور معاندانہ روش کو منافقانہ (اور در پردہ مخاصمانہ) میں بدل دیا۔ ایسا کیوں کیا؟ کیا 1985ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کے اعتراف پر مبنی معلومات اس کی محرک ہیں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی سے منسوب بیان اور Concocted اعتراف کی تردید اور تنسیخ خواجہ محمد زکریا کے عمل اور رویے سے ہو جانی چاہیے تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بطور چیئرمین مقتدرہ قومی زبان کراچی چلے جانے کے بعد ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی ہو گئے۔ ان کے 14 اگست 1984ء کو ریٹائر ہونے کے بعد 14 اگست 1984ء کو خواجہ زکریا نے شعبہ اردو کے صدر کا منصب سنبھالا۔ 28 مئی 1985ء کو پنجاب یونیورسٹی نے اپنے مراسلہ میں گورنمنٹ کالج میں اردو کلاسز کے الحاق میں جس توسیع کی اجازت دی ہے اس کی بنیاد خواجہ محمد زکریا کی مثبت معائنہ رپورٹ ہے۔ اس بار معائنہ رپورٹ کے مثبت ہو جانے کے کئی اسباب معائنہ کرنے والے کے سامنے رہے ہوں گے۔

1۔ 1965ء سے 1985ء تک دو دہائی گزرنے تک معروضی حالات بدل گئے تھے۔

2۔ 1985ء میں شعبہ اردو گورنمنٹ کالج میں پانچ چھ پی ایچ ڈی استاد موجود تھے اور چار پانچ استاد ایم اے اردو کی تدریس کا پیشگی تجربہ رکھتے تھے۔

3۔ صوبے کے کئی دوسرے شہروں میں ایم اے اردو کی کلاسز کی کامیابی ایک مثال بھی بن گئی تھی۔

4۔ 1965ء کی رپورٹ میں یہ دلیل مناسب نہ تھی کہ۔۔۔ ایک ہی شہر میں دو الگ الگ انتظام کسی طرح بھی موزوں نہیں ہیں کیوں کہ برسوں سے ایم۔ اے انگریزی کی کلاسز لاہور میں بیک وقت گورنمنٹ کالج' اسلامیہ کالج سول لائنز' ایف سی کالج اور غالباً کنیرڈ کالج میں پڑھائی جا رہی تھیں۔ دوسرے کئی مضمونوں کے ایم اے' ایم ایس سی میں بھی مختلف اداروں میں تدریس ہو رہی تھی۔

5۔ اگرچہ 1965ء اور 1985ء میں رپورٹ پیش کرنے والے دونوں اصحاب اولڈ راوین تھے مگر 1985ء کے رپورٹ دینے والے خواجہ محمد زکریا اور پرنسپل ڈاکٹر عبدالمجید اعوان کے مابین گہرا شخصی تعارف اور ملاقات تھی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے بڑے بھائی ڈاکٹر خواجہ غلام کبریا اور ڈاکٹر عبدالمجید اعوان انگلستان میں پی ایچ ڈی کے زمانہ طالب علمی میں ایک ساتھ رہے تھے۔

6۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کتابچہ صفحہ 36 پر سفارت کاری کے لفظ کے عقب میں ڈاکٹر عبدالمجید اعوان اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے تعارف اور تعلق' دونوں کا فون یا ملاقات میں مکالمہ کی طرف اشارہ ہے۔

7۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بدلے ہوئے معروضی حالات کا شعور رکھتے تھے۔ غالباً ان کا یہ بھی خیال تھا کہ

اور ینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج کے شعبوں میں مسابقت اور مقابلہ صحت بخش نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ خواجہ محمد زکریا نے بڑی خوشدلی سے مثبت رپورٹ قلمبند کر دی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر خواجہ محمد زکریا پھر سے الحاق و اجرا کی درخواست مسترد کر دیتے' کسی بہانے التوا میں ڈال دیتے یا کوئی Slanting Remark لکھ دیتے تو ڈاکٹر معین الرحمٰن (جن کی زبان کئی نئے ذائقوں اور ان کے کام و دہن کئی نئی لذتوں کے آشنا ہو چکے تھے اور وہ فروری 1981ء سے بے حضوری اور مجبوری کی حالت میں تڑپ رہے تھے) کے لیے ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ فیصل آباد اپنا تبادلہ کروا لیتے۔

صاحبو! عدل و انصاف بھی کوئی چیز ہے۔ ٹھیک ہے کہ یہ بے قدری' بے مروتی اور احسان ناشناسی کا دور ہے لیکن منفصل سے آئے ہوئے جی سی میں صدر شعبہ اردو کو چار سال میں کچھ تو Protocol سیکھ لینا چاہیے تھا۔ پرانے صدر شعبہ خواجہ محمد سعید اپنے صاحب پطرس بخاری کے سامنے اپنے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کو کھڑا کر کے انہیں اپنی قدر پہچاننے کا وعظ کرنے لگے۔

معلوم ہوتا ہے خواجہ محمد سعید کو نہ تناظر کا علم تھا اور نہ منظر کی خبر' اس لیے پطرس بخاری اور سید عبداللہ کو بھڑا دیا۔ حالانکہ اکھاڑے میں ڈاکٹر عمر حیات اور پطرس بخاری تھے۔ خواجہ صاحب کے ہیرو کی غلطی بھی اسی تناسب سے بڑی تھی۔ وہ خود تو یو۔ این۔ او۔ سدھارے۔ یہاں اس غلطی کی بنا پر ان کے پسماندگان کو ہزیمت اور خفت اٹھانا پڑی۔

پھر ڈاکٹر وحید قریشی کو 1965ء میں معائنہ رپورٹ لکھنے پر اتنا رگیدا اور گھسیٹا ہے۔ زبانی اور تحریری طور پر کہ انہیں نکو بنا کر رکھ دیا۔ خواجہ محمد سعید سے پوچھیے جنہوں نے نصف صد تو رپورٹیں لکھی ہوں گی' ڈاکٹر معین الرحمٰن بتائیں جنہوں نے ایک ڈیڑھ درجن رپورٹیں تو ضرور قلم بند کی ہوں گی کہ کیا رپورٹ ہمیشہ درخواست گزار کے حسب منشا لکھی جاتی ہے یا معروضی حقائق کے مطابق؟ اگر وحید قریشی نے معروضی حقائق نظر انداز کر دیے تھے یا ان سے تجاوز کیا تھا تو اس وقت کے صدر شعبہ خواجہ محمد سعید نے Follow up کیوں نہیں کیا؟ اگر یہ کلاسیں شروع ہو جاتیں تو Incumbent صدر شعبہ کو صدارت سے الگ ہونا پڑتا کیونکہ کلاسز کے اجراء کی صورت میں کوئی سینئر پی ایچ ڈی اُردو پروفیسر مثلاً ڈاکٹر صفدر حسین یا ڈاکٹر اکبر حسین قریشی صدر شعبہ ہو جاتے۔

معین الرحمٰن نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے 1985ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے اردو کی کلاسز کو ملحق کرنے کی سفارش کر دی۔ اس کے مطابق یونیورسٹی نے متذکرہ کلاسز کے اجرا کی اجازت دے دی تو خواجہ محمد زکریا کا شکریہ ادا کیوں نہیں کیا گیا۔ کتابچہ ''کوائف اور کارکردگی'' میں خواجہ محمد زکریا کے مثبت رول کا ذکر کیوں نہیں؟ اسے کیوں Suppress کیا گیا ہے؟ یہ کام ان توضیحات میں بھی ہو سکتا تھا۔ اسے کیا کہتے ہیں۔ تنگدلی' کم ظرفی' احسان ناشناسی اور۔۔۔ اور۔۔۔ آفرین ہے خواجہ محمد

زکریا پر انہوں نے نہ کبھی گلہ کیا اور نہ احسان جتایا۔

اس کے بعد' بجائے اس کے کہ خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر معین الرحمٰن کو استعمال کرتے' معین الرحمٰن آہستہ آہستہ دام تزویر پھیلاتے گئے۔ لوگوں نے بارہ برس یہ تماشا دیکھا کہ موصوف ہر دوسرے روز خواجہ زکریا کے دفتر میں کانا پھوسی فرما رہے ہیں۔ مختلف موقعوں پر ہاں سے ہاں ملا رہے ہیں۔ اس کمیٹی کے ممبر بن رہے ہیں' ایم اے کے اس پرچہ کے ممتحن' بی اے کے ہیڈ ایگزامنر' مقالوں کے نگران' مقالوں کے ممتحن' اس کی سفارش' اُس کو فلاں رعایت' کبھی شعبہ اردو' جی سی کے ریسرچ جرنل کی مجلسِ مشاورت میں خواجہ زکریا کا نام چھاپا جا رہا ہے۔ یوں انہوں نے چالاکی سے خواجہ محمد زکریا کو بھی بالآخر ڈاکٹر وحید قریشی کی طرح شیشہ میں اتار لیا۔ اب خواجہ صاحب ہر تیسرے چوتھے روز گورنمنٹ کالج میں پائے جاتے تھے۔ ان کی سفارش پر ڈاکٹر نیر صمدانی کو شعبہ اردو میں بلوایا گیا۔ ان سے بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کئی بیگار کے کام لیے' ساتھ ہی انہیں ناپسند بھی کرتے تھے' پھر انہیں اپنی بڑی بیٹی کے امتحانی تحقیقی مقالہ کا نگران بھی مقرر کیا۔ ان کی لگاتار چار پانچ اے سی آر بھی خراب کر دیں۔ دو چار دوستوں کے آگے پیچھے ریٹائر ہو جانے پر ڈاکٹر نیر صمدانی شعبہ میں دوسرے نمبر پر آ گئے۔ کالج کے مجلّہ ''راوی'' اور گورنمنٹ کالج گزٹ کے نگران بھی مقرر ہو گئے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ان سے اختلافات ہوتے ہوتے Clash اور نفرت پر منتج ہوئے۔ Irony یہ ہے کہ ان کے تعلقات کا یہ انجام کم و بیش تمام ارکانِ شعبہ سے ایسا ہی ہوا ہے۔ ان میں سے بیشتر وہ افراد ہیں جو اپنی کسی نہ کسی افادیت کی بنا پر ان کے مراعات یافتہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کو بڑوں کے اقوال اور ان کی تحریروں کے اقتباسات سے بہت دلچسپی ہے۔ غالباً وہ اپنے منشاء و مدعا کا اظہار ان اقوال کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے بڑی شخصیت کے قول میں کوئی آئیڈیل بات ہوتی ہے۔ چونکہ معین الرحمٰن لافانی شخصیت بننے کا بھی وافر شوق رکھتے ہیں' اس لیے وہ اپنے اقوال ڈھال کر بڑوں کے اقوال کے ساتھ رکھ کر ادھر اُدھر چھاپ دیتے ہیں۔ دراصل یہ سطور لکھنے سے پہلے اتفاقاً ان کے کتابچہ: ''کوائف اور کارکردگی'' کے صفحہ 100 پر تعلیم کے مشہور فلسفی اور ماہر خواجہ غلام السیدین کی ایک کوٹیشن درج نظر آتی ہے۔ (انسانی نفسیات کا یہ ایک دلچسپ پہلو ہے کہ ایک چیچک زدہ فرد بھی دیر تک آئینہ دیکھنے میں مصروف رہتا ہے اور اپنے چہرے میں کوئی نہ کوئی سپاٹ ڈھونڈ کر نازاں و فرحاں ہو لیتا ہے۔ اگر انسان کبھی دوسروں کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھ لے تو شاید کبھی زندہ نہ رہے۔ یہ خوش فہمی اور خود فریبی ہی ہے جو اسے تازہ دم اور جوان رکھتی ہے۔ اس گریز سے قطع نظر کرتے ہوئے سیدین صاحب کی کوٹیشن ملاحظہ فرمائیے:

''اچھے ہیڈ'' کی پہچان یہ ہے کہ وہ خود کو پس منظر میں رکھتا ہے اور جب کوئی ''باہر'' یا اوپر سے آئے تو وہ اپنے ساتھیوں کے اچھے کام کی دل کھول کر داد دیتا ہے۔ ''برا'' ہیڈ خود ہمیشہ اسٹیج کے مرکز میں رہتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے تعارف میں اکثر کوئی اسم معرفہ بھی استعمال نہیں کرتا۔ بس ''یہ میرے شعبہ کے

استاد ہیں'' جیسے کوئی کہے کہ'' یہ میرے کارخانے کے مزدور ہیں'' اور کارخانہ میرے دم قدم کی برکت سے چلتا ہے!'' ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین (گورنمنٹ کالج لاہور' شعبہ اردو کوائف اور کارکردگی صفحہ 100)

معین الرحمٰن ایسی کوٹیشن یا قول ایک خاص فریم میں چھاپتے ہیں جہاں سے وہ موصوف کی اپنی شخصیت کو چمکانے اور ابھارنے کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ سیدین صاحب کی مندرجہ بالا کوٹیشن ''کتابچہ کوائف اور کارکردگی'' صفحہ 99 پر'' قیام پاکستان سے۔ جی سی کے ایک سو پچیس سال تک۔ صدر شعبہ اردو'' کی سرخیوں کے نیچے نو افراد کی فہرست۔ کے بعد اگلے صفحہ 100 پر سیدین صاحب کی یہ کوٹیشن ہے۔ اس کے بالمقابل صفحہ 101 پر شعبہ اردو کے کچھ سابق اساتذہ کے زیر عنوان ایک فہرست ہے۔

قیام پاکستان سے

جی سی کے ایک سو پچیسویں سال تک:

صدر شعبہ اردو

1۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری	1948ء	1949ء
2۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	1949ء	1950ء
3۔ ڈاکٹر محمد صادق	1950ء	1953ء
4۔ پروفیسر جی ایم اثر	اگست 1953ء	اپریل 1960ء
5۔ پروفیسر خواجہ محمد سعید	اپریل 1960ء	19 ستمبر 1968ء
6۔ پروفیسر ملک بشیر الرحمٰن	20 ستمبر 1968ء	11 اپریل 1972ء
7۔ پروفیسر ریاض میرزا	12 اپریل 1972ء	16 جولائی 1979ء
8۔ پروفیسر خواجہ محمد سعید	17 جولائی 1979ء	25 فروری 1981ء
9۔ پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	25 فروری 1981ء سے	

(گورنمنٹ کالج لاہور' شعبہ اردو کوائف اور کارکردگی صفحہ 99)

ڈاکٹر معین الرحمٰن شاید اپنے آپ کو دنیا کا ذہین ترین شخص سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ہر دوسرا آدمی کوڑھ مغز اور کور چشم ہے۔ اگر واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ کوڑھ مغز اور بے بصر کون ہے۔ آج سید معین الرحمٰن جن پروں اور بازوؤں پر اڑے پھرتے ہیں اور اپنی لمبی اڑانوں پر نازاں ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کبھی ڈاکٹر وحید قریشی کے پر اور بازو تھے۔ یہی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے بھی بازو اور پر رہ چکے ہیں۔ ضروری نہیں کہ خدا کائنات کی ہر چیز کسی ایک ذات یا وجود کو عطا کر دے۔ اس کے ہاں تقسیم کا ایک اپنا نظام ہے۔ وہ کسی کو بصیرت اور عزت نہیں بھی عطا کرتا۔

متذکرہ توضیحات کے ذیل میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے یہ دو فقرے پڑھ کر راقم کا اچنبھا نہیں ختم ہو

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind) Library

رہا۔ موصوف کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے:

''میرے اور برادرم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے مابین (1965ء تا حال) کیا رشتہ رہا یہ ایک الگ اور مختلف (بعض دوستوں کے نزدیک ایک مستقل موضوع) ہے۔۔۔'' (''الحمرا'' نومبر 2003ء ص 21)

ڈاکٹر معین الرحمٰن غالباً برادرم بھائی چارے اور رشتہ کے معنی نہیں سمجھتے۔ بھائی چارے اور رشتوں میں موضوع بحث بننے کی رتی بھر گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں صرف ایثار' جاں نثاری اور جاں سپاری ہوتی ہے۔ خلوص' مروت اور مہر و وفا ہوتی ہے۔ بے غرضی اور بے نفسی ہوتی ہے۔

یہ اتفاق ہے کہ راقم ان دونوں کے 1965ء تا حال تعلقات کا (رشتہ کا نہیں) عینی شاہد ہے۔ ان دونوں حضرات کے مابین دوستی کے رشتہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے ایک واقعہ کی تفصیل دیکھیے:

خواجہ محمد زکریا 2000ء میں ریٹائر ہوئے۔ خواجہ صاحب کے اعزاز میں مختلف ادارے اور افراد الوداعی دعوتیں دے رہے تھے۔ راقم 1996ء میں ریٹائر ہو چکا تھا ایک دن سبب یاد نہیں رہا شعبہ اردو گورنمنٹ کالج میں موجود تھا اور سابقہ رفقائے کار سے ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔ خواجہ محمد زکریا بھی تشریف لے آئے۔ معلوم ہوا شعبہ خواجہ صاحب کے اعزاز میں الوداعی لنچ دے رہا ہے۔ میں نے پوچھا گورنمنٹ کالج کا شعبہ کس حوالے سے الوداعی تقریب کا اہتمام کر رہا ہے؟ معلوم ہوا شعبہ کے اساتذہ کی اکثریت خواجہ صاحب کے شاگردوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے جذبہ محبت' تشکر اور احسان مندی کے تحت کنٹری بیوشن سے پرتکلف لنچ کا انتظام کر رکھا ہے۔ راقم پہلے سے مدعو نہ تھا۔ مگر میزبان دوستوں نے اس وقت روک لیا۔ کھانے سے قبل خواجہ صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا جلسہ ہوا۔ معین صاحب اس جلسہ کی کارروائی اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے۔ معین الرحمٰن کے معتمد اصغر ندیم سید نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دینے شروع کیے۔ اصغر ندیم سید نے اپنے تعارف میں خواجہ صاحب کی تعریف و توصیف کی جس کو ڈاکٹر سلیم اختر نے آگے بڑھایا۔ معین الرحمٰن صاحب نے خراج تحسین پیش کرنا شروع کیا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر دلسوزی اور رقت کی کیفیت جو وہ پیدا کر لیا کرتے ہیں' ان پر پوری شدت سے طاری تھی' آخر میں انہوں نے سربراہ مملکت' وزیراعظم یا چیف منسٹر کے معمول اور انداز میں ایک نیوز بریک کرتے ہوئے کہا۔ میں آپ کو ایک خوشخبری دیتا ہوں۔ خواجہ صاحب نے ہماری درخواست قبول فرمائی ہے۔ وہ ہمارے شعبہ کی تدریس میں شریک ہوں گے۔ ہمارے طلبہ اور اساتذہ کی خوش قسمتی ہے کہ وہ خواجہ صاحب کے تعلیمی' علمی اور تحقیقی تجربے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ راقم نے کھانے کے دوران خواجہ صاحب کو اس Surprise پر مبارکباد دی۔ انہوں نے کہا یہ میرے لیے خود ایک Surprise ہے۔ راقم نے کہا ''آپ نے اپنی تقریر میں اس نامزدگی پر شکریہ ادا نہیں کیا'' فرمایا ''میں معین صاحب کی move سمجھ نہیں پایا۔''

راقم: ''یہ Sincere Offer معلوم ہوتی ہے۔''

خواجہ صاحب: ''لیکن مجھ سے پوچھا تو ہوتا''

چند دن گزرنے کے بعد موصوف کے صاحبزادے سید وقار معین' اپنی خواہر نسبتی کے ساتھ خواجہ صاحب کے ہاں پہنچے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد ان خاتون نے ایک درخواست خواجہ صاحب کی بیگم ڈاکٹر شگفتہ زکریا (صدر شعبہ اردو' لاہور کالج جو بعد میں یونیورسٹی کا درجہ پا گیا) کو تھماتے ہوئے کہا۔ میری بہن (بہو معین الرحمٰن) کا اپنے ہاں تبادلہ کر دیجیے۔ وہ کوٹ رادھا کشن جاتے جاتے تھک گئی ہے۔ مسز خواجہ زکریا نے کہا ''لیکن ہمارے ہاں کوئی پوسٹ خالی نہیں ہے'' مہمانوں نے جواب دیا ''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا آپ Recommend کر دیں۔ آرڈر ہم کروالیں گے''

مسز خواجہ زکریا نے جواب دیا: ''پرنسپل صاحبہ کیا سوچیں گی کہ یہ کیسی صدر شعبہ ہے جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے پاس کوئی جگہ خالی ہے یا نہیں۔ بہر حال جب بھی جگہ بنی آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔''

لہٰذا معین الرحمٰن صاحب نے بھی خواجہ صاحب کو کنٹریکٹ پر بلانے کے لیے پرنسپل صاحب کو نہ لکھا بلکہ پرنسپل کو بورڈ آف اسٹڈیز کی لسٹ بھجوائی تو اس میں سے خواجہ صاحب کا نام ڈراپ کر دیا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن دوستوں کو دھوکے کی چوٹ' بدعہدی' زیادتی اور بے مروتی کا زخم دے کر سمجھتے ہیں کہ نشانہ بننے والوں کو وار پروار کرنے والے کا پتہ نہیں چلا۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ لوگوں کا حافظہ میری طرح وفا نہیں کرتا مگر یہ ان کی کم فہمی ہے۔ یہ درست سہی کہ کسی بے مروتی اور بدعہدی کی پیدا کردہ تلخی کی شدت میں وقت ضرور کمی کر دیتا ہے مگر تکلیف دہ یادیں Indelible ہوتی ہیں۔

کہا گیا ہے بالآخر 1985ء میں پطرس بخاری کا خواب ایم اے اردو کی کلاسز کے اجراء کی صورت میں پورا ہوا۔ بخاری مرحوم کے خواب وخیال سے کون سے راہنما اصول اخذ کیے گئے اور ان کی روشنی میں شعبہ اردو کی کارکردگی کے لیے کون سے خطوط مرتب کیے گئے۔ شعبہ کا کوئی مستقبل کا مورخ ہی بتائے گا۔ البتہ پہلے صدر شعبہ کے دور صدارت میں کیا کیا واقعات رونما ہوئے وہ شعبہ کی تاریخ کا کم مگر ان سابق صدر شعبہ کے سوانح کا وقیع اور وسیع حصہ ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کم و بیش چوتھائی صدی تک یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ ہاپوڑ یا اس کے کسی قریبی قصبہ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کا انداز تکلم' طرز نشست و برخاست اور لباس لوگوں کے اس تاثر کو یقین میں بدلتا رہا۔ وہ تو جب موصوف کو یقین ہو گیا کہ ان کی قسمت کا ستارہ پنجاب کی سرزمین کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان سے وابستہ ہے انہیں اپنا آب ودانہ پنجاب سے لینا ہے اور پنجابیوں کے درمیان ہی رہنا ہے تو انہوں نے اپنی روزمرہ کی روش بدلی اور بھنڈہ پٹیالہ کو واضح طور پر اپنا مولد لکھنا شروع کیا۔ یہ تو بچے بچے نے شہر در شہر برسوں دیکھا ہے کہ موصوف نے سید وقار عظیم کی خوشامد کا عملی نمونہ بن کر ایک زمانہ گزارا' اپنی پوری

جزئیات میں ان جیسا لباس زیب تن کرلیا' ان کی طرح مفلر گلے میں لپیٹ لیا اور ان جیسا کھسہ پاؤں میں پہن لیا۔ مگر اب مدتوں سے اس لباس کو خیر باد کہہ چکے ہیں شاید کراچی پہنچ کر علی گڑھ کٹ پاجامہ اور شیروانی پہن لیتے ہوں۔ ان کا ہر قول و فعل پیچیدہ' ٹیڑھا میڑھا' جھوٹ اور فریب پر مبنی ہوتا ہے۔ پھر لوگوں نے جب اردو زبان و بیان پر ان کی دسترس دیکھی تو انہیں پنجابیوں میں شمار کرنا شروع کیا۔

جملہ ہائے معترضہ برطرف! بہر حال دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن بحث کو اختتام کی طرف لے جانے کی بجائے Side Track کرکے غیر مطلوب بات کہہ دیتے ہیں تو اس کی وضاحت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً موصوف اپنی توضیحات پر عرفان احمد خاں (ناول نگار) کے اعتراضات (ماہنامہ ''الحمراء'' لاہور دسمبر 2003ء) کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وحید قریشی کا ذخیرۂ کتب سر آنکھوں پر' یہ تو اب 'جی سی' میں آیا ہے۔ میرے ذاتی ذخیرۂ کتب کا ایک حصہ تو' جو غیر مطبوعہ تھیسز اور قائداعظم نیز تاریخ و تحریک پاکستان سے متعلق کتابوں پر مشتمل ہے' اس سال کے اوائل ہی میں 'گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی) لائبریری میں جا چکا۔''

(''الحمراء'' فروری 2004ء)

معین الرحمٰن صاحب کی ایک عادت بلکہ فطرت ثانیہ ہے کہ وہ ہر خط' رسید' مضمون' تحقیق' تحریر اور ناتحریر میں تاریخ کا اندراج اور اس کا حساب ضرور کرتے ہیں مگر متذکرہ پیرا میں انہوں نے دیدہ و دانستہ گریز کیا ہے اور ایک قسم کا مغالطہ بلکہ (فریبِ نظر کی طرح) ''فریبِ زماں'' پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس پیرا کی آخری سطر میں ''اس سال کے اوائل ہی میں'' سے تو جنوری 2004ء بنتا ہے مگر امر واقعہ یہ ہے کہ معین الرحمٰن صاحب کی متذکرہ کتابوں/ رسالوں/ مقالوں (کل تعداد: یک صد) کی فہرست پر موصوف کے دستخط کے نیچے ان کی مہر اور اس کے نیچے ان کے ہاتھ سے لکھی گئی تاریخ یکم مارچ 2003ء ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا ذخیرۂ کتب (تعداد: 16892) جون جولائی 2003ء میں 'جی سی یو' پہنچا۔ اس پس منظر میں ''وحید قریشی کا ذخیرہ کتب۔۔۔ تو اب آیا ہے۔ میرے ذاتی ذخیرہ کتب کا ایک حصہ۔۔۔ اس سال کے اوائل ہی میں گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی) میں جا چکا'' ایک بڑا زمانی بعد اور فاصلہ پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ درآں حالیکہ یہ زمانی فرق صرف چار پانچ مہینے کا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ فرق بھی نہیں رہتا کیونکہ 2003ء کے ابتدائی دو تین مہینے وحید قریشی کی کتابوں کی منتقلی وغیرہ کے مسائل طے کرنے میں صرف ہو گئے ہوں گے۔

معین الرحمٰن صاحب نے ''زمانی مغالطہ'' کی طرح کتابوں/ رسالوں/ مقالوں کے باب میں ''عددی مغالطہ' پیدا کرتے ہوئے اصل تعداد کی بجائے یہ لکھا'' ۔۔۔ میرے ذاتی ذخیرۂ کتب کا ایک حصہ۔۔۔'' ذخیرہ کے لفظ میں کافی حد تک Unlimited کا تصور آتا ہے اور ''ذخیرہ کا حصہ'' اپنے اندر بڑے گھیراؤ کا امکان رکھتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ موصوف نے صرف ۵۰ غیر مطبوعہ تھیسز دیے جو شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج کے طالب علموں نے شعبہ کے ریکارڈ کے لیے جمع کرائے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ اپنی ریٹائر منٹ پر اخلاق، روایت اور اصول کے خلاف شعبہ کے دوسرے ریکارڈ کے ساتھ اپنے گھر لے گئے تھے اور دراصل شعبہ کے مطالبے پر واپس کیے ہیں۔ ابھی مبینہ طور پر بڑی تعداد ان کی طرف Due ہے۔

قائد اعظم نیز تاریخ و تحریک پاکستان سے متعلق بتائی گئی کتابوں اور رسالوں کی تعداد بھی صرف پچاس ہے۔ ان میں قائد اعظم کے حوالے سے دوسرے درجہ کی آٹھ نو اردو کتابیں 'تحریک پاکستان' 'تشکیل پاکستان' 'پاکستان کیوں ٹوٹا (ایک ایک) اور مطالعہ قرارداد پاکستان (کتابچہ)' بحوالہ چھ تمبر تین کتابچے' انگریزی میں چار کتابیں سوانح قائد اعظم 'قائد اعظم کی تقریریں (کسی ایک یا دو سال کی) تین کتابیں۔ ماؤنٹ بیٹن اور قائد اعظم (کتابچہ) ہسٹری آف پاکستان (ایک) ایک کتاب قائد اعظم اور لائل پور از ڈاکٹر معین الرحمن دو ایڈیشن۔ (اس کتاب کی تسوید کا پس منظر 'علیحدہ مسئلہ اور تنازع ہے) گیارہ کالج میگزینوں کے قائد اعظم نمبر' پندرہ روزہ آتش فشاں کا ایک نمبر اور محدود اشاعت رکھنے والے تہذیب الاخلاق لاہور کے دو شمارے۔ یہ ہے کیفیت ''اس ذخیرہ کے ایک حصہ کی''

ڈاکٹر معین الرحمن نے اس قسم کے ایک اور عطیے (اعزازاً کسی قیمت یا رعایت کے بغیر) کا عندیہ ظاہر کیا ہے مگر بلا قیمت دینے کے اعلان کے ساتھ ہی اس کی ایک بھاری قیمت مقرر کرنے کے ساتھ ایک کڑی شرط بھی رکھ دی۔ اس سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے:

''دوسری قسط کے طور پر میرے ذخیرۂ اقبالیات کو 'جی سی یو' لائبریری میں منتقل ہونا ہے۔ صرف اقبالیات سے متعلق یہ سارا لوازمہ کوئی ایک ہزار کے لگ بھگ کتب و رسائل' مقالات اور تراشوں وغیرہ پر مشتمل ہوگا۔ تجویز یہ ہے کہ پہلے ایم فل (اردو) کے ایک مقالے کے طور پر اس ذخیرے کی تحقیقی اور توضیحی فہرست تیار کرالی جائے۔ پھر یہ سب چیزیں بھی اعزازاً (کسی قیمت یا رعایت کے بغیر) 'جی سی یو لائبریری میں چلی جائیں گی'' (''الحمراء' فروری 2004 صفحہ 70)

متذکرہ لوازمہ کیا ہوگا؟ اس بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس کی نوعیت قائد اعظم اور تحریک پاکستان پر کتابوں اور رسالوں جیسی نہ ہو۔ ان کتابوں' رسالوں اور تراشوں وغیرہ پر مبنی مواد کے حوالے سے ایم فل (اردو) کی سطح کا کام ہو سکتا ہے یا نہیں' یہ فیصلہ تو کسی یونیورسٹی کے شعبہ کا بورڈ آف اسٹڈیز ہی کر سکتا ہے۔ ان کتابوں کے انتقال سے قبل متوقع ریسرچ اسکالر کو موصوف کے مکان پر آزادانہ کام کرنے کی سہولت بھی ہوگی یا نہیں' اس کی یقین دہانی کی بھی ضرورت ہے۔ موصوف اپنی کولیکشن کے دو چار حصوں او رحوالوں کی فہرست اپنی ہمشیرہ یا کسی شاگردہ کے نام پر شائع کرواتے رہے ہیں۔ لوگ چہ میگوئیاں کر لیتے ہیں مگر شاید موصوف کو بتاتا کوئی نہیں کہ حضرت یہ کتابیں لائبریریوں کے علاوہ بہت سے مدرسوں' جرنلسٹوں' عام شائقین علم و ادب اور Bibliophiles کے گھروں میں بھی ہیں۔ البتہ ذاتی نمود و نمائش کا یہ بہت سستا

اور او چھا طریقہ ضرور ہے کہ کبھی گوشہ سر سید اور کبھی غالب کے نئے حوالوں کے تحت اپنے ذخیرۂ کتب کی منتشر فہرستیں چھپواتے ہیں۔

''الحمرا'' میں حامد علی خاں کے مکتوب کی توضیحات اور عرفان احمد خان کے جواب میں وضاحت کے سلسلے میں کتب خانہ وقار عظیم اور ذخیرۂ معین الرحمٰن کا ذکر بھی وضاحت چاہتا ہے۔ معین الرحمٰن نے اپنا ذخیرۂ کتب کس طرح تشکیل دیا اور کتابوں کے حصول میں کن غیر اخلاقی اور غیر اصولی طریقوں کو روا رکھا' یہ ایک الگ کہانی ہے تاہم پروفیسر وقار عظیم مرحوم کا کتب خانہ جی سی یو لائبریری میں کیوں نہیں پہنچ پا رہا؟ اور موصوف اپنے ذخیرۂ کتب کو جی سی یو میں منتقل کرنے میں کتنے مخلص ہیں؟ ان سوالوں کا جواب نہیں مل رہا۔

پندرہ سولہ برس سے سنا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی وساطت سے سید وقار عظیم مرحوم کی کتابیں لائبریری گورنمنٹ کالج لاہور میں منتقل ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں ایک تحریری شہادت بھی فراہم ہوئی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن ''شعبہ اردو کی علمی اور تعلیمی پیش رفت: 1992ء'' کے عنوان سے ''تحقیق نامہ'' نمبر 2' 93-1992، صفحہ 199 پر لکھتے ہیں:

''وقار عظیم صاحب کا (یہ) شخصی ذخیرۂ کتب میرا دیکھا بھالا ہے۔ یہ ایم۔ اے (اردو) کی سطح پر تدریسی اور ادبی و دری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک خود مکتفی خزانے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے لیے یہ بے حد عزت اور مسرت کی بات ہے کہ وقار عظیم مرحوم کے اہل خانہ نے یہ کتب خانہ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کی سیمینار لائبریری کو ہدیتاً عطا کر دینے کا عندیہ ظاہر لیا ہے۔ ہم اس فراخ دلانہ پیش کش کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ اس ذخیرۂ کتب کی وصولی کے بعد ہمارے شعبے کی سیمینار لائبریری بڑی باثروت اور بہت مثالی ہو جائے گی۔''

سید وقار عظیم مرحوم کے صاحبزادگان وضعداری نبھانے کی کوشش میں از خود کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ کب یہ کتابیں گورنمنٹ کالج کے سپرد کی جائیں۔ وہ اس خدشہ سے یقیناً بے خبر نہ ہوں گے کہ اس بلا وجہ التوا اور تاخیر کے باعث کتابوں کو نقصان پہنچنے کا ہر امکان موجود ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن اس مستقل تاخیر سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں وہی بہتر طور پر جانتے ہیں۔

یہ کون نہیں جانتا کہ کسی مرحوم ذی علم شخصیت کی کتابوں کی کولیکشن کی کسی علمی و تعلیمی ادارے کو Donation مرحوم کی ایک مستقل یادگار تو ہوتی ہی ہے مگر یہ ایک صدقہ جاریہ بھی ہوتی ہے۔ ایسے نیک کام کو برسوں تک روکے رکھنا مرحوم کی یاد کو محدود کرنے بلکہ روکنے کی کوشش ہے۔ اس قسم کے ذخیرۂ کتب کو قفل لگا کر رکھنا علم رسانی اور فیض رسانی کے سلسلے کو منقطع کرنے کے مترادف ہے جو ایک بڑا ظلم ہے۔

دراصل ڈاکٹر معین الرحمٰن کتابوں کی Donation کو بعض حلقوں میں اپنے ذکر کو زندہ رکھنے یا ان سے ہمدردی حاصل کرنے کا ایک حربہ خیال کرتے ہیں۔ مثلاً جب ''مسروقہ دیوانِ غالب'' کے سلسلے میں

ان کو پنجاب یونیورسٹی میں جوابدہ ہونا پڑا تھا تو پروفیسر عبدالجبار شاکر نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے ایک انٹرویو میں مندرج ایک بیان اس زمانے میں پروفیسر عبدالجبار شاکر کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا ایک حربہ دکھائی دیتا ہے۔ رسالہ ''الحمراء'' فروری 2004ء میں شائع ہونے والے بیان سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے سابقہ فیصلہ پر قائم نہ رہے اور اب وہ گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی) لاہور کو مشروط پیشکش کر رہے ہیں۔ وہ عملی طور پر کیا کرتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ہمشیرہ محترمہ انبساط امین عباسی نے ''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا کتب خانہ'' کے عنوان سے ایک مختصر تحریر قلم بند کی ہے جو بنیادی طور پر ان کے ایک سوال پر ڈاکٹر صاحب کے جواب پر محیط ہے۔ یہ بتانے کے بعد کہ معین بھائی کی تحویل میں ایک بہت اچھا قیمتی ذخیرۂ کتب ہے' انہوں نے موصوف سے اپنا سوال درج کیا ہے۔

''۔۔۔کیا لاہور میں ایسی کوئی جگہ یا گوشہ مخصوص نہیں ہو سکتا جہاں' میرے علاوہ بھی اہل ذوق آپ کے علمی سرمائے سے بلا رکاوٹ مستفید و مستفیض ہو سکیں؟ کوئی تجویز یا احساس؟؟''

ان کے مطابق ''معین بھائی کا جواب یہ تھا کہ: میرے بچوں کے اپنے محدودات اور اپنے اپنے میدان ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی لائبریری میں اردو ذخیرے سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد قابل لحاظ نہیں۔ پنجاب یونیورسٹی' لاہور کو اپنا ذخیرۂ کتب منتقل کر دینے میں میرے لیے زیادہ کشش ہے' لیکن اس لائبریری کا عالم' اب یہ ہے کہ وہاں مخطوطات تک کی حفاظت کا خاطر خواہ کوئی انتظام نہیں۔

مجھے لاہور میں عزیز گرامی عبدالجبار شاکر صاحب کی ذات بڑی قابل رشک دکھائی دیتی ہے' جو کتاب اور صاحب کتاب کے سچے قدر دان ہیں اور بہت خوش توفیق اور باعمل بھی۔ انہیں لاہور میں ملتان روڈ پر اپنی لائبریری کے لیے ایک بڑے شاندار علمی و تہذیبی مرکز کی تشکیل و تعمیر میں کامیابی ہوئی ہے۔ میرے ذخیرۂ کتب کے کہیں منتقل کرنے کا سوال' اگر کبھی اٹھا تو شاکر صاحب کی لائبریری میری ترجیح ہوگی۔ وہ اس کے لیے اپنے ہاں کوئی گوشہ نکال بھی پائیں گے' یہ ایک الگ معاملہ ہے۔'' [لاہور' 12 اکتوبر 1999ء]

''دل کی کتاب'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' مرتبہ انبساط امین عباسی' الوقار پبلی کیشنز' لاہور' 2000ء' صفحہ 388-390

ڈاکٹر معین الرحمٰن اچھے خاصے پروپیگنڈسٹ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اصل سے کہیں زیادہ بڑا پروپیگنڈسٹ سمجھتے ہوں گے۔ انہیں اپنی ذات کی حد تک اپنے تناسب سے زیادہ بڑا کر کے چیزوں اور باتوں کو پیش کرنے' دیکھنے کی عادت ہے۔ ان کے پیش کردہ حقائق (مثلاً اپنی تصانیف کی تعداد) واقعات اور باتیں اکثر Inflated ہوتی ہیں۔ اب اس لائبریری ہی کی بات کو لیجیے۔ دنیا بھر میں پروفیسروں کے گھروں پر Working لائبریریاں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ہاں دوسرے ذخیرہ اندوزوں سے سو دو سو

کتابیں زیادہ ہوں گی۔انہوں نے اس کا مختلف دیلوں سے اتنا چرچا کیا ہے کہ اس کا بیان پڑھ پڑھ کر لوگوں کی آنکھیں تھک گئی ہیں اور کان سن سن کر پک گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے شاید انڈیا آفس لائبریری سے بھی بڑا ان کا کتب خانہ ہے۔ یہیں پر بس نہیں ہے۔ کتنے مضمون تو اپنی ہمشیرہ اور ایک شاگرد کے ساتھ مل کر معین الرحمٰن کے کتب خانہ کا گوشۂ سرسید' گوشۂ میرؔ' گوشۂ رشید وغیرہ' معین الرحمٰن کا ذخیرۂ اقبالیات' معین الرحمٰن کا ذخیرۂ غالبیات اور وہ خود ''میرے ذخیرہ غالبیات کے سونئے حوالے۔۔۔ پرانے حوالے' جیسے مضمون لکھتے نہیں تھکتے۔ اگر کبھی کسی گوشہ کی نمائش Manipulate کر لیتے ہیں تو پھر اس کی روداد یں ختم نہیں ہوتیں۔ لوگ تو گیارہویں گریڈ کے سکول ٹیچر سے سنجیدگی' متانت اور ثقاہت کی توقع رکھتے ہیں۔ ہمارے یہ اکیسواں گریڈ پانے والے پروفیسر صاحب اس گریڈ کے ذکر سے نہیں تھکتے تو ہمیں اس دیہاتی کی طرح کہنا پڑتا ہے:

''ایہہ کیوں نہیں دسدے دت پڑھاندے تے چھورای اوناں''

انسان کی فطرت کے بارے میں ایک حقیقت اور سچائی ایسی ہے جیسی سورج کا مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہے اور وہ یہ کہ وہ کرۂ ارض پر سب سے بڑا خونخوار درندہ ہے اور یہ کہ تاریخ میں انسان نے انسان کا جتنا خون بہایا ہے وہ درندوں سے ہزاروں نہیں لاکھوں کے نسبت تناسب سے زیادہ ہے۔ اس اسکیل کے اسباب خود فطرت کے تقاضے ہی سہی مگر مہذب انسان معاشرتی اور اخلاقی سطح پر جس Calousness کا مظاہرہ کرتا ہے۔ محض اس کا خیال دل کو خون کر دیتا ہے۔ معین الرحمٰن صاحب کی توضیحات (''الحمراء'' نومبر 2003ء) صفحہ 21 کا پیرا 5 پڑھتے ہوئے جو خیال یا احساس پیدا ہوتا ہے وہ جراحتِ دل کا باعث بن جاتا ہے۔

موصوف نے میسر وسائل کے منصفانہ مصرف کی بات کی ہے۔ وہ تو الگ سوال ہے اور انہوں نے اپنی ساری سروس میں سرکاری وسائل اور احباب کے ذاتی وسائل کا کیسا ''غیر منصفانہ مصرف'' کیا؟ اس کا جائزہ لیا جائے گا لیکن اس وقت بات ہے ان کی درندگی کے رویے کی۔ ان کا درج ذیل یہ فقرہ کس قدر ان کی سفاکی' بے دردی' بے رحمی' بے حسی اور بغض کا اظہار کرتا ہے دیکھیے' وہ لکھتے ہیں:

''آج جب ڈاکٹر وحید قریشی بسترِ علالت پر تنہائی کا مستقل شکار ہیں۔۔۔ وہ گھر میں اپنی شدید علالت کے باعث کسی بیرونی مدد/ ایکسٹرنل ایڈ (انگریزی میڈیم میں نہ پڑھنے کی ایک خرابی یہ ہے کہ بندے کو اپنی قومی' مادری' دفتری اور تحقیقی زبان کے ناقص ہونے کا Complex نہیں جاتا) کے بغیر اپنے کمرے تک سے باہر نکلنے کے قابل نہیں۔۔۔''

یہ فقرات دلیل ہیں موصوف کی ہماری تاریخی' مذہبی' تہذیبی' اخلاقی' معاشرتی اور ان کلچرل روایات سے ناآشنائی کی جن کے مطابق بیمار پرسی' عیادت' بیمار کی خدمت' اس کے ساتھ ہمدردی' شفقت' گویا

اس کو ہر قسم کی ذہنی روحانی اور جسمانی اذیت اور آزار سے بچانے کو نہایت افضل اعلیٰ اور احسن انسانی فعل اور فرض گردانا گیا ہے۔ کاش سید معین الرحمن اپنے تنگ و تاریک حجلے کے حبس سے نکلے ہوتے انہوں نے دل کی فراخی وسعت نظر اور دماغ کی کشادگی کے لیے ایک آدھ ہی قدم اٹھایا ہوتا تو انہیں معلوم ہو گیا ہوتا کہ متمدن ملکوں اور مہذب قوموں میں Handicaped لوگوں کو کس طرح قومی سطح پر امتیاز اور احترام حاصل ہے؟ اگر آپ نے اپنے گھر میں بزرگ مرحومین اور زندہ افراد کی معذوری اور بے بسی سے اب تک کوئی سبق حاصل نہیں کیا تو ہماری دعا ہے خدا کسی اور تجربے سے آپ کی آنکھیں کھولے۔

اب تک معین الرحمن نے ڈاکٹر وحید قریشی کو کدورت اور نفرت کی نظر سے دیکھا ہے اس لیے وحید قریشی کو تنہائی کا مستقل شکار بتا رہے ہیں۔ وہ جنہیں کبھی محفل اور مجلس نصیب نہ ہوئی تو انہوں نے "گوشہ نشینی" پر ناز کو دھوکے کا ایک روپ بنالیا۔ (یہ ایسی گوشہ نشینی ہے جو یقیناً دوسروں پر خرچ اور علمی بے نقابی سے بچنے کا ایک طریقہ اور ذریعہ ہے۔ گوشہ نشینی کا تصور اور عمل ایک فیاضانہ طرز حیات کا امین رہا ہے۔ گوشہ نشینوں کی فیوض و برکات کے واقعات پڑھیے۔ گوشہ نشین تو ہمیشہ کشادہ جبیں کشادہ دل اور کشادہ دست ہوتا ہے۔)

اگر تعصب اور عناد حواس اور عقل کو معطل نہ کر دے تو انسانی عقل کائنات کے بڑے بڑے مخفی راز دریافت کر لیتی ہے مگر معین الرحمن کی عقل اس ایک بدیہی بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے علاوہ اور کئی دوسرے ذی حیات اکابر کے قیمتی عطیات جی سی لائبریری کے منور گوشے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں: "پروفیسر شپ کے تاج کا وحید قریشی ہی کے سر پر رکھنے میں مخفی حکمت ہے کیا؟ عقل اسے سمجھنے سے عاجز ہے۔"

موصوف نہ تو ڈاکٹر عبدالحمید ڈاکٹر رضی واسطی ملک کریم نواز پروفیسر قیوم نظر اور مظفر علی سید جیسی مرحوم شخصیات کی علمی و ادبی حیثیت سے واقف معلوم ہوتے ہیں نہ انہیں علم ہے کہ ان کے قیمتی کولیکشن بھی گورنمنٹ کالج لائبریری میں آ چکے ہیں۔ ان سب کے ذاتی ذخیرہ ہائے کتب ان کی وفات کے بعد ہی لائبریری کا حصہ بنے۔ صرف ایک شخصیت پروفیسر شاہد حمید نے اپنی ریٹائرمنٹ سے سال چھ مہینے قبل اپنا ذخیرۂ کتب گورنمنٹ کالج لائبریری کو 1985ء میں عطا کیا تھا۔ خدا ان کی زندگی سلامت رکھے۔ ان کے بعد نامور سکالر ڈاکٹر وحید قریشی کا ذخیرہ جی سی لائبریری کی زینت بنا۔ ان کے پروفیسر شپ کی بہت روشن اور کھلی وجہ یہ ہے کہ جب انہیں یہ اعزازی منصب پیش کیا گیا تو نہ صرف جی سی یو بلکہ دوسری یونیورسٹیوں کے کم و بیش ہر شعبے میں بالخصوص شعبہ اردو میں تجربہ کار اور سینئر اساتذہ کا قحط پیدا ہو چکا تھا۔ غالباً ڈاکٹر سہیل احمد خان نے بحیثیت صدر شعبہ ابھی جوائن نہ کیا تھا۔ پیش رو صدر کا دائرہ تحقیق بھی غالب پر شائع شدہ مواد کی اشاریہ سازی اور مطبوعہ مواد کی ترتیب و تدوین تک محدود تھا۔ اس وقت ملک میں اردو اور فارسی تنقید و تحقیق میں ڈاکٹر وحید قریشی کے تجربے اور مرتبے کا مالک کوئی دوسرا نہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر وحید قریشی طویل علالت اور دو تین بیماریوں

کے باعث واقعی صاحب فراش ہیں مگر وہ ان نامور و بے مثال اہلِ عزم و ہمت میں سے ہیں جو صحت کی بنیادوں پر اپنی تحقیقی، علمی اور ادبی کاوشیں ترک نہیں کرتے۔ ان کا ذہن فعال اور یادداشت برسر عمل ہے انہوں نے اس حوصلہ شکن علالت کے دوران ہی ایک نئے علمی و ادبی رسالہ (مخزن) کی اشاعت کا آغاز کیا۔ وہ قائداعظم لائبریری لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والے شش ماہی مخزن کے سات شمارے ایڈٹ کر کے شائع کر چکے ہیں۔ کتنے ہی ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی کے طالب علم ان سے ملاقات، ٹیلیفون اور مراسلت کے ذریعہ راہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ راقم اور اس کے متعدد جونیئر معاصر اپنی علمی مشکلات میں ان سے مدد حاصل کرتے ہیں۔ ادھر جی سی یو شعبہ اردو میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلباء و طالبات کی تعداد میں اضافہ اور سٹاف میں کمی کے پیش نظر ڈاکٹر وحید قریشی جیسے وسیع النظر، وسیع المطالعہ اور وسیع تجربہ والے سکالر سے رابطہ اور ان تک رسائی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ یقیناً یہ ساری Conditions انتظامیہ جی سی یو کے پیش نظر رہی ہوں گی۔

خود موصوف نے ڈاکٹر وحید قریشی سے اپنے اوپر حسد کے الزام کی تردید کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ ''وحید قریشی صاحب سے ''حسد'' کی بات تو وہ سوچے جو ان کے علمی مرتبے اور ذاتی کردار سے ناواقف محض ہو۔'' معین صاحب! یاد رکھیں آپ نے حسب عادت ذاتی کردار کو واوین میں نہیں لکھا۔ اس کا مطلب ہے اس سے مراد ان کا حسن اخلاق ہے جس کے باعث آپ 1965ء سے 2000ء تک برابر ان کی طرف کھنچتے چلے گئے۔

معین الرحمٰن نے اسی طرح کے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے مولانا حامد علی خاں کے خطوط پر توضیحات کے آخر میں ''سور ماراوینز'' سے ایک دلچسپ سوال کیا ہے۔ موصوف نے لکھا ہے:

''اگر میاں والی کالا باغ کے علاقے کے معروف ڈاکو محمد خان اپنی زندگی میں ایک معقول رقم 'جی سی' کو عطا کر دیتے تو کیا ان کے نام نامی کو 'جی سی' سے وابستہ کر لینا اعزازات کا باعث ہوتا یا کوئی اس کا جواز بنتا؟'' حمیت بھی کوئی چیز ہے یا اسے بڑے بڑے ''سورماراوینز'' گھول کر پی گئے ہیں''

(''الحمراء'' نومبر 2003ء صفحہ 22)

متذکرہ سطور کے حوالے سے پہلی بات یہ ہے:

اگر موصوف نے اپنی دانست میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو گالی دی ہے اور اس سے ان کی گیس خارج ہوگئی ہے اور ان کا دل ہلکا ہوگیا ہے تو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے درخواست ہے کہ اسے گوارا کر لیں۔

دوسرے موصوف نے اگر یہ بتایا ہے کہ وہ کیسی اور کن شخصیات کی سوانح عمریاں دلچسپی سے پڑھتے ہیں تو یہ بھی اچھی بات ہے۔ ہمیں موصوف کی دلداری کے لیے جو ان کے ''احوال و آثار'' قلمبند

کرنا ہیں ان کے لیے کہیں سے مواد بھی تو اخذ کرنا ہے۔

تیسرے اس سلسلے میں راقم کا جواب وہی ہوتا جو سرسید نے ایک ایسی ہی صورت حال میں دیا تھا۔

موصوف نے متذکرہ پیرا کے آخری دو فقروں میں ''حمیت'' کا واسطہ دے کر ''سورما راویئز'' کو پکارا ہے اور حمیت گھول کر پینے کا طعنہ دیا ہے۔ اس سے راقم کو 1947ء میں اپنے بچپن کا وہ دن یاد آ گیا جب اس نے جالندھر میں یہ سنا تھا کہ جب امرتسر میں سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تو وہاں کی مسلمان عورتوں نے لاہور کے امن و امان میں شب و روز بسر کرتے ہوئے مسلمان جیالوں کو غیرت و حمیت کا واسطہ دیتے ہوئے انہیں چوڑیاں اور مہندی بھجوائی تھی۔

مگر سورما راویئز معین الرحمٰن کے اکسانے پر ڈاکٹر وحید قریشی پر حملہ کرنے کے لیے جتھہ بندی سے پہلے موصوف سے پوچھیں گے:

ہم اُس وحید قریشی پر حملہ کر کے اپنی حمیت کو جوش میں لائیں جن کے نام 1981ء میں جی سی شعبہ اردو میں بہ حیثیت صدر آتے ہی آپ نے اپنی کتاب ''تحقیق غالب'' کا انتساب کیا تھا۔ پھر 1995ء میں انہیں ایک تقریب میں مہمان خصوصی بنایا تھا۔ بعد میں بھی ان کے نام کتابوں کا انتساب کیا۔ آپ نے اپنی کتابوں پر ان کی آراء چھاپی ہیں بلکہ اپنی شاگردوں سے اپنے بارے میں جو توصیفی مضمون لکھ کر ان سے کتابیں تشکیل دی ہیں ان میں ڈاکٹر وحید قریشی کو Quote کیا گیا ہے۔ ان سب حوالوں سے تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی بہت معتبر' معزز' معظم اور محترم علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ ہم راویئز کو نہیں معلوم جنہیں آپ نے سورما کا لقب ارزانی فرمایا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راویئز کا' یہ Obsolete لقب (سورما) سن کر' دماغ ماؤف ہو جائے گا۔ ''حمیت گھول کر پینا'' کیا خاتونِ خانہ کے انداز کا طعنہ ہے! آپ سمجھتے ہیں کہ ایک دنیا جن راویئز کو ذہانت کا نمونہ قرار دیتی ہے۔ وہ عقل و دانش' ہوش و خرد' شعورِ امتیاز سے اتنے عاری ہیں اور سینئرز کا احترام فراموش کرنے والے ہیں؟ وہ آپ جیسے باہر کے لوگوں (جنہوں نے ابھی جی سی کہنا سیکھا ہے) کے بہکاوے میں آ کر ڈاکٹر وحید قریشی جیسے ممتاز' نمایاں اور بہت سینئر راوین کے ساتھ کوئی گستاخی کرنے کا سوچ بھی سکیں گے؟

ہمارے صاحب موصوف نہیں جانتے کہ دماغ کئی طبی اور طبعی اسباب کی بنا پر Retard ہو جاتا ہے۔ اس سے عقل متاثر ہو کر کند ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تعصب و عناد بھی حواس اور عقل کو معطل کر دیتے ہیں۔ اگر عقل ان عوارض و حادثات سے محفوظ رہ پائے تو انسانی عقل کائنات کے بڑے بڑے مخفی راز دریافت کر لیتی ہے۔ معین الرحمٰن صاحب کی عقل اس ایک بدیہی بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کو گورنمنٹ کالج لاہور میں اعزازی منصب کیوں دیا گیا۔

کیا کیا جائے' عجز فہم کا علاج تو افلاطون کے پاس بھی نہیں رہا ہوگا۔ اس باب میں معین الرحمٰن

صاحب کی کون مدد کر سکتا ہے۔ ایک کوشش کی جا سکتی تھی مگر سب کے محترم حکیم محمد سعید ہی شہید ہو گئے۔ آپ کو گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر وحید قریشی کے Distinguished Professor ہونے کی بہت روشن اور کھلی وجہ نظر نہیں آتی۔ نظر بھی کیسے آئے' آپ اپنے چشمے کا نمبر ہی نہیں بدلتے۔ آپ امریکہ سے اپنی شاگردہ کے بھجوائے ہوئے Blinds پہننے سے رک سکیں تو آپ کو نظر آئے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کو گورنمنٹ کالج میں یہ اعزازی منصب کیوں پیش کیا گیا۔ اس وقت ملک خصوصاً (ملک کے اس حصہ میں) اردو اور فارسی تنقید و تحقیق اور تدریس میں ڈاکٹر وحید قریشی کے برابر تجربے اور مرتبے کا مالک کوئی دوسرا نہیں۔ وہ ممتاز اور سینئر موسٹ راوین کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج کے مایہ ناز سپوت ہیں۔ گورنمنٹ کالج سے ان کا محض انسلاک اور نسبت ہی قدیم وجدید راوینز کے لیے سرمایہ فخر ہے۔

ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو کے ریسرچ سکالرز جو تحقیق میں مصروف ہیں یا تحقیق کے لیے رجسٹر ہو رہے ہیں ان کی بدقسمتی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی طویل علالت اور بیک وقت تین چار بیماریوں کے باعث صاحب فراش ہیں مگر وہ نہایت حوصلہ مندی اور بہادری سے اپنی بیماریوں اور تکلیفوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایسے جگر دار آدمی پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔ نہ انہوں نے خود اخبارات میں رحم کی اپیل شائع کروائی ہے۔ وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن سے یکسر مختلف آدمی ہیں۔ معین الرحمٰن صاحب یرقان کی شکایت پر تین دن کے لیے جیل روڈ پر عمر کارڈیک کلینک میں داخل ہوئے تو بال بال کر اٹھے۔ جناب مشفق خواجہ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بچے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ خواجہ صاحب اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے ''مسروقہ دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ'' کے خلاف ڈاکٹر تحسین فراقی کی علمی و تحقیقی مہم کو رکوا دیتے تو یہ ''حادثہ'' پیش نہ آتا۔ جناب مشفق خواجہ نے ڈاکٹر تحسین فراقی سے انسانی بنیادوں پر اپیل کی۔ یہ خواجہ صاحب کا احترام تھا یا پروفیسر فراقی کی انسانیت سے ہمدردی اور ان کی انسان دوستی کہ انہوں نے ''مسروقہ دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ پر محاکماتی تحقیق و تنقید کے مجموعہ'' محاکمہ'' کی دوسری جلد شائع نہ کی۔ مگر ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے آنسو خشک نہ ہونے دیے اور معروضی حقائق کو فراموش کرتے ہوئے ہر طرف محاذ آرائی شروع کر دی۔ کاش وہ قانون فطرت سمجھ لیں کہ ہر گریڈ کے ہر ملازم کو ایک دن ریٹائر ہونا ہے [مگر ڈاکٹر معین الرحمٰن اس حقیقت اور امر واقعہ کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ وہ بہر طور گورنمنٹ کالج میں رہنا چاہتے ہیں۔ اس کا برملا اظہار ہی نہیں کرتے' اس کے لیے کوشاں بھی رہے۔ اس کا ایک اور ثبوت ان کا وہ خط ہے جو انہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ سے دو یوم قبل سرکلر کی صورت میں ممتاز شخصیات خصوصاً ''گورنمنٹ کالج کے بورڈ آف گورنرز کے ارکان کو ارسال کیا۔ دیکھیے: نذر معین مرتبہ محمد سعید' الوقار لاہور 2003ء' صفحہ 28،25،22]
وہ یہ بات فراموش کرنا چاہتے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی آپ کی پوزیشن بدل جاتی ہے۔ آپ کو قدم قدم پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ آپ کے اپنے سایہ نے بھی دن میں کئی بار آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کو اپنی سنگ دلی پر بہت اعتماد ہے یا وہ وقوعات کو دیکھنے کی بصارت اور معلوماتی و علمی بصیرت سے محروم ہیں۔ وہ اکیسویں صدی میں کس "سائنسی طرزِ فکر" کی بات کر رہے ہیں؟ اگر یورپ و امریکہ میں درد مندوں کی سوشل ورک مصروفیات اور سائنسی معلومات میں دلچسپی رکھنے والے کسی بچے کی نظر مولانا حامد علی خاں کے خط پر ان کے وضاحتی نوٹ کی درج ذیل دو سطروں پر ٹھہر جائے تو وہ یہ ماننے سے انکار کر دے گا کہ اس کے مصنف گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے 21 ویں گریڈ میں ریٹائر ہونے والے پروفیسر ہیں، جنھوں نے پروفیسر ایمریطس بننے کے لیے سر توڑ کوشش کی۔ اوپر جن کی طرف اشارہ ہوا وہ دو سطریں دیکھیے:

"وہ اپنے گھر میں اپنی شدید علالت کے باعث کسی بیرونی مدد / ایکسٹرنل ایڈ کے بغیر اپنے کمرے تک سے باہر نکلنے کے قابل نہیں۔۔۔۔"

("الحمراء" نومبر 2003ء ص 21)

پاکستان سے vacation کے لیے گیا ہوا وہ بچہ جو نیو جرسی میں اپنے انکل اور آنٹی کی ہر شام کی مصروفیات میں شریک رہا ہے۔ جو اپنی جاب سے لوٹتے ہی اپنے پڑوس میں تنہائی کے شکار بیمار اور بوڑھے پڑوسیوں کے دل بہلانے کے لیے تحائف اور پھول لے کر جاتے ہیں اور طرح طرح سے ان بوڑھوں اور بیماروں کی دل جوئی کرتے ہوئے دیکھتا ہے، یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اس کے انکل اور آنٹی کتنے بیوقوف ہیں کیونکہ وطن میں ان کے پروفیسر ایمریطس کے منصب کے لیے کوشاں ایک ریٹائرڈ استاد "بستر علالت پر تنہائی کے شکار" دوسرے بزرگ استاد کو تنہائی کے طعنے دیتے ہیں۔

دوسری طرف وہ یہ سوچ کر شاید خوش بھی ہو کہ اس کے دیس کے پروفیسروں کو کتنی ذہنی فراغت ہے کہ ان کے دماغوں پر ایسی معلومات کا بوجھ ہی نہیں ہے کہ معذور مریضوں کے لیے ایکسٹرنل ایڈ کے جو سینکڑوں آلات ایجاد کر لیے گئے ہیں، ان کے بارے میں معلومات رکھنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں وہ بیکار گردانتے ہیں۔ اُس کو خیال آتا ہے کیوں نہ وہ پروفیسر صاحب کو مشورہ دے کہ وہ "غالب کی تاریخ ولادت" پر تحقیق کے وقت جو پڑھنے کی عینک استعمال کرتے ہیں، اسے وہ ڈسٹ بن میں پھینک دیں اور وہ دادا کی Hearing Aid گٹر میں کیوں نہ ڈال دے جو اسے صبح شام دادا کے لیے تلاش کرنی پڑتی ہے اور پروفیسر صاحب کہتے ہیں ایکسٹرنل ایڈ بری چیز ہے کیونکہ وہ ایک Handicaped انسان کی معذوری کا فی حد تک ختم کر دیتی ہے۔

کاش سید معین الرحمٰن بی اے پاس کرنے کراچی نہ گئے ہوتے، وہاں مولوی عبدالحق کے عشق میں گرفتار ہو کر خراب تو نہ ہوتے۔ لاہور میں دوبارہ واحد شوز کمپنی انارکلی آجاتے وہ انہیں ایم اے او کالج لاہور میں داخل کروا دیتے جہاں وہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کے عشق میں مبتلا ہو کر منطق تو سیکھ لیتے اور منطق

سے عاری مندرجہ ذیل اقتباس نہ لکھتے۔

''مجھ سمیت یہ بات بہتوں کے علم میں ہے کہ وہ (قریشی صاحب) برسوں اپنے کتب خانے کو فروخت کردینے کی فکر اور کوشش میں لگے رہے لیکن وفاقی اور جامعاتی سطح پر ان کی کوئی کوشش' ان کے حسب خواہ' سرے نہ چڑھی۔۔۔''

معین الرحمٰن کو اعتراض کیا ہے؟ سیدھی بات ہے جس کے پاس جو چیز قابل فروخت ہے اسی کو تو وہ فروخت کردینے کی فکر اور کوشش میں لگا رہے گا۔

راقم کے بھی علم میں ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کو آفر 25 / 24 لاکھ روپے تک پہنچ گئی تھی مگر انہوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ مجھے یہ اطلاع میرے اس دوست نے دی ہے جو اسی پارٹی کے ہاتھ ڈھائی تین لاکھ روپے میں میری کولیکشن فروخت کروا چکے تھے۔ انہوں نے دو تین دوسری کولیکشنز بھی اس پارٹی کو دلائی تھیں۔ اس طرح کے سودوں میں اگر فروخت کنندہ ڈن کرنے پر تلا ہو تو کسی لمحے بھی 23' 24' 25 لاکھ پر سودا طے ہوجاتا ہے۔ مگر مڈل مین نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی ان پر خفا ہوئے اور کہا کہ آپ کتاب کی قدر، قیمت نہیں جانتے۔ خیر وہ بیس لاکھ سے ڈیفنس فیز فائیو میں ایک پلاٹ خرید سکتے تھے۔ جس کی قیمت ان دنوں سوا کروڑ روپے ہوگئی ہے۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرتے کہ بہت پہلے انہوں نے ذہنی طور پر اپنا ذخیرۂ کتب گورنمنٹ کالج لائبریری کو عطیہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے عطیہ کرنے والے پروفیسر شاہد حمید کے بعد دوسرے اسکالر ہیں۔

پاکستان سے اپنے انکل کے پاس چھٹیاں گزارنے گیا ہوا وہ بچہ ایک کتاب Biographies of Handicapped People بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن کو بھجوانا چاہتا ہے کہ وہ اس میں (لوئی بریل Louis Braille) (ہیلن کیلر Helen Keller)' (سٹیفن ہاکنگ Stephen Hawking)' آسٹروونگی اور طٰہٰ حسین جیسے اہل عزم و ہمت کی زندگیوں کے ایمان افروز واقعات پڑھ لیں جنہوں نے انتہائی معذوری کی حالت میں بھی محیر العقول کارنامے انجام دیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی بھی ایسے ہی عالی ہمت انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی شدید ترین علالت اور متعدد آپریشنوں کو بھی اپنے علمی اور تحقیقی کاموں میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ انہوں نے اپنی شدید علالت کے باوجود شش ماہی ''مخزن'' لاہور (مجلّہ قائداعظم لائبریری لاہور) کے اب تک سات شمارے مرتب کرکے شائع کیے جو معین الرحمٰن کے ''تحقیق نامہ'' کے کئی شماروں سے مواد او رترتیب کے لحاظ سے بہتر ہیں۔ ''تحقیق نامہ'' شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کا ریسرچ جرنل ہے جسے بحیثیت صدر شعبہ معین الرحمٰن نے اپنی قابل رشک صحت اور تازہ توانائی کے زمانے میں مرتب اور شائع کیا تھا۔ مجھ سے اتفاق نہ ہو تو اپنے کسی غیر جانب دار صائب الرائے اسکالر سے مقابلہ کروا لیجیے۔

ایک زمانے میں ڈاکٹر وحید قریشی کے سب سے بڑے معترف اور ان کے نام انتسابات رقم

کرنے والے اُن کی ذات سے بے شمار فائدے اٹھانے والے ڈاکٹر معین الرحمٰن اُن کی شخصیت کے ہر پہلو کا "الحمراء" میں انکار کررہے ہیں۔ امیر شریعت حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک موقع پر ارشاد کیا تھا کہ:

"انسان عجیب الخلقت واقع ہوا ہے۔ جب انکار پر آجاتا ہے تو اپنے پروردگار کی ہستی تک کا انکار کردیتا ہے اور پرستش پر آجائے تو اپنے ہاتھوں سے تراشیدہ پتھر کی مورتیوں کی پوجا کرنے لگتا ہے۔"

معین الرحمٰن نے ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت کا تو کاملاً انکار کردیا مگر سوال یہ ہے وہ خود پرستش کس کی کرتے ہیں؟

"سید وقار عظیم مرحوم کی؟"

"وقار عظیم گولڈ میڈل کے لیے جمع کرائے گئے ڈیڑھ لاکھ روپے کا دل پر جب تک چھالا ہے وہ ممکن نہیں"

"پھر؟" "وہ کس کی پوجا کریں گے"

اپنی شاگرد (نائلہ انجم) کے نام سے موصوف کی مرتبہ کتاب "سید معین الرحمٰن (شخص اور عکس)" سے اندازہ ہوتا ہے وہ آئینے کی پوجا کرتے ہیں۔

تعصب' بغض اور کدورت ایسے مسموم جذبے ہیں جو سب سے پہلے ان جذبوں کے مالک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ہم اختصار کی غرض سے وضاحت کی بجائے مثال سے یہ بات سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ بیسویں صدی کی ایک جامع کمالات اور جامع علوم شخصیت ہیں۔ وہ عربی' فارسی' اردو اور انگریزی کے قدیم و جدید ادب میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ اردو تحقیق و تنقید میں ان کے کارنامے یادگار ہیں۔ اردو میں میر' غالب' اقبال' سرسید اور ان کے رفقاء کے خصوصی مطالعات اُن سے منسوب ہیں۔ اردو کو قومی زبان کے طور پر تعلیمی سطح پر لازم قرار دلوانے اور عوامی سطح پر اسے مقبول بنانے کے لیے ان کی مساعی جلیلہ و جمیلہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے شاگردوں کی کئی نسلوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں اردو اور قدیم مشرقی زبانوں کا اُن جیسا کامیاب اور عظیم المرتبت استاد شاید اب پیدا نہ ہو۔

معین الرحمٰن ایک بے بنیاد ذاتی عناد کو ایمان کا درجہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ کی ہر حیثیت کے منکر بنے بیٹھے ہیں اور اپنی دانست میں ان کی شخصیت کے انہدام کی مہم چلا رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی ڈپلومہ ہولڈر آرکی ٹیکٹ کا ایک ڈرافٹسمین تاج محل کی فنی عظمت کا اپنے سر کے ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ انکار کرتے ہوئے کہے: "اس میں کیا ہے؟" کچھ ایسا ہی حال اردو تحقیق کے [illegible] فٹسمین کا ہے۔

معین الرحمٰن نے 1981ء میں اپنی کتاب "تحقیقِ غالب" کا انتساب تحقیق کے دبستان لاہور کے تین زمانوں کے نمائندہ محققین کے نام مندرجہ ذیل انداز میں کیا ہے:

ماضی: حافظ محمود شیرانی' مولوی محمد شفیع' پروفیسر سید وقار عظیم

حال: ڈاکٹر وحید قریشی

مستقبل: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور محمد اکرام چغتائی

[چونکہ وہ اپنے تازہ تعلقات کے حوالے سے حال اور مستقبل کے مذکور محققین کے نام نکالنا چاہتے تھے، انہوں نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ 1998ء میں ماضی کے بزرگ ترین محققین کے نام بھی قلم زد کر دیے اور پورا انتساب اپنے چار بھائیوں کے نام کر دیا۔ خس کم جہاں پاک' نہ تحقیق کا دبستان لاہور رہا اور نہ اُس کے نمائندہ محققین]

یہ تو تھی جملہ معترضہ کی وضاحتی وادین، ہمیں دکھانا یہ مقصود تھا کہ معین الرحمٰن نے 1981ء کے اپنے پہلے ایڈیشن پر انتساب میں سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا نام خارج کر کے یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے اردو تحقیق و تنقید کی تاریخ میں سے ہمیشہ کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ کا نام ERASE کر دیا۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ سید صاحب جیسے بلند پایہ لوگوں کے رف کام بھی Indelible ink سے لکھے ہوتے ہیں۔ سید معین الرحمٰن اُس نام کو مٹانے کے لیے کوشاں ہیں جس کو ہر نسل مکرر لکھے گی۔

معین الرحمٰن کو سید عبداللہ کے خلاف شکایت یہ ہے کہ سید عبداللہ نے انہیں مولوی عبدالحق پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی اجازت نہ دی۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے کراچی اور پھر لاہور سے بابائے اردو کی شخصیت اور خدمات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی آرزو اور کوشش کی لیکن کراچی یونیورسٹی میں موضوعِ تحقیق (بابائے اردو مولوی عبدالحق) اور پنجاب یونیورسٹی میں امیدوارِ تحقیق (یہ خاکسار سید معین الرحمٰن) اصحاب مجاز کے لیے ناپسندیدہ اور معتوب ٹھہرا اور مجھے دوسرے موضوعات کی طرف نکل جانا پڑا۔۔۔ 1965ء میں پروفیسر سید وقار عظیم کی توجہ سے مجھے شعبہ اردو (پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور) میں بطور لیکچرار کام کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ یہاں بھی بوجوہ میں اجازت کار سے محروم رہا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے سامنے وقار عظیم صاحب کی کچھ پیش نہ چلی اور مجھے بہ حسرت و یاس مولوی عبدالحق پر یا کسی بھی دوسرے موضوع پر پنجاب یونیورسٹی سے کوئی رسمی سندِ تحقیق حاصل کرنے کے خیال سے دست کش ہونا پڑا۔''

[مضمون: میرا پہلا عشق پہلی ترجیح— مولوی عبدالحق (تحریر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) مطبوعہ ماہنامہ ''ماہِ نو'' لاہور' جنوری 2003ء' صفحہ 28' 29]

معلوم ہوتا ہے معین الرحمٰن کا متذکرہ بالا مضمون ایک دو بار پہلے بھی کسی جگہ چھپ چکا ہے۔ بہر حال وہ سید معراج نیر کے مطبوعہ امتحانی مقالہ پی ایچ ڈی کے تعارف بعنوان ''حرفے چند'' میں درج ذیل سطور دہراتے ہیں:

''۔۔۔میں نے کراچی اور پھر۔۔۔نکل جانا پڑا۔''

[ڈاکٹر سید معراج نیر' بابائے اردو' ڈاکٹر مولوی عبدالحق فن اور شخصیت' لاہور' ابلاغ ' اکتوبر 1995ء صفحہ 9]

سوچیے 5 درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ["نوائے وقت" راولپنڈی 25 مئی 2004ء] کو کتنا Prolific Writer ہونا چاہیے مگر وہ اگلی بار یہ تین چار جملے بدل کر مدعا بیان نہیں کر سکتا۔ دیکھیے وہ پروفیسر تنویر حسین کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں پھر تکرار کرتے ہیں

"۔۔۔میں نے کراچی اور پھر لاہور۔۔۔کی طرف نکل جانا پڑا"

[دل کی کتاب از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مرتبہ انبساط ارشن عباسی' لاہور' الوقار پبلی کیشنز' صفحہ 294]

تبصرہ: (21 گریڈ میں ریٹائر ہونے والا پروفیسر اور 5 درجن کتابوں کا مصنف' ایسوسی ایٹ پروفیسران کی ہمشیرہ مرتب: 400 صفحات کی کتاب جن میں سے 255 صفحات کئی لوگوں کے ساتھ انٹرویوز پر مشتمل ہیں۔ [کیا یہ انٹرویوز ڈاکٹر معین الرحمٰن نے بحیثیت مصنف قلم بند کیے ہیں؟] اس کتاب کے باہر اور اندر ٹائٹل پر کتاب کے نام کے بعد یہ لوگ از معین الرحمٰن لکھیں' انھیں معلوم تو ہونا چاہیے کہ "از" کا فارسی لفظ مصنف کو Indicate کرتا ہے اور انگریزی By کا قائم مقام ہے' غالباً انگریزی کی تقلید میں ہی یہاں مروج ہوا۔ عموماً مصنف کے ساتھ مرتب ہوتا تو نہیں ہے' مگر ہو بھی سکتا ہے اگر اس نے مصنف کے حصہ کا کوئی کام کیا ہو۔ یا پھر مصنف کی CV کے نقطۂ نظر سے لکھا جا سکتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے مرتب ہوتے ہیں۔ "باغ و بہار" از میر امن دہلوی کے مرتب رشید حسن خاں ہیں۔ کلاسیکی مصنفین کے متون کے مرتب تو دیکھے اور سنے ہیں۔ بہر حال سید معین الرحمٰن کی ایک اور کتاب "بر سبیل غالب" میں بھی "از" اور "مرتب" کی یہی کیفیت ہے)

بر سبیل غالب: از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: مرتبہ وقار معین' لاہور' الوقار پبلی کیشنز' ستمبر 2000ء

یاد رہے اس کتاب کے ٹائٹل کے علاوہ ڈاکٹر معین الرحمٰن سے پہلے "از" اور وقار معین کے نام سے پہلے "مرتبہ" مختلف حوالوں اور فہرستوں میں برابر چھپ رہا ہے مثلاً

1۔ "میرے ذخیرۂ غالب کے سونئے حوالے (مضمون معین الرحمٰن) قومی زبان کراچی' فروری 2004ء"

2۔ الوقار پبلی کیشنز کی اہم مطبوعات (منسلکہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور کائنات غالب از: پروفیسر نیر پرویز' لاہور' 2002ء صفحہ 254)

ڈاکٹر معین الرحمٰن اپنے آپ کو جس طرح ایک عظیم محقق' ماہر تعلیم اور مصنف پوز کرتے ہیں' اپنے بارے میں دوسروں کے نام پر کتابیں مرتب کرتے ہیں یا شاگردوں سے لکھواتے ہیں۔ اُن کے مطابق معلوم ہوتا ہے مولوی عبدالحق' قاضی عبدالودود' فرمان فتح پوری اور رشید حسن خاں وغیرہ نے ان موصوف کے مقابلے میں بس خاک ہی اڑائی ہے۔ فوری حوالہ کے لیے درج ذیل کتاب کے عنوان کی داد دیجیے:

[''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور کائناتِ غالب'']

ایسی شان کجکلاہی رکھنے والا محقق ملنے والی ہر افتادہ تحریر کو اپنی ناموری کے لیے شائع کراتا رہے۔ عجیب تو ہے ہی غریب بھی دکھائی دیتا ہے۔ سرِدست درج ذیل دو حوالے دیکھیے:

1۔ ''مہمان'' رشید احمد صدیقی کی ایک کمیاب تحریر۔ متعارفہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ ماہنامہ ''الحمراء'' لاہور' فروری 2004ء صفحہ 17 [کچھ وقت گزرنے کے بعد ہر تحریر کمیاب تو ضرور ہوگی۔ ہمیں تو آج تک ''الحمراء'' کا شمارہ نومبر 2003ء نہیں ملا۔]

2۔ ''جیت'' (راجندر ناتھ ٹیگور کے افسانے کا ترجمہ) مالک رام بی۔اے

متعارفہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ماہنامہ ''الحمراء'' لاہور' مئی 2004ء صفحہ 8

معین الرحمٰن کے اس قسم کے متعارفہ اور اُس قسم کے کئی متعارفات سے اگر کسی کو دلچسپی ہو تو وہ تلاش کرلے اور ان سے پوچھ لے کیا حضور ان متعارفات کے ذریعہ دُنیائے ادب میں باقی رہنے کی سعی فرما رہے ہیں؟ ہمیں تو سید معین الرحمٰن نے بہ حیثیت صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور 23 مارچ 1981ء کو یہ بتایا تھا:

> ''ادب میں ''باقی'' رہنے کی فکر سے زیادہ ''تازہ'' رہنے کے شوقِ بے مہار کو میں ادب یا ادیب کے لیے نیک فال نہیں جانتا''
>
> (معین الرحمٰن ''تحقیقِ غالب'' کراچی اردو اکیڈمی سندھ' طبع اول 1981ء)

اب معین الرحمٰن اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر کہیں کہ ان کے محاورۂ روزانہ چھپنے والے متعارفہ اور متعارفات' ادب میں باقی رہنے کی یا ادب میں تازہ رہنے میں سے کس کی فکر کا نتیجہ ہیں؟

ہمیں یقین ہے انہیں ادب میں ''باقی'' رہنے کی خوش فہمی یقیناً نہیں ہے۔ وہ ''تازہ'' رہنے کی فکر کرتے ہیں۔ انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان کی یہ فکر کتنی نیک فال ثابت ہوئی ہے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کی نگرانی میں کام کرنے والے ان کی ''دادیتی تحقیق'' کے انداز کو اپنا چکے ہیں۔

خیر ذکر تھا کراچی یونیورسٹی میں موضوعِ تحقیق اور لاہور میں سید معین الرحمٰن کے ناپسندیدہ قرار پانے اور معتوب ٹھہرنے کا۔ چلیے کراچی سے یہ موضوع منظور نہ ہونے کی بات سمجھ میں آگئی کیوں کہ اس کا طویل اور پرانا پس منظر یہ ہے کہ غالباً بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک آسامی نکلی جس کے لیے دو امیدوار (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور آل احمد سرور) تھے۔ اس کیس میں ایک ایکسپرٹ مولوی عبدالحق تھے۔ جب فیصلہ کی رپورٹیں آئیں تو اس میں پی ایچ ڈی امیدوار کامیاب نہ قرار دیا گیا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی میں امیدوار تحقیق (خاکسار معین الرحمٰن) ناپسندیدہ اور معتوب کیوں ٹھہرا۔ اور سید وقار عظیم کی پرزور سفارش کے باوجود ڈاکٹر سید عبداللہ تحقیق کی منظوری دینے پر کیوں رضامند نہ ہوئے جبکہ راقم کا مشاہدہ ہے کہ وقار عظیم مرحوم ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم سے ہر ہونا انہونا کام کروالیا کرتے تھے اور سید وقار عظیم مرحوم نے اس کو اپنا دردِ دل کیوں بنالیا تھا۔ یہ وہ Pertinent سوال ہیں جو راز بن گئے ہیں۔

علاوہ ازیں سید عبداللہ اور سید معین الرحمٰن کے درمیان باہمی مسابقت اور چپقلش کا کوئی بے حد معمولی اور غیر اہم ثبوت نظر نہیں آتا۔ ایسا موقع آ بھی کیسے سکتا تھا۔ بہاول نگر میں 1957ء میں معین الرحمٰن کے میٹرک کرنے سے گیارہ بارہ برس قبل ڈاکٹر سید عبداللہ 1948ء میں شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کے صدر تھے اور بقول خواجہ محمد سعید اور معین الرحمٰن ان دونوں کے ہیرو پطرس بخاری کی گورنمنٹ کالج میں ایم اے اردو کی کلاسز کے اجراء کی کوششوں میں ناقابل عبور رکاوٹ بنے کھڑے تھے۔ 1961ء میں معین الرحمٰن اردو کالج کراچی میں بی۔اے کے طالب علم تھے تو یہاں پنجاب یونیورسٹی میں انیس ناگی نے ایم اے اردو میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اسی طرح 1962ء میں معین الرحمٰن کراچی میں ابھی بی اے نہیں ہوئے تھے اور یہاں خواجہ محمد زکریا نے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے آگے جا کر ریکارڈ قائم کیا تھا۔ محمد اسلم انصاری' خالدہ اصغر' انور محمود خالد' عابد صدیق سوز اور کئی لوگوں نے فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ معین الرحمٰن کو 1963ء میں ایم اے پاس کر لینا چاہیے تھا جو نہیں کیا۔ اسی سال یہاں ایم اے اردو میں مس ندرت شبنم نے ٹاپ کیا۔ انوار انجم' ملک حسن اختر' ڈاکٹر اے بی اشرف' اختری بیگم عبدالرحمان شاکر' الیس اعظمی اور بعض دوسروں نے فرسٹ ڈویژن لی۔ اگرچہ میجر محمد خان اشرف نے امتحان میں سیکنڈ ڈویژن لی مگر 1967ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کی لسٹ کی ٹاپ پر تھے۔ کہا جاتا ہے اس سال کمیشن میں دو اڑھائی سو امیدواروں کے انٹرویوز میں معین الرحمٰن کامیاب نہ ہو سکے۔ 1963ء کے سال میں ریاض احمد ریاض نے سیکنڈ ڈویژن لی جنہوں نے بعد ازاں اپنے مقالہ پی ایچ ڈی "ابن انشاء احوال و آثار" اور سفرنامہ بعنوان "بر سبیل سفر" کی بناء پر شہرت پائی۔ مشہور شاعر سلیم بیتاب نے بھی سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ 1964ء میں تبسم کاشمیری نے فرسٹ ڈویژن اور سیکنڈ پوزیشن' احمد عقیل روبی اور چند دوسرے لوگوں نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ راقم اور نئی شاعری کے مشہور شاعر نسیم بخاری نے دانشوری کے زعم اور بہانہ سے دوسرے پرچہ کے بعد امتحان چھوڑ دیا۔ انہیں کے ساتھ محمد اکرام چغتائی نے لی تو سیکنڈ ڈویژن لیکن بعد ازاں تحقیق میں عالمی سطح پر شہرت حاصل کی۔

متذکرہ بالا ناموں میں ہر فرسٹ ڈویژن لینے والا فرد اس کا استحقاق رکھتا تھا کہ اسے یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر وظیفہ دیا جائے یا پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹر کیا جائے مگر سید عبداللہ سمجھتے تھے کہ انہیں ڈاکٹریٹ سے پہلے مناسب تجربہ اور کافی مطالعہ بہم پہنچانا چاہیے۔

معین الرحمٰن کراچی سے 1964ء میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر سیکنڈ ڈویژن میں ایم اے

اردو کر کے اپنے گھر واپس آ گئے۔ وہاں ان کے انٹر کے زمانے کے استاد پرنسپل تھے انہوں نے D.O لکھ کر سید معین الرحمٰن کو عارضی لیکچرار کی پوسٹ پر تعینات کروالیا۔ راقم بھی پانچ سو حضرات کے ساتھ دس پندرہ سال عارضی لیکچرار رہا۔ 1965ء میں سید عبداللہ نے استعفیٰ دے دیا اور وقار عظیم شعبہ اردو کے صدر ہو گئے جنہوں نے معین الرحمٰن ایم اے سیکنڈ ڈویژن کو حمید احمد خاں وائس چانسلر سے سفارش کر کے شعبہ اردو میں چھ ماہ کے لیے عارضی ملازمت دلوادی۔ ایک تو یونیورسٹی کیلنڈر کے مطابق یونیورسٹی کے ہر شعبہ میں لیکچرار کے لیے فرسٹ ڈویژن کی شرط ہے۔ متذکرہ بالا افراد میں سے زیادہ تر معین الرحمٰن کو دی جانے والی آسامی کے لیے موزوں اور مناسب تھے۔ چلیے اقربا پروری' سفارش اور دھاندلی کے اس دور میں جواب تک چل رہا ہے' کسی حقدار کو حق نہ ملنے پایا' جس ملک میں حمید احمد خاں اور وقار عظیم کے مرتبہ کے لوگ بھی Mediocrity کی سرپرستی کرتے تھے' وہاں یہی کچھ ہونا چاہیے تھا جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ پھر اس مسئلہ کو اور پہلو سے بھی دیکھیے:

اول تو ڈاکٹر سید عبداللہ اور معین الرحمٰن کے درمیان 1964ء'65 میں کسی قسم کے Interaction کے کسی موقع کی صورت ہی نہیں ہو سکتی تھی دوسرے اس زمانے میں جب پی ایچ ڈی کی توقیر تھی' اس کی ایسی ارزانی نہ ہوئی تھی' علمی معیار میں ایسی پستی نہ آئی تھی' سید عبداللہ' معین الرحمٰن کو پی ایچ ڈی کے لیے کس طرح رجسٹر کر سکتے تھے جو میٹرک' ایف اے' بی اے اور ایم اے میں سے دو میں تھرڈ ڈویژن اور دو میں سیکنڈ ڈویژن رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ صدر شعبہ کی صوابدید ہوتی ہے جسے وہ اپنے ہر فیصلہ میں بروئے کار لاتا ہے۔ شاید اس موقع پر راقم کا اپنا ایک واقعہ وضاحت کر سکے۔

میں سٹوڈنٹس یونین اورینٹل کالج کا ایک سال جوائنٹ سیکرٹری اور دو برس جنرل سیکرٹری رہا۔ سید وقار عظیم یونین انچارج تھے۔ 1965ء میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں۔ رولز کے مطابق ہاسٹل خالی کروالیے گئے۔ میرا ابھی ایم اے کا تھیسس (''بال جبریل'' تنقیدی مطالعہ) زیر تکمیل تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے مجھے ڈیڑھ دو ماہ تھیسس کے نام پر بھی ہاسٹل میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی۔ میں پریشان ہو کر کوئی لاج ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' خواجہ محمد زکریا' ممتاز منگلوری اور چودھری حمید ہر شام چوک سمن آباد میں چائے پر گپ کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک دن خواجہ محمد زکریا نے برسبیل تذکرہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سے میری پریشانی کا ذکر کیا۔ ان کی پیشکش پر میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی اردو نگر (موڑ سمن آباد) میں ان کے دفتری کمرے میں تھیسس کی تکمیل کے لیے قیام پذیر ہوا۔ سید وقار عظیم مرحوم میرے ایم اے کے مقالہ کے گائیڈ تھے۔ ان پر دمہ کا زبردست حملہ ہوا تھا۔ ابھی ابھی آکسیجن ٹینٹ سے نکلے تھے۔ وہ بیٹھ کر میرا مقالہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے لیٹے لیٹے میرے مقالے کا ایک ایک لفظ سنا۔ چند ایک مقامات پر انہوں نے فقروں میں ترمیم تجویز کی اور مقالہ ٹائپ کروانے کی اجازت دے دی۔ ان

چھٹیوں کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ نے استعفیٰ دے دیا مگر وہ ابھی فارغ نہ ہوئے تھے۔ ضیاء شاہد یونین کے نائب صدر اور حمید قریشی جنرل سیکرٹری تھے۔ ہم طلباء نے تین چار جلوس نکال کر مطالبہ کیا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا استعفیٰ منظور نہ کیا جائے۔ انہی دنوں میں میوزیم آڈیٹوریم میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی اردو تحریک کے سلسلہ کا ایک جلسہ تھا۔ اُس کی صدارت جسٹس ایس اے رحمٰن نے کی۔ جلسہ کے بعد میری قیادت میں طلباء کے ایک وفد نے جسٹس صاحب سے مل کر درخواست کی کہ وہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ میں اپنی حیثیت اور وائس چانسلر حمید احمد خاں کو اپنی دوستی کے حوالے سے قائل کریں کہ وہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا استعفیٰ منظور نہ کریں۔ جسٹس صاحب نے کہا میری خود ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب سے گفتگو ہو چکی ہے۔ وہ استعفیٰ واپس لینے پر تیار نہیں لہذا مجبوری ہے۔

سید وقار عظیم نے صدر شعبہ اردو کا چارج لے لیا۔ مہینہ دو مہینہ بعد ان کی صدارت میں ایم اے اردو کے Vivas شروع ہو گئے۔ میں اپنی باری پر ان کے دفتر میں حاضر ہوا۔ وہاں صدر شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی پروفیسر محمد طاہر فاروقی کو موجود پایا۔ [چند ماہ قبل Students Excursion Tour پر پشاور میں ہمارا تین چار روز قیام ہوا تو ان سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ اس حوالے سے وہ مجھے جانتے تھے۔ میں نے دونوں اساتذہ کو سلام کیا اور امیدوار کی نشست پر بیٹھ گیا۔ وقار صاحب نے ان سے مجھے Viva کرنے کے لیے کہا۔ طاہر فاروقی صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے شاباش دی اور سید وقار عظیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''بہت اچھا اور معیاری مقالہ ہے۔'' پھر مجھ سے پوچھا: ''آپ کے ہاں امتحانی مقالات چھپتے نہیں؟'' میں نے عرض کیا: ''اگر معیاری ہوں تو چھپ بھی جاتے ہیں۔'' انہوں نے فرمایا: ''آپ کے مقالہ کی اشاعت مفید ہوگی۔ اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔'' اس کے بعد انہوں نے اقبال پر مشہور لسانی اعتراض بصورت سوال پوچھا کہ ''تو ڑ دی پرہیز'' کہنا جائز ہے یا نہیں؟ غالباً میں نے بہت واضح جواب نہ دیا تھا۔ فاروقی صاحب نے وقار صاحب سے پوچھا ان سے پہلے کتنے کتنے نمبر دیے جا چکے ہیں؟ وقار صاحب نے شاید 85 نمبر بتائے۔ فاروقی صاحب نے کہا صدیق جاوید صاحب کو بھی 85 نمبر دیے جائیں۔ وقار عظیم صاحب نے ذرا خفگی سے کہا نہیں 65 کافی ہوں گے اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اچھا ٹھیک ہے؟ میں دفتر سے باہر آ گیا۔ میں وقار صاحب کی ناراضی سمجھ گیا۔ غالباً ڈاکٹر سید عبداللہ کے استعفیٰ کی نامنظوری کے مطالبے پر جلوسوں میں میری سرگرمی یا خواجہ محمد زکریا سے میری دوستی (خواجہ صاحب سے میرے تعلقات 1956ء سے بہت قریبی رہے ہیں) پر انہیں ناگواری تھی۔ اپنی صدارت سے پہلے بھی وہ اس کا اظہار کر چکے تھے۔ میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور خواجہ محمد زکریا کی سرکردگی میں Students Excursion Tour پر کاغان جانے کی اطلاع اور انہیں یقین دلانے حاضر ہوا تھا کہ واپسی پر انشاءاللہ اپنا مقالہ ٹائپ کروا لوں گا۔ وقار صاحب کے چہرے اور لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔ فرمایا جائیے، اور اپنے خواجہ صاحب کی خوشی دیکھیے۔ بہرحال مجھے وقار صاحب نے مقالہ کے معیار کے علاوہ میری اپنے ساتھ Association کے باوجود کم نمبر

دلائے۔ اس پر مجھے رنج تو تھا مگر میں نے نتیجہ آنے پر اس سے اس بنیاد پر Compromise کر لیا کہ اگر وقار صاحب مجھے 20 نمبر اور دلا دیتے تو میری ڈویژن میں کوئی تبدیلی نہ آتی لہٰذا ایسے Cases میں طالب علم جیسی تیز و تند شکایت کرتے ہیں اس کے برعکس میں وقار عظیم صاحب کی اپنے مقالے پر اصلاحات کی تعریف کرتا رہا ہوں۔ اساتذہ، دوستوں اور اپنی جونیر کلاسز کے طالب علموں کے اصرار کے باوجود میرے تساہل اور لاپروائی میں کوئی فرق نہ آیا۔ میرا مقالہ "بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ" کئی برس کی تاخیر سے شائع ہوا تو اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کہا کہ کئی پی ایچ ڈی کے مقالات سے بہتر ہے۔ میری عدم دلچسپی کے باوجود اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے بطور صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور اپنے صوابدیدی اختیارات کا جس استبدادی انداز سے استعمال کیا۔ انہوں نے ایم اے کے مقالات میں طالب علموں پر موضوع ٹھونسے۔ کسی طالب علم سے موضوع چھین کر کسی دوسرے طالب علم کو دے دیا۔ کسی کے نمبر کم کروائے کسی کے زیادہ۔ ان کی ان کارروائیوں سے پیدا ہونے والی شکایات کی بنا پر کئی بار طالب علم ان کے دفتر میں ان کی بے عزتی کر گئے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن ڈاکٹر سید عبداللہ کے بارے میں یہ افواہیں اور بے بنیاد آراء اس علم اور اعتماد کی بناء پر شائع کرواتے ہیں کہ کسی قاری کے پاس نہ وقت ہوتا ہے نہ اسے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ کسی رسالہ یا اخبار میں کسی کے بارے میں چھپی ہوئی بات کی تحقیق کرتا پھرے کہ اس میں کتنی صداقت ہے اور کتنی غلط بیانی کی گئی ہے۔ جس کے بارے میں لکھا گیا ہوتا ہے وہ بھی عموماً تساہل یا بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مرحومین کی کردار کشی کے ضمن میں مرحومین کے قریب رہنے والے لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اصل حالات اور واقعات کی وضاحت کرتے ہوئے تردید کریں مگر لوگ اختلاف رائے میں الجھنے اور بے فائدہ مصروفیت میں پڑنے سے گریز کرتے ہیں۔ شاید وہ درست سوچتے ہوں کہ انہیں ایسی بے سود سرگرمی میں حصہ لینے سے کیا ذاتی فائدہ ہوگا۔ اسی وجہ سے "دروغ گو اور افواہ ساز" بیان شائع کراتے چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں کسی طرف سے تردید کا خوف نہیں ہوتا۔ دیکھیے آئندہ سطور اسی سلسلے کی ہیں۔

معین الرحمٰن نے "الحمراء" کے اسی شمارے میں ڈاکٹر وحید قریشی سے ایک بات منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے:

"۔۔۔ وہ (قریشی صاحب) مجھے اپنے تئیں یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ خواجہ محمد زکریا مجھ سے شدید معاصرانہ اور معاندانہ چشمک رکھتے ہیں اور مجھے اپنا واحد شریک اور حریف سمجھتے ہیں۔"

شاید یہ معین الرحمٰن کا اپنا وہم اور ان کے اپنے دل کا خیال ہے۔ انہیں اپنا وہم دور کرنے کے لیے پھر سوچنا چاہیے کہ 1965ء تک خواجہ محمد زکریا کے لیے آپ کا کوئی وجود نہ تھا۔ انہوں نے 1960ء میں

گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز کیا تھا۔ وہ 1962ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کا ریکارڈ قائم کر چکے تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ لاہور کی ادبی محفلوں اور حلقوں کی مشہور شخصیت تھے۔ ان کے مشہور ادیبوں اور شاعروں مثلاً حفیظ جالندھری' مجید امجد' میرزا ادیب' قیوم نظر' میرزا محمد منور' عدم' جیلانی کامران' افتخار جالب اور دوسرے کئی لوگوں سے تعلقات تھے۔ 1965ء میں وہ یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کے باقاعدہ سٹاف پر تھے۔ معین صاحب انہی دنوں محض چھ ماہ کے لیے خالص عارضی آسامی پر آئے تھے۔ جب سید معین الرحمٰن گورنمنٹ کالج کے شعبہ اردو (جو اس وقت تک انٹر اور بی اے کلاسز پر مبنی تھا) کے صدر رہتے تھے تو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا یونیورسٹی پروفیسر اور یونیورسٹی شعبہ اردو کے صدر تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے کلاسز کے اجراء کی منظوری اُن کے ہاتھ میں تھی۔ صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور (سید معین الرحمٰن) ان کی ریٹائرمنٹ تک مختلف کاموں اور سفارشوں کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہیں۔ معین صاحب کو معلوم تو ہوگا کہ شریک اور حریف ایک پائے کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ سوال شاید گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے کہ اگر معین الرحمٰن کو مولوی عبدالحق سے یا مولوی عبدالحق کو معین الرحمٰن سے عشق تھا تو انہوں نے پروفیسر وقار عظیم کے زمانہ صدارت میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لیے یہ موضوع منظور کیوں نہیں کرایا۔ پھر جب جامشورو سندھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے پاس وقار عظیم صاحب انہیں لے کر گئے تھے تو وہاں ''مولوی عبدالحق شخصیت اور کارنامے'' کو بطور موضوع پیش کیوں نہیں کیا۔ کیا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے لیے بھی ابواللیث صدیقی کی طرح ''مولوی عبدالحق'' ایک ناپسندیدہ موضوع تھا؟ سندھ سے غالب پر موصوف کے پی ایچ ڈی کرنے پر لوگ قیاس کرتے ہیں کہ سید وقار عظیم صاحب کو پبلک سروس کمیشن سے کلاس ون پوسٹ کے ہونے والے اعلان کا پتہ چل چکا تھا۔ اب دو چار مہینوں میں یہی ہوسکتا تھا کہ غالب صدی کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی کی غالب یادگار کمیٹی کے لیے معین الرحمٰن کی ''اشاریہ غالب'' کی ہیئت بدل کر پی ایچ ڈی کے مقالہ کے طور پر پیش کر دیا جائے۔

حال ہی میں معین الرحمٰن نے خواجہ محمد سعید سے ''گورنمنٹ کالج اور میں'' کے نام سے کتاب لکھوا کر شائع کی ہے جس کے دو ابواب میں خواجہ محمد سعید نے اپنے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ پر کیچڑ اچھالا ہے۔ اس میں ایک الزام یہ ہے کہ وہ 1948ء میں سید عبداللہ صدر شعبہ فارسی پنجاب یونیورسٹی کے پاس صاحب پر پی ایچ ڈی کی تجویز لے کر گئے تھے۔ خواجہ محمد سعید کو شکایت ہے کہ سید صاحب نے کھڑے کھڑے ان کو موضوع الاٹ کیوں نہیں کیا۔ خواجہ محمد سعید نے اس کتاب میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی حسن پرستی کو بھی بہت اچھالا ہے۔ اگر خواجہ محمد سعید دیانتدار ہوتے جس کا انہیں بہت دعویٰ اور مان ہے تو وہ گورنمنٹ کالج میں اپنے Planted سید

معین الرحمٰن کی حسن پرستیوں اور ان سے متعلق حکایتوں کو بھی بیان کرتے جنہیں ان کے شاگرد Pizza Hut کے Spicy Pizza سے بھی زیادہ لذیذ پاتے ہیں۔ خواجہ سعید اپنے اُن ممدوحین اور رفقائے کار کا بھی تذکرہ کرتے جنہوں نے اپنی شاگردوں کے ساتھ Affair کے بعد خوفناک نتائج کے انکشاف سے ڈر کر شادیاں کیں۔

مجھے یہ تکلیف دہ احساس ستا رہا ہے کہ خواجہ محمد سعید جیسا ذہین' ہوشیار' تجربہ کار اور حقائق کا پارکھ آدمی ڈاکٹر معین الرحمٰن کے جھرے میں کس طرح آ گیا۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ بغض اور بدگمانی دھکیل کر غلط فیصلوں تک لے جاتی ہے۔ بہرحال معین الرحمٰن کو سید عبداللہ کے مولوی عبدالحق پر پی ایچ ڈی کی اجازت نہ دینے کی بنیاد ہی غلط ہے۔ ایسا موقع اور چویشن نظر نہیں آتی کہ سید صاحب کے سامنے یہ مسئلہ آیا ہو۔ اگر ایسا ہوا بھی ہو تو پہلے سید معین الرحمٰن کو اپنے استحقاق اور تعلیمی ریکارڈ پر نظر ڈال لینی چاہیے۔

سید معین الرحمٰن کو ڈاکٹر سید عبداللہ کے خلاف بغض رکھنے اور ان کو مطعون کرنے کی مہم پر سید صاحب کی روح سے معافی مانگنی چاہیے۔ ایک بار پھر انہیں ڈاکٹر سید عبداللہ کے اختیارات اور ان کو حاصل صوابدید کے ساتھ ساتھ اپنے معمولی تعلیمی ریکارڈ اور اپنے استحقاق کا جائزہ لینا چاہیے۔ انہیں یہ بھی چاہیے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کو بلاوجہ مطعون کرنے سے تائب ہو جائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر وہ سید عبداللہ (اگرچہ ایک انتظامی منصب پر کئی بار ایسی زیادتیاں ہو جاتی ہیں) کی اپنی پی ایچ ڈی کی منظوری کے باب میں زیادتی' ناانصافی اور اپنے استحقاق کی پامالی ثابت کر دیں تو ہم اس کو نقطۂ آغاز بنا کر یونیورسٹیوں میں صدور شعبہ کی دھاندلی کے خلاف ایک تحریک چلائیں گے۔ مگر اس سے پہلے معین الرحمٰن کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کے مقابلے میں کس نااہل کو پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹر کیا تھا؟ کیا اس کے جواب میں پروفیسر افتخار احمد صدیقی اور ممتاز احمد منگلوری کا نام لیا جائے' جن میں سے پہلے امیدوار کا موضوع ''ڈپٹی نذیر احمد۔ احوال و آثار'' اور دوسرے امیدوار کا موضوع تحقیق ''عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناول نگاری'' تھا۔

O

سال سوا سال قبل بازار میں ایک کتاب ''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ شخص اور عکس۔ از نائیلہ انجم'' دیکھی تو فوراً خرید لی۔ ایک تو مجھے سوانحی کتب میں بہت دلچسپی ہے۔ اس کتاب کی موضوع شخصیت معین الرحمٰن۔ دوسرے اس کی مصنف ہماری شاگرد تھیں۔ گھر پہنچ کر اس کی ورق گردانی شروع کی۔ اس کتاب میں جگہ جگہ معین الرحمٰن صاحب کی ترتیب و تدوین کے آثار نظر آئے۔ موصوف نے اس عزیزہ کے امتحانی تحقیق مقالہ کی تہذیب میں بھی تو بہت محنت کی تھی۔ انہوں نے ''مصنفہ'' کے نام مورخہ یکم اگست 1987ء کے خط میں لکھا بھی تو ہے:

''آپ کا مقالہ بالآخر مکمل ہو گیا۔ آپ کے بعد اسے لفظ بہ لفظ ابھی صرف میں نے دیکھا ہے' اور میں اس سے مطمئن ہوں کہ آپ کی محنت اور لیاقت کا پروپیگنڈہ کروں تو میرے بارے میں اہل نظر بدگمان نہ ہوں گے۔''

[متذکرہ کتاب' صفحہ 38]

خدا جانے ڈاکٹر معین الرحمٰن نے آخر میں ابہام کیوں رکھ دیا؟ معلوم نہیں کس مقصد کا حصول ان کے پیش نظر ہے؟

کتاب کے نام ''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ شخص اور عکس۔'' اور مصنفہ کے نام (نائلہ انجم) سے قبل لفظ ''از'' گمراہ کن ثابت ہوا کیوں کہ یہ کتاب عنوان کے مطابق سوانح نہیں ہے' موضوع کے مطابق اس میں تسلسل نہیں پایا جاتا اور یہ ایک مستقل تصنیف بھی نہ نکلی کیونکہ یہ کتاب تو معین الرحمٰن اور ''مصنفہ'' کی ''پندرہ سالہ مراسلت'' پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اکتیس خطوط اور چھیاسٹھ کے قریب مصنفہ کے مکتوب شائع ہوئے ہیں۔ یقیناً خطوط کے مجموعوں کی اپنی اہمیت اور افادیت ہے مگر یہ کتاب اپنے مندرجات کے حوالے سے عام قارئین کی دلچسپی کی نہیں ہے۔ چند دنوں بعد معلوم ہوا یہ کتاب شعبہ کے کچھ پرانے طلباء و طالبات اور کچھ پرانے اور نئے اساتذہ میں دلچسپی سے پڑھی گئی اور دائیں بائیں بھی بعض حلقوں میں سید معین الرحمٰن کی وجہ سے پڑھی گئی۔ مصنفہ وقت نکال کر باقاعدہ سوانح عمری ہی لکھ دیتیں تو سید معین الرحمٰن کی بھی حسرت پوری ہو جاتی۔ مصنفہ کے تعارفی مضمون ''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ میرا آئیڈیل'' سے اندازہ ہوا اگر آپ بیتی یا جگ بیتی لکھیں گی تو بے باکی سے لکھیں گی۔ اس مضمون کے تیسرے صفحہ کے دو پیراگراف نے متوجہ کیا۔

پہلے زیر نظر کتاب کے صفحہ 18 کا پیرا نمبر دو اور پیرا تین کی پونے دو سطریں دیکھیے۔ مصنفہ نے لکھا ہے:

''مختلف پیریڈز میں اساتذہ آتے رہے اور تعارف کرواتے رہے۔ سب نے اپنے اپنے لہجے میں تعارف کروایا۔ ملک حسن اختر (مرحوم) دھمکی آمیز لہجہ بارعب بننے کی ناکام کوشش۔ حق نواز ڈائمس سے بہت مخلص تھے۔ سارا پیریڈ اس کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ ڈاکٹر سلیم اختر تنقید پڑھاتے پر کہیں سے ناقد نظر نہیں آتے تھے۔ صدیق جاوید عارضۂ قلب میں مبتلا ول تھامے سیڑھیاں چڑھتے اور سارا پیریڈ ہمیں بے بسی سے دیکھتے رہتے۔

ڈاکٹر معین صاحب سب سے مہربان اور شفیق چہرہ (جنہیں آپ نے داخلہ کے لیے انٹرویو کے وقت صدارتی کرسی پر دیکھا تھا) نہ کوئی ڈانٹ ڈپٹ اور نہ ہی کوئی تنقید پھر بھی کلاس میں ہر شخص باادب اور خاموش۔۔۔''

مجھے معین الرحمٰن کی یہ بات اچھی لگی کہ وہ مصنفہ کی آزادانہ رائے میں حائل نہیں ہوئے۔ خدا کا شکر ہے اس کتاب کی نوک پلک درست کرتے وقت ان میں رشید احمد صدیقی' آل احمد سرور اور وقار عظیم کی روح حلول نہ ہوئی تھی چونکہ وہ ان بزرگوں کے تہذیبی' معاشرتی اور اخلاقی رویے اور اقدار کی پیروی کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ممکن تھا مصنفہ کے مندرجہ بالا پیراگراف میں اساتذہ کے احترام کی جگہ تضحیک کا پہلو دیکھتے ہوئے وہ اس عبارت پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے انہوں نے مصنفہ کی سطور اس لیے نہ چھوئی ہوں کہ ان کے ذریعہ اپنی رائے کی ترسیل چاہتے ہوں۔ مطلب ہے وہ ڈاکٹر سلیم اختر کو بتارہے ہوں کہ تم کہاں کے نقاد ہو۔

اگر معین الرحمٰن کی جگہ میں اس کتاب کا منتظم' معاون' مشیر' مدیر اور ناشر ہوتا تو میں مندرجہ بالا پیرا اس طرح بنادیتا:

''ہم شعبہ میں پہلے دن حاضر ہوئے' مختلف پیریڈز میں اساتذہ آتے رہے اور اپنا تعارف کرواتے رہے۔ سب نے اپنے لہجے میں اپنا اپنا تعارف کروایا۔ ملک حسن اختر (مرحوم) دھمکی آمیز لہجہ بارعب بننے کی ناکام کوشش۔ حق نواز ڈائیس سے بہت مخلص تھے۔ سارا پیریڈ اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بتایا وہ تنقید پڑھائیں گے پر کہیں سے ناقد نظر نہیں آتے تھے۔ صدیق جاوید عارضۂ قلب میں مبتلا دل تھامے سیڑھیاں چڑھ کر آئے اور سارا پیریڈ ہمیں بے بسی سے دیکھتے رہے۔''

اوپر کتاب کے جس دوسرے پیرا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا جائزہ لینے سے پہلے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی یہ عادت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ پہلے بلا جواز خود چھیڑ خانی کرتے ہیں۔ جب اس کا جواب یا ردعمل ذرا سخت ہو جائے تو باقاعدہ رونے پر اتر آتے ہیں۔ ایک مثال کسی اور جگہ پیش کی جاچکی ہے کہ جب مسروقہ ''دیوانِ غالب'' نسخۂ خواجہ کے خلاف تحسین فراقی کی مہم تیز ہوئی تو جناب مشفق خواجہ کو درد بھرا خط لکھ کر ان سے مدد کی درخواست کی۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری جاپان سے (1998ء میں) آئے ہوئے تھے۔ سید معین الرحمٰن نے ایک دن انہیں اپنے کالج کے کمرہ میں میرے سامنے ''دیوانِ غالب'' نسخۂ خواجہ پیش کیا کیونکہ جلد پر درج آراء میں ان کی رائے بھی تھی۔ میں نے کاشمیری صاحب سے وہ نسخہ مستعار لے لیا۔ ان کی رخصت ختم ہوئی اور وہ اوساکا (جاپان) واپس چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد معین الرحمٰن کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کا تقاضا ہوا۔ انہوں نے میری تحویل میں کتاب کا عذر پیش کیا۔ سید معین الرحمٰن نے ٹوکیو سے چھٹی پر آئے ہوئے ڈاکٹر معین الدین عقیل کے ہاتھ تبسم کاشمیری کو ان کا نسخہ بھجوانے کے لیے مجھ سے کتاب منگوائی لیکن کاشمیری صاحب کو بھیجنے کی بجائے اپنے پاس رکھ لی کیونکہ تبسم کاشمیری نے تبصرہ لکھنے سے معذرت کرلی تھی۔ میری شریعت میں کسی کی کتاب حرام اور معین الرحمٰن کی شریعت میں صرف بیگانی کتاب جائز ہے۔ میرے لیے یہ خیال سوہان روح بنا ہوا

تھا کہ تبسم کو ایک لمحہ کے لیے بھی بدگمانی نہ ہونے پائے۔ میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے کتاب کی واپسی کا برابر مطالبہ کر رہا تھا۔ اگلی چھٹیوں میں تبسم اپنے گھر آئے تو سید معین الرحمٰن نے ان کو فون پر روتے ہوئے کہا کہ صدیق جاوید کتاب کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہو رہے۔ وہ کہہ رہے ہیں میں آپ کو آپ کی کتاب واپس کروں گا۔ آپ انہیں بتا دیں کہ آپ کو کتاب میں کوئی دلچسپی نہیں۔ تبسم کاشمیری نے اسی وقت مجھے فون کرتے ہوئے بتایا کہ معین واقعتاً رو رہا تھا۔ تم اب معین سے کتاب نہ مانگنا سمجھو کتاب مجھے آ گئی ہے۔

اس کے بعد ماہنامہ ''الحمراء'' نومبر 2003ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف سید معین الرحمٰن نے شرمناک طریقے سے اور اخلاق سوز الفاظ میں زہر افشانی کی۔ جس کا عرفان احمد خان (ناول نگار) نے جواب دیا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے جواب الجواب کے طور پر ایک طویل مراسلہ لکھا۔ کل فون پر عرفان احمد خان صاحب بتا رہے تھے کہ موصوف نے اس مراسلہ کا میرا جواب رکوا دیا ہے۔ ان کا الزام درست معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس رسالہ میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے متعارفے برابر چھپ رہے ہیں جو دفتر رسالہ ''الحمراء'' لاہور میں ان کے اثر و رسوخ کا ثبوت ہے۔

اس وقت میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ساتھ اپنے تیس پینتیس برس پر محیط تعلقات کی کوئی تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے خود 73/74 میں ''ذکر عبدالحق'' مرتبہ معین الرحمٰن پر ایک توصیفی مضمون لکھ کر ایک مجلس میں پڑھا تھا' جو بعد از اں رسالہ ''اوراق'' میں شائع بھی ہوا۔ مجھے اسی سے اندازہ ہوا کہ میری طرح بہتیرے لوگ ان کی مرتبہ کتابوں کو ان کی تصانیف سمجھ کر گمراہ ہوتے ہوں گے۔

مجھے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ساتھ اپنے تعلقات کی خرابی کا کوئی ٹھوس سبب یاد نہیں البتہ مجھے ان کے عام رویوں اور طریق کار میں Grace کا فقدان نظر آتا تھا۔ وہ کبھی کبھی میرے لیے الجھن کا باعث ضرور بنا تھا مگر کوئی ایسا اختلاف پیدا نہ ہوا جو باہمی تعلقات کے لیے خطرے کا باعث ہوتا۔ میں نے گذشتہ برسوں کے واقعات کو بہت کریدا' کوئی چنگاری برآمد نہ ہوئی۔ البتہ مندرجہ ذیل دو تین باتوں کی طرف دھیان جاتا ہے۔

ڈاکٹر نیر صمدانی کی پہلی کتاب ''جواز'' کی سر فضل حسین ریڈنگ روم گورنمنٹ کالج لاہور میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی زیر صدارت تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ صمدانی صاحب کی فرمائش پر دیباچہ کے بعد میں نے ایک اور مضمون اس تقریب میں پڑھا۔ اس کا اختتامی جملہ اس قسم کا تھا کہ ان دنوں تحقیق میں مشکل کیا رہی ہے۔ بس فوٹو سٹیٹ مشین' قینچی اور گوند کی شیشی اس کا لوازمہ ہے۔ میں حلفاً کہتا ہوں اُس وقت میرا اشارہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی بجائے ترتیب و تدوین کی عصری صورت حال کی طرف تھا۔ معین الرحمٰن کے حواریوں نے اس بات کو خوب ہوا دی۔ میں اگر اس وقت وضاحت یا تردید کرتا تو معین الرحمٰن بھی یہی سمجھتے کہ ایک خوفزدہ ماتحت کی تاویل ہے۔ بہر حال وہ اس وقت میری ایک ACR خراب کرنے کی جرأت نہ کر

سکے جبکہ وہ کئی لوگوں کی سالانہ رپورٹیں خراب کر چکے تھے اور کرتے رہے تھے۔ شاید ان کے لیے میری دوسری ناپسندیدہ بات یہ ہو کہ میں انہیں ہر سال برملا کہتا رہا کہ ان کا ایم اے اردو میں داخلہ کا ٹیسٹ حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ تیسری بات نہ ڈھکی چھپی تھی اور نہ غیبت رہی تھی کہ میں ان کی تحقیق کا قائل نہیں رہا تھا۔ میرے ساتھ ہی ان کے دوسرے معتمد خاص پروفیسر صابر لودھی کے ساتھ ان کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ شاید اصل وجہ یہ تھی کہ صدر شعبہ معین الرحمٰن سمجھنے لگے تھے کہ وہ گورنمنٹ کالج میں Well Settled ہو گئے ہیں۔ ان کی جڑیں گہری جا چکی ہیں اور وہ ایک مضبوط صدر شعبہ ہیں۔ بہر حال انہوں نے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''خاموش کارکن'' کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ میں 1996ء میں ریٹائر ہو گیا۔ اس وقت ہمارے تعلقات Luke warm سے تھے۔ ابھی ان میں بحران پیدا نہ ہوا تھا۔ تھوڑی بہت لگائی بجھائی اور نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ معمول کا مذاق' مزاح اور شغل چل رہا تھا۔ میں اپنی ریٹائرمنٹ تک اکثر رفقائے کار جیسا مستقل مزاج نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے صدر شعبہ کی خدمت میں روزانہ کی حاضری اور سلام کبھی روا نہ رکھا تھا جسے لوگوں کی اکثریت ملازمت کی اول شرط خیال کرتی ہے البتہ میں پروٹوکول اور آداب ملحوظ رکھنے والا بہت ذمہ دار اور تابع قسم کا ماتحت ضرور تھا۔ جب کبھی وہ بلاتے میں حاضر خدمت ہوتا۔ یوں بھی بلانے کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی کیونکہ میں ریگولر کلاس لینے والا استاد تھا۔ نہ میرے طالب علموں کو مجھ سے شکایت پیدا ہوئی نہ میں نے طالب علموں کی پرنسپل یا صدر شعبہ کے حضور پیشی کرائی۔ ایم اے کی طالبات میں بھی کوئی میری لاڈلی یا چہیتی کا درجہ نہ پا سکی اس لیے کہ مجھے اپنی عزت نفس کا بہت خیال رہتا تھا۔ میں کلاس روم سے باہر اپنے آفس تک میں ان سے نہیں ملتا تھا اور تین چار برس تو ڈیپارٹمنٹل لائبریری کا انچارج بھی رہا۔ انہیں کتابیں اشو کرنا اور واپس لینا میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔ میرا تو کسی طالب علم سے ایسا بھی گہرا تعلق پیدا نہ ہوا کہ وہ میرے خط ہی پوسٹ کر دیں۔ بہر حال میں ریٹائرمنٹ کے آٹھ برس بعد آج پھر اعتراف کرتا ہوں کہ فوٹو سٹیٹ مشین' قینچی اور گوند کی شیشی کا معین الرحمٰن کی طرف اشارہ ہرگز نہ تھا۔

معین الرحمٰن نے شعبہ کے ہر ریٹائرڈ استاد پر ایم اے کا تحقیقی مقالہ لکھوا دیا۔ میں طنزیہ طور پر کہا کرتا تھا کہ اب ڈیپارٹمنٹ کا صرف چپڑاسی باقی رہ گیا ہے۔ بہر حال ریٹائرمنٹ کے چار پانچ سال بعد مجھ پر بھی تحقیق کے لیے ایک لڑکی کو تھیسس دے دیا گیا۔ میں نے بہت روکا' معلوم نہیں وہ اس موضوع کے لیے کیوں بضد تھی۔ طالبہ میرے دوست پروفیسر اصغر ندیم سید کی بھتیجی تھی۔ اس لیے مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ امتحان سے ایک ڈیڑھ مہینہ پہلے تک وہ مواد جمع نہ کر سکی۔ اُس کے نگران اور اُس کو میرے متعدد اہم تنقیدی مقالات کا علم ہی نہ تھا۔ میں نے ترس کھا کر اپنے پاس سے سارا مواد دے دیا اور پہلی قسط جو بیس کے قریب کتابوں اور رسالوں وغیرہ پر مشتمل تھی' معین الرحمٰن صدر شعبہ کے کمرہ میں اس عزیزہ کے سپرد کی تھی' جو شعبہ کے نائب قاصد بابو خان میری گاڑی میں سے نکال کر لائے تھے۔ مقالہ کے Viva کے بعد وہ طالبہ تھیسس کی

ایک کاپی لے کر میرے پاس آئی۔ وہ بات کرتے ہوئے کانپ رہی تھی۔ وہ بچاری اتنی ہراساں تھی کہ میرے اصرار کے باوجود بیٹھنے کو تیار نہ تھی۔ جاتے جاتے بتا گئی' سر! اس میں آپ کے خلاف بھی فقرے ہیں' وہ میرے نہیں سر نے لکھوائے تھے۔ اب آپ کو کیا بتاؤں' ایسا ناقص' ناکام اور ایسا شرمناک تھیسس ہے کہ اگر یہاں کسی قسم کے محاکمہ کا نظام ہوتا تو سپر نگران' نگران اور نان آفیشل نگران کو معطل کرنے کی سفارش کی جاتی۔

جملہ معترضہ برطرف مصنفہ'' ۔۔۔ شخص اور عکس'' نے بہت بے تکلفی اور دیانتداری سے بیان کیا ہے کہ پہلے تعارفی پیریڈز میں وہ کلاس میں آنے والے اپنے اساتذہ سے بدگمان اور بدظن ہوئیں۔ اس کے برعکس اپنے داخلہ کے لیے انٹرویو میں صدر شعبہ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئیں۔ انٹرویو کے کمرہ میں کرسیٔ صدارت پر براجمان شخصیت کے مہربان چہرے نے انہیں اس حد تک متاثر اور مرعوب کیا کہ وہ آج تک اس سحر سے آزاد نہیں ہو سکیں۔ ان کے استاوی شاگردی کے تعلقات باپ بیٹی کے رشتے میں منتقل ہو گئے۔ اب وہ ڈاکٹر معین الرحمن کی معمولی پریشانی سے بھی ہراساں ہو جاتی ہیں۔ سید معین الرحمن کو بھی اپنے پیشہ ورانہ ماحول یا معاملات میں کسی شخص سے شکایت ہوتی ہے تو وہ اس عزیزہ کو طاقت کا سرچشمہ سمجھ کر آواز دیتے ہیں۔ مصنفہ'' ڈاکٹر معین الرحمن ۔ شخص اور عکس'' میں لکھتی ہیں:

'' ان (معین) کی طبیعت کی نرمی کو دیکھتے ہوئے بہت سے لوگ زیادتی کر جاتے ہیں اور اس کے جواب میں وہ کچھ بھی نہیں کہتے۔ خط میں مجھے لکھ دیتے ہیں۔ ٹیلی فون پر مجھے بتائیں گے۔ مجھے بے تحاشا غصہ آتا ہے۔ میں اپنے میاں سے بھی کہتی ہوں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ ٹھہرے پولیس مین۔ کہہ دیں گے۔ نام ایڈریس بتاؤ طبیعت صاف کروا دیتے ہیں۔۔۔''

[ڈاکٹر سید معین الرحمن ۔ شخص اور عکس۔ از نائیلہ انجم' اوقار پبلی کیشنز' لاہور 2003ء صفحہ 31]

مندرجہ بالا سطور سے متصل سطور سے پتہ چلتا ہے کہ مجوزہ action کے سلسلے میں ڈاکٹر معین الرحمن سے مشورے ہوتے رہتے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ سید صاحب کی رحم دلی نے ''طبیعت کی صفائی'' کے پروگرام پر عمل درآمد نہیں ہونے دیا۔ بہر حال جب ان کے ہاں اتفاق رائے ہو جائے گا تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا' ہم بھی دیکھ لیں گے۔ مگر یہ سب ان کے اپنے مفاد میں ہوگا کہ مصنفہ اپنے ''پولیس مین میاں'' سے پوچھ لیں کہ کیا کوئی چھچھورا' تھرڈ کلاس غنڈہ کسی نرم خو' نرم مزاج اور شریف و حلیم آدمی کے ساتھ بلاوجہ بدتمیزی یا گستاخی کرتا ہوا پایا گیا ہے؟ مصنفہ کے زیر تبصرہ مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ بہ حیثیت طالبہ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور انہوں نے وہاں کے ماحول اور فضا کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کا اپنے شعبہ کے علاوہ بھی بہت سینئر اساتذہ سے قریبی رابطہ رہا ہے۔ وہ شعبہ کے مسائل' معاملات اور واقعات سے بھی خوب واقف معلوم ہوتی ہیں۔ وہ معین الرحمن کے ساتھ برتاؤ میں آنے والے لوگوں کو بھی جانتی ہیں۔ پرنسپل' ممبران کالج کونسل' پروفیسرز' لیکچرار' کالج کا کلیریکل سٹاف' چپراسی' بیلدار' طلباء و طالبات اور ان کے والدین یا گارڈین۔

ان میں سے معین صاحب کے ساتھ کون زیادتی کر سکا ہوگا اور کیوں؟ بتائیے یا سوچیے۔

مصنفہ کے اس مضمون کے دو تین پیراگراف سے پتہ چل جاتا ہے کہ معین صاحب سے زیادتی کرنے والوں سے ان کی مراد شعبہ اردو کے کم و بیش تمام اساتذہ ہیں' جن کے لیے موصوفہ تہمتی معلم اور نیار یے وغیرہ جیسے اسمائے صفات استعمال کرتی ہیں۔ ہم کسی بحث میں نہیں پڑتے۔ سچے اور جھوٹے کے فرق اور امتیاز کو دیکھنے کے لیے صدیوں سے ایک کسوٹی استعمال ہو رہی ہے۔ جب معاملہ یا مقابلہ ایک آدمی اور متعدد آدمیوں کا ہو تو پوچھا جاتا ہے؟ کیا ایک ہی شخص معصوم عن الخطا ہے؟ مصنفہ ایک عاقل اور دانا خاتون ہیں۔ انہیں ایک سیکنڈ کے لیے سوچ تو لینا چاہیے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کا پورا شعبہ اردو دیوانہ اور کمینہ تھا اور صرف ایک ڈاکٹر معین الرحمٰن فرزانے اور عالی ظرف تھے؟ مصنفہ کو ڈاکٹر معین الرحمٰن سے جس درجہ کی عقیدت اور محبت ہے اس سے مجبور ہو کر وہ انہیں مظلوم اور معصوم ہی سمجھتی رہیں گی۔ میں اس حسن وفا کی داد دیتا ہوں مگر انہیں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے کریکٹر میں وہ خوبی یا خصوصیت تلاش کرنی چاہیے جو ان کے ہر قریبی دوست یا رفیق کار کو ان سے پرے دھکیل دیتی ہے۔ مصنفہ نے ان کے ایک ہی عزیز رفیق کار کا نام لیا ہے۔ وہ یہ بھی تو معلوم کر لیتیں کہ ان صاحب کو معین الرحمٰن کتنے اور کتنے دنوں کے لیے عزیز رہے ہیں۔ انہیں ان کے درجنوں ''عزیز رفقائے کار'' کا خیال نہ آیا جو پچیس تیس برس موصوف کی ہر جفا سہتے رہے' ہر خدمت بجالاتے رہے۔ آخر میں تہمتی کے خطاب کے سزاوار ٹھہرے۔

مصنفہ نے سید معین الرحمٰن کے اپنے رفقائے کار پر احسانات کا اشاروں میں ذکر کیا ہے۔ خیر یہ تو تب پتہ چلے گا جب کھاتہ کھلے گا۔ کیونکہ ''حساب دوستاں در دل'' عملی طور پر ایک ڈھکوسلہ ہی ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ کسی نہ کسی دن یہ ''در دل'' کہلوانے والا حساب لب پر آ جاتا ہے۔ یا لین دین کی Statement بن کر آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ کو کیا کیا کوسنے نہیں دیے۔ ان کو کیا کیا نام نہیں دیے۔ لطف کا پہلو یہ ہے کہ ان کی اس تحریر پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تائیدی مہر ثبت ہے کیونکہ انہی کی نظر ثانی' اہتمام اور ترتیب کاری سے یہ کتاب چھپی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے نزدیک یہ تحریر ایسا شاہکار اور کلاسیک ہے کہ وہ اسے مکرر چھاپ رہے ہیں۔ میرے دوست احمد عقیل روبی کے ''لکھ داتا'' کے اس لاکھ روپے میں جس کی انہیں جھلک دکھائی گئی تھی' معین الرحمٰن کے رفقائے کار کے بچوں کا کتنا کنٹری بیوشن ہے' یہ تو اس وقت آنکھوں کے سامنے آئے گا جب کھاتے کھلیں گے۔ باقی میرا روبی بادشاہ جانتا ہے' اب زمانے بدل گئے ہیں۔ Millionaire کی متھ ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ اب تو سموسہ فروش' پان فروش اور حلوہ پوری والا بھی ''ملین ایر'' ہے۔ ہر گلی میں کروڑ پتی اور ارب پتی بیٹھے ہیں۔

اس عزیزہ کی کتاب کے مندرجات میں قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے مبینہ طور

پر اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے لوگوں کی ایک طویل فہرست (ان کے ایڈریس سمیت) فراہم کردی ہے۔ اب معلوم نہیں انہوں نے مجھے سرِفہرست رکھا ہے (اُن سے سب سے پرانا تعلق تو میرا ہی ہے) کہیں درمیان میں رکھا ہے یا فہرست کے آخر میں۔ اگرچہ میں باب تبر زنہیں مگر دھمکی سے مرا بھی نہیں ہوں۔ وہ غالب کا زمانہ تھا جب لوگ دھمکی سے مرتے تھے۔ اب کلاشنکوف کا زمانہ ہے اور لوگ ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔

مصنف نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کو نیک دل، صلح جو، امن پسند اور لڑائی سے محترز ثابت کرنے کے لیے موصوف کے اپنے مندرجہ ذیل الفاظ نقل کیے ہیں:

''میں یا کوئی بھی اپنے تئیں فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ مجھ سے بے اعتدالی بھی ہوئی ہوگی، حماقت بھی۔ لیکن مجھے کچھ ایسا خیال ہے کہ اس میں میری نیت یا ارادے کی بدی یا کجی کو شاید ہی کبھی دخل رہا ہو۔ ایک دو صاحبوں نے اپنی ''صلاحیت اور قلم کاری'' کو میرے لیے مخصوص رکھا۔ ان کی یہ تگ و تاز ''یک طرفہ'' ہی رہی۔ نزا الجھنے میں ہمیشہ میں نے عافیت جانی اور خاموشی ہی کو کاری اور شافی جواب خیال رکھا۔۔۔''
[ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ شخص اور عکس۔ صفحہ 32.31]

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی عملی روش کو مندرجہ بالا آئیڈیل بیان کے تقابل میں دیکھیں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ موصوف ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ ان کا اپنی بے اعتدالی میں ان کی نیت یا ارادے کی بدی یا کجی کے دخل سے انکار سراسر جھوٹ ہے۔ ان کے احوال سے معلوم ہے کہ وہ ''منصوبہ بندی'' کے آدمی ہیں کیا ''الحمراء'' لاہور نومبر 2003ء کی اشاعت نیت یا ارادے کی بدی یا کجی کا ثبوت نہیں۔ کیا یہ آمد ہے یا الہام ہے؟

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی غلط بیانی، فریب کاری اور دھوکہ دہی کی ایک ناقابلِ فراموش واردات اُن کتابوں کی اشاعت ہے جو تین چار ناشرین کو موصوف نے جھانسہ دے کر 1989ء میں اُن کے اہتمام و انصرام اور صرفِ زر سے گورنمنٹ کالج لاہور کے 125ویں سال کی مناسبت سے چھپوائیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ''شعبہ اردو۔ کوائف اور کارکردگی'' کے دیباچہ بعنوان ''حرفے چند'' میں لکھا ہے:

''کالج کے ایک سو پچیسویں 125 سال (یعنی سال 1989ء) کو شعبۂ اردو نے سال تالیفات قرار دے کر متعدد علمی کتابوں کی ترتیب و طباعت کا پروگرام بنایا۔ سال بھر میں آگے پیچھے اس سلسلے کی سترہ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ سب کتابیں اساتذہ اور شعبہ اردو کے متعلمین کی علمی کاوش اور کاہش کا نتیجہ ہیں۔۔۔'' [14 دسمبر 1989 صفحہ 11]

اس اشاعتی سلسلے کا پس منظر یہ ہے کہ پاکستان میں ہر ادارے کا سربراہ اپنی کارکردگی ثابت کرنے کے لیے کسی نہ کسی کارروائی کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ غالباً 1989ء کے اواخر میں پرنسپل گورنمنٹ کالج کو ازخود یا کسی مشیر کے سمجھانے پر خیال آیا کہ گورنمنٹ کالج کی 125ویں سالگرہ کی تقریبات کا انعقاد کیا جائے۔ کالج کونسل میں ان تقریبات کا کیا خاکہ تیار ہوا مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اس ضمن میں شعبہ اردو کی

کوئی میٹنگ بھی مجھے یاد نہیں۔ مجھے اردو بازار لاہور کے دو ناشر دوستوں (جن سے معین الرحمٰن کی بھی دوستی ہو گئی تھی) سے پتہ چلا کہ 125 سال کے حوالے سے تقریبات منعقد ہوں گی جس میں بیرون ملک آباد یا برسر روزگار اور ملک بھر سے اولڈ راوین ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک میلہ لگے گا۔ اس موقع پر کچھ کتابیں شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ تقریباً 250 ڈیلی گیٹس کو ہر کتاب تحفہ میں دی جائے گی اور امکان ہے کہ چار پانچ سو کتابیں تقریبات کے شرکا خرید لیں۔ ناشرین کو ان کتابوں کے مسودات شعبہ اردو فراہم کرے گا۔ طباعت واشاعت ناشرین کی ذمہ داری ہوگی۔ ناشرین کو زبانی ضمانت دی گئی کہ تقریبات کمیٹی ہر کتاب کے 250 نسخے خرید کرے گی۔ ظاہری سطح پر یہ ایک منافع بخش سودا تھا۔ یہ پراجیکٹ تین چار ناشروں کے درمیان ایک سیکرٹ بن کر رہا۔ ہر ایک نے ایک دوسرے سے بڑھ کر کتابیں چھاپیں۔ اس موقع پر تقریبات میں جشن کا سماں پیدا نہ ہو سکا۔ کیوں کہ صرف بھارت سے چند لوگوں نے شرکت کی۔

اس موقع پر کتابوں کے اشاعتی پروگرام کے بہانے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اپنی چار کتابیں ''غالب کا علمی سرمایہ'' ''غالب اور انقلاب ستاون'' (طبع ثانی) ''یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق'' ''شعبہ اردو کوائف اور کارکردگی'' اور اس کے ساتھ نائیلہ انجم کا تھیسس (رسالہ ''نقوش'' میں ذخیرۂ غالبیات) شائع کروانا چاہتے تھے۔ ''راوی'' کے دو اشاریے بھی امتحانی مقالے تھے۔ ''راوی'' کے مندرجات کے انتخاب کی جلد میں راوی افسانے' راوی ڈرامے' اقبالیات راوی' راوی غزلیات' راوی طنز ومزاح اور راوی رنگ (پنجابی شعری انتخاب) کو خانہ پری ہی کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بزم اقبال لاہور سے اقبال اور رسائل و کالج میگزین کا انتخابی سلسلہ شروع کیا تو مجھے ''اقبال اور راوی'' مرتب کرنے کے لیے کہا۔ چونکہ میں اس سلسلے کا قائل نہ ہو سکا تھا میں نے رانا جماعت علی خاں لائبریرین سے کہا کہ وہ ''راوی'' میں اقبال کے حوالے سے مضامین جمع کر لیں' میں انتخاب کو آخری شکل دینے کے لیے مشورہ میں شریک ہو جاؤں گا۔ ان کے اس انتخاب میں میری کتاب ''بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ'' پر میرے مرحوم دوست پروفیسر حق نواز کا مضمون بھی شامل تھا جو میں نے ضد کر کے خارج کروا دیا۔ میرے مشورے سے چھپنے والی کتاب میں میرے حوالے سے کسی مضمون کی شمولیت کا تصور مجھے سوقیانہ لگا تھا۔ پروفیسر حق نواز مرحوم کو کتاب کی اشاعت پر میری اس حرکت کا علم ہوا تو وہ اپنے دھیمے انداز میں ناراض ہوئے تھے۔ بہر حال اپنے اپنے مزاج اور فطرت کی بات ہے۔

خیر ذکر تھا گورنمنٹ کالج کے 125 ویں سال کی تقریبات (مثلاً مباحثہ' ڈرامہ' مشاعرہ' کانووکیشن اور نمائش کتب وغیرہ) کا' جو منعقد تو ہوئیں مگر ان میں کوئی گرمی' جوش اور رونق نہ تھی۔ شائع ہونے والی کتابوں کی نمائش کسی بڑے ہنگامے سے بچ گئی کیونکہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کسی Sanction کے بغیر پبلشرز کو ہر کتاب کے 250 نسخے خریدنے کا یقین دلایا تھا مگر اب انکار کرتے ہوئے مسکرا بھی نہ سکے۔ فطری طور پر

ناشرین بہت سیخ پا ہوئے۔ خاص طور پر جناب ضیا قریشی صاحب (یولیر بکس والے) بہت آزردہ اور ناراض ہوئے۔ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی بڑی بدمزگی ہو جائے گی۔ وہ تو پروفیسر رؤف انجم (صدر شعبہ انگریزی، یکے از منتظمین تقریبات' جو حسن اتفاق سے ضیا قریشی کے سسر تھے) کی وجہ سے صورت حال گھمبیر نہ ہوئی اور ہاتھ سے نہ نکلی۔ غالباً ضیا قریشی صاحب نے اپنی شائع کردہ کتابوں کی سیل روک دی یا کتابیں ضائع کروادیں' یونیورسل بکس کے شبیر احمد خان نے کچھ حصہ ادنے پونے فروخت کیا۔ باقی ان کی وفات کے بعد ادھر ادھر بکھر گیا۔ الفیصل پبلشر کے پاس کتابیں ڈمپ ہیں۔ چوتھے پبلشر کے بارے میں ذاتی طور پر میں کچھ نہیں جانتا۔

O

مختلف حالات اور واقعات کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمن کسی موقع پر بھی اخلاقیات کو ملحوظ نہیں رکھتے اور نہ وہ روایات کا احترام کرتے ہیں۔ وہ رشید احمد صدیقی اور خواجہ غلام السیدین کے اقوال ان کا نام لے کر اور کبھی حوالہ دیے بغیر اتنی بلند آہنگی سے دہراتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں تہذیبی قدروں' مقدس روایات اور وضعداریوں کا ایک ہی تو پاسبان بچا ہے۔ مگر درحقیقت وہ خود ان اقدار و روایات کا تقدس پامال کرنے والے بلکہ ان کی آبروریزی کرنے والے شخص ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ملک میں ملا' سیاست دان' ادیب اور استاد ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہے۔ یہ چاروں کسی بھی معاشرے کی اخلاقی و تہذیبی زندگی کے نمائندہ' تمدنی زندگی کے ترجمان اور نسلوں کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ محتسب و واعظ جلوت میں کچھ کہتے ہیں جب خلوت اختیار کرتے ہیں تو کارِ دگر کرتے ہیں۔ اسی طرح استاد کی تعلیم و تدریس اس کے اپنے رخِ کردار سے مختلف ہے۔ فلسفی کے مکالمات اور ادیب کے مقالات کا ان کے شیوہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمن کے ہاں کچھ ایسی ہی مغائرت اور دوچہرگی پائی جاتی ہے۔ کوئی ان سے پوچھے رشید احمد صدیقی کا ثنی اور خواجہ غلام السیدین کا متبنی بننا کیا ضروری ہے۔

''ڈاکٹر سید معین الرحمن۔ شخص اور عکس'' کی مصنفہ اپنے آئیڈیل کی کردار نگاری کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''مجھے ڈاکٹر صاحب کے ایک کلاس لیکچر کی دو باتیں یاد آتی ہیں۔ انہوں نے غالباً رشید احمد صدیقی اور غلام السیدین صاحب کے حوالے سے کہی تھیں۔ ان باتوں کو ہم نے بہ اصرار لکھ لیا تھا اور پلو سے باندھ لیا تھا کہ:

جس قدر علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ سب ایک ذریعہ ہیں' یا ذریعہ ہونے چاہیں' زندگی کو شرافت' شائستگی اور کامیابی کے ساتھ بسر کرنے کا۔ اُن قدروں کی پہچان کا جو زندگی کو گہرائی اور معنی بخشتی ہیں اور اس

انداز فکر کا جو دماغ کو خوب اور نا خوب میں تمیز کرنا اور انسانی رشتوں میں محبت اور شیرینی بھرنا سکھاتا ہے۔۔۔'' [۔۔۔شخص اور عکس۔۔۔صفحہ 33.32]

ہمیں تو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تحریروں سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے شرق و غرب کے کونسے کونسے علوم پڑھے ہیں جن سے انہوں نے زندگی کو گہرائی اور معنویت بخشنے والی قدروں کو پہچانا ہے اور خوب و ناخوب کیا ہے؟ کیا کسی ایک شخص کی تصنیف' تالیف یا تحریر کو کوئی دوسرا آدمی اپنے نام سے یعنی اس کا مصنف و مؤلف بن کر متعارف کرائے' اُس میں جزوی تبدیلی کر کے یا اُس کی ترتیب بدل کر چھپوائے تو کیا اس کو اس فن اور پیشے کی اخلاقیات جائز قرار دے گی؟ ساری دنیا میں اس فعل کی پرزور مذمت کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن (5 درجن سے زائد کتابوں کے مصنف) پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ تین چار مصنفین (جن کا بہ تکرار نام لیتے ہیں) کے جملے اور فقروں کے ٹکڑے جوڑتے ہیں یا کسی بڑے مصنف کی پوری تحریر کو اپنے فقروں میں گوندھ لیتے ہیں مثلاً انہوں نے 23 اپریل 1986ء کو ایجوکیشن سوسائٹی گورنمنٹ کالج لاہور میں ''میری زندگی'' کے عنوان سے لیکچر دیا۔ سوسائٹی ہذا کی نائب صدر نائیلہ انجم کے مطابق:

''معین صاحب نے اپنی زندگی' اپنے رویوں' اپنے آدرشوں کے بارے میں بڑے دھیمے اور دھنک رنگ لہجے میں گفتگو کی۔ اس بات چیت کا کچھ حصہ میں شارٹ میں لکھ پائی۔ یہ پیشِ خدمت ہے۔''

[دل کی کتاب' صفحہ ۲۹]

ہمیں عزیزی نائلہ انجم کے بیان کو جھٹلانا مقصود نہیں۔ ہم نے برسوں معین صاحب کے' ایم اے کلاسوں کو' خطبہ استقبالیہ اور خطبہ الوداعیہ شریک محفل کے طور پر سنے ہیں۔ وہ گفتگو ہمیشہ قلمبند کر کے لاتے تھے اور پیروں کے پیرے رشید احمد صدیقی کے ہوتے تھے۔ ان کے یہ ایڈریس سن کر اساتذہ کو ہر بار پچھلے برس کے ان دونوں مواقع کے خطبے یاد آ جاتے تھے۔ اگر موصوف کو ان خطبوں پر اپنی تحریر یا تخلیق ہونے کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ کئی بار چھپ جاتے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن اپنا ایک فقرہ بھی پرنٹ میں لانے سے نہیں چوکتے۔ نائیلہ انجم کا ریکارڈ کیا لیکچر ''میری زندگی'' چودہ برس بعد دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اگر وہ لیکچر ڈلیوری کے قریبی برسوں میں چھپا ہوتا تو اس کی اشاعت کا اولیں حوالہ ''دل کی کتاب'' میں ''میری زندگی'' کے اختتام پر ضرور ہوتا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن اکثر اپنے ماخذ کا چپکے سے نام بھی لے دیتے ہیں۔ مبادا لبعد میں گرفت ہو تو وہ کہہ سکیں کہ میں نے تو وضاحت کر دی تھی۔ مثلاً لیکچر ''میری زندگی'' کے تعارف کے آخری سے پہلے پیرا گراف میں نائیلہ انجم نے لکھا ہے:

''آشفتہ بیانی میری' رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی ہے اور غلام السیدین صاحب کی نا تمام آپ بیتی کا نام ہے'' مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں' اس کے برعکس' معین صاحب نے کہا کہ مجھے آج جو کچھ کہنا ہے'

اُس کے لیے وہ بڑی حد تک سید ین صاحب کی زبان کا سہارا لیں گے۔ یہ اعترافات ''آشفتہ بیانی'' کے حامل ہوں تو بھی کچھ عجب نہیں۔''

[ڈاکٹر معین الرحمٰن نے یہ ''اعترافات'' تو کر لیے مگر ایک یہ اعتراف نہیں کیا کہ متذکرہ بالا ''تعارف'' پر ان کا کتنا قلم لگا ہے۔]

دوسرے نمبر پر یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کی تصانیف اور تحریروں کا اندازاً 95 فی صد [ابھی Statistics جمع نہیں ہوئے] واوین کے اندر مواد پر مشتمل ہے۔ اس بنیاد پر میں نے فنِ تحقیق کی ایک اور قسم قرار دی ہے اور اس کا نام ''واوینی تحقیق'' تجویز کیا ہے۔

پہلے الزام (وہ دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں) کی ایک مثال کا پس منظر یہ ہے جو مجھ سے حنیف شاہد نے بیان کیا۔

1977ء کی گرما کی چھٹیوں میں ڈاکٹر معین الرحمٰن لاہور آئے ہوئے تھے۔ ایک دن وہ اور میں (صدیق جاوید) سہ پہر تک اورینٹل کالج کے پرفیسروں اور اردو بازار کے پبلشروں سے ملتے ملاتے رہے۔ انہوں نے بتایا میری کتاب ''قائد اعظم اور لائل پور'' چھپ گئی ہے۔ مجھے اس کے کچھ نسخے درکار ہیں۔ آپ کو بھی ایک کاپی پیش کرتا ہوں۔ اس کے لیے اب ہم سنگِ میل چلتے ہیں۔ ان دنوں سنگِ میل صرف اسی دکان پر کاروبار کرتا تھا جو ان دنوں جلال الدین ٹرسٹ سرکلر روڈ پر ان کا سب آفس ہے۔ دکان پر پہنچے تو ڈاکٹر معین الرحمٰن مجھے چھوڑ کر بہت تیزی سے دکان کے اندر داخل ہو گئے۔ اچانک میں نے دیکھا۔ حنیف شاہد صاحب دکان کے باہر Projected Sill تھڑے پر ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ معین الرحمٰن سامنے دیوار کی شیلف پر جا کھڑے ہوئے ان کی پشت باہر سڑک کی طرف تھی۔ میں حنیف شاہد سے ہاتھ ملا کر بر بنائے مروت ان کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے تامل کیے بغیر اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' اس کتاب کا مضمون میرا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے میگزین (قائد اعظم نمبر مجلّہ ''روشنی'' گورنمنٹ کالج لائل پور) کے لیے کہا تھا۔ تم پنجاب پبلک لائبریری میں بیٹھے ہو۔ 1942ء کے اخبارات سے قائد اعظم کی لائل پور میں آمد کی روداد قلم بند کرو۔ میں نے بہت محنت سے یہ روداد لکھ کر انہیں بھجوا دی۔ تھوڑے دنوں بعد مجھے پروفیسر شیخ محمد سعید ڈائریکٹر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے قائد اعظم اور لائل پور کے حوالے سے ایک بات پوچھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ اس وقت آپ کے پاس کون بیٹھا ہے۔ انہوں نے کہا ''معین الرحمٰن'' (اب مجھے یاد نہیں حنیف شاہد نے شیخ سعید مرحوم کو مضمون کی کہانی بتانے کا ذکر کیا تھا یا نہیں) اس کے بعد میرا یہ مضمون ''روشنی'' میں چھپا یا نہیں مجھے معلوم نہیں ہو سکا کیونکہ وہ میگزین میں نے نہیں دیکھا۔ یہ کتاب ''قائد اعظم اور لائل پور'' اس مضمون کی بنیاد پر تیار ہوئی ہے۔ اس کی Padding معین الرحمٰن کی ضرور ہے۔ اس سے منسلک ایک اور کہانی ہے۔ میرا تعلق لائل پور سے ہے۔ میرا خاندان اور میرے

آبائی شہر جالندھر کے بیسیوں گھرانے 1947ء کے بعد لائل پور میں آباد ہوئے۔ میں گورنمنٹ کالج لائل پور کا طالب علم بھی ہوں اور اسی کالج میں لاہور تبادلے سے قبل 1975ء کے اواخر تک شعبہ اردو میں لیکچرار کے طور پر تدریس کی ہے۔ یہیں ایک ڈیڑھ برس معین الرحمٰن کے ساتھ تدریسی رفاقت رہی۔ بہر حال مجھے گورنمنٹ کالج لائل پور کے معاملات ومسائل کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ میرے جانے کے بعد ڈاکٹر معین الرحمٰن کا تین چار طالب علموں سے بگاڑ پیدا ہو گیا۔ ان کا تعلق سیاسی طور پر میاں عطا اللہ مرکزی وزیر ریلوے سے تھا۔ وزیر اور برسر اقتدار پارٹی کے عتاب سے معین الرحمٰن کو دو ارائیں پروفیسروں جناب افتخار احمد چشتی مرحوم (شعبہ علوم اسلامیہ) اور پروفیسر عبدالرحمٰن شاکر مرحوم (لیکچرار اردو) نے وزیر موصوف سے اپنی برادری اور رشتہ داری کے واسطے سے بچایا۔ میاں عطا اللہ کا عبداللہ پور کی مشہور میاں فیملی سے تعلق تھا۔ اسی خاندان کے میاں نور اللہ تقسیم سے قبل یونینسٹ (Unionist) وزیر تھے۔ تحریک پاکستان' مسلم لیگ (بعد ازاں نظام اسلام پارٹی) کے ممتاز راہنما میاں عبدالباری' میاں میجر معین باری اور میاں حامد یاسین بھی اسی خاندان کے فرزند ہیں۔ اس خاندان کی باغبانپورہ لاہور کی میاں فیملی اور میاں عبدالعزیز مالواڈہ کے خاندان سے بھی رشتہ داریاں ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس کتاب میں میاں فیملی کے تحریک پاکستان اور قائداعظم کے لائل پور میں استقبال میں کردار کو نمایاں کیا۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن کے سرورق پر قائداعظم کے ساتھ نیشنل گارڈ کا گروپ فوٹو ہے۔ اس میں چار پانچ سالہ میاں میجر معین باری بھی وردی زیب تن کیے بزرگوں کے قدموں میں بیٹھے ہیں۔ کتاب کے موضوع اور تاریخی طور پر نہایت موزوں اس گروپ فوٹو کو ڈاکٹر معین الرحمٰن نے دوسرے ایڈیشن کے ٹائٹل سے ہٹا دیا ہے۔ کتاب میں لائل پور کے بعض دوسرے بااثر خاندانوں اور ممتاز شخصیات کے کوائف اور خدمات بھی مصلحت کے تحت بیان کی گئی ہیں۔ یاد رہے کہ اوپر مذکور پروفیسر عبدالرحمٰن شاکر (جو اردو بورڈ آف سٹڈیز کے رکن بھی تھے) اس زمانے میں ڈاکٹر وحید قریشی اور سید معین الرحمٰن کے درمیان مفاہمت' مصالحت اور قربت کا باعث بنے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن پر اس الزام کا بھی خاصا چرچا ہوا کہ انہوں نے اپنی ایک شاگرد بشریٰ باسط کے ادا جعفری پر ایم اے اردو کے امتحانی مقالے کا ایک باب اپنے نام سے رسالہ ''نقوش'' لاہور میں شائع کروالیا۔ موصوف نے جواباً دعویٰ کیا کہ وہ میں نے ہی لکھ کر دیا تھا۔ اس جواب پر بہت دلچسپ تبصرے ہوئے۔ کسی نے کہا اول یہ مقالہ لکھ کر دیا کیوں تھا؟ اپنی طالبہ کو عطا کر دیا تھا تو اپنے نام سے کیوں شائع کرایا؟ کسی دوسرے نے پوچھا' کیا مستعار دیا تھا؟ کسی تیسرے نے کہا یہ کم ظرفی کا ثبوت ہے اور کسی نے کہا ادا جعفری سے کوئی غرض وابستہ کر رکھی تھی تو کسی اور حوالے سے مقالہ لکھ لیتے۔ کوئی ستم ظریف بولا'' پہلے ہی ادا جعفری کی مسلسل تحریر کے ٹکڑے بنا کر انہیں مقالہ کی شکل دی تھی۔ اب ان ٹکڑوں کو مربوط کرنے کا کام رہ گیا تھا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

معین الرحمٰن پر دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ اپنی توسیع ذات کے لیے خود مکمل انٹرویو' اپنی ذات پر توصیفی مضمون' اپنے کتب خانے اور اس کے مختلف گوشوں پر مضمون لکھ کر کسی رفیق کار' بیٹیوں' بہو' بہن یا کسی شاگردہ کے نام پر چھپواتے ہیں۔ مثلاً کتاب ''دیوانِ غالب'' نسخۂ خواجہ۔ تجزیہ و تحسین۔ مرتبین ڈاکٹر سید معراج نیر اور اصغر ندیم سید۔ موخر الذکر نے اپنے ایک دوست کے سامنے ''ہمارا صرف نام ہے'' کہہ کر زبانی اعتراف کیا تھا۔ یہ کتاب چالیس نامور اور معروف لوگوں کے مختصر اور قدرے مفصل توصیفی مضامین کا مجموعہ ہے اور مختصر ارتسامات کے زیر عنوان 30 اصحاب کی مختصر آرا صفحات 307-313 پر محیط ہیں۔ اگرچہ یہ مجموعہ ڈاکٹر تحسین فراقی اور سید قدرت نقوی وغیرہ کے (دیوانِ غالب' نسخۂ خواجہ کے حوالے سے) تجزیاتی کتابچوں کے جواب میں مرتب اور شائع کیا گیا ہے مگر بعد کے خیال کے مطابق اسے ''ڈاکٹر سید معین الرحمان صاحب کی ستاون ویں سالگرہ 5 نومبر 1999ء کے مبارک موقع پر'' بطور ارمغان نذر کیا گیا ہے۔ صفحہ 9 پر نذر کی سرخی کے تحت تحریر میں ایک جگہ بتایا گیا ہے کہ:

''یہ مضامین زیادہ تر خود استاد محترم کی توجہ دلانے پر ضبط تحریر میں آئے۔ ان نگارشات کی جمع و ترتیب کی عزت ہمارا مقسوم ٹھہری۔۔۔''

مندرجہ بالا سطور سے اس مشہور بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے علمی اعتراضات کے جواب میں ناکام ہو کر مختلف اطراف میں خود رحم کی اپیل کے انداز میں خط لکھے اور بااثر شخصیات سے سفارشیں کروائی ہیں۔

ایک اور کتاب ''بر سبیلِ غالب'' از ڈاکٹر معین الرحمٰن مرتبہ: سید وقار معین بھی اسی قسم کی ہے۔ اس کا بھی اوپر کہیں ذکر آ چکا ہے۔

''نقوشِ غالب'' شائع کردہ الوقار لاہور 1995ء بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصنیف قرار دی گئی ہے۔ کتاب کی جلد اور اندرونی ٹائٹل پر مصنف کے مقام پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن لکھا گیا ہے۔ جبکہ یہاں مرتب لکھا جانا جائز اور درست ہوتا۔ ان کے سوانحی کوائف مرتبہ: انبساط امین عباسی (ہمشیرہ) کے تصانیف پر پیراگراف میں بھی اس کتاب کو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصنیف بتایا گیا ہے (دل کی کتاب: صفحہ ۳۹۷) 389 صفحات کی اس کتاب (نقوشِ غالب) کے چھوٹے بڑے مندرجات چالیس سے زائد لکھنے والوں سے منسوب ہیں۔ کئی تحریریں یہاں مکرر شائع ہوئی ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں ''تحقیق نامہ'' جرنل شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کے دو تین شماروں سے لے کر ایک جلد میں شائع کر دی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کتاب کو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصنیف کیوں شمار کیا جائے۔

اس سوال کا جواب ان کے ذاتی حالات' معاشرتی اسباب' نفسیاتی میلانات' ان کی دبی ہوئی خواہشات' ناکام تمناؤں اور آرزوؤں اور ان کی زندگی کے مختلف احوال میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ یہ فارمولا

کچھ ان کے لیے وضع نہیں کیا گیا۔ دنیا کے ہر انسان کی سائیکی کا مطالعہ انہی عناصر کی کارفرمائی کے تجزیہ سے کیا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے ماحول کے اثرات کا اسیر ہے۔ البتہ ہر آدمی کی شخصیت کا ایک پراسرار حصہ ہے جو ان اثرات کی زد میں آکر مختلف طرح سے بر سر عمل ہوتا ہے۔ کسی شخصیت میں توازن اور اعتدال کا حصہ نمایاں رہتا ہے۔ کسی میں کوئی ابنارمیلٹی اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عجیب جبر ہے کہ سماج ہی ایک آدمی کو بناتا ہے اور بگاڑتا ہے اور سماج ہی اپنے افراد سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ مخصوص ضابطوں اور حدود سے تجاوز نہ کریں۔

ڈاکٹر معین الرحمن کے غیر واضح کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی ٹھوکریں اور حالات کے تھپیڑے کھاتے ہوئے چلے بڑھے ہیں۔ قیاس ہے انہیں بچپن' لڑکپن اور جوانی میں کافی خراب اور برے حالات کا سامنا ہوا۔ انہیں اس سفر میں برے اور بدکردار لوگ بھی ملے ہوں گے۔ اچھے' صاحب کردار' خوش خلق اور شائستہ لوگ بھی ان کی زندگی میں آئے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے ان تجربات نے معین الرحمن میں Calculation کا مادہ بھر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی زندگی میں خوشگوار دن آنے لگے اور خوش قسمتی کا عمل دخل شروع ہوا۔ یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں۔ ہم بلاناغہ دیکھتے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ وہ ایک آدمی کو اڑا کر خوشحالی' خوش نصیبی' بلند منصبی' ترقی اور عروج کے آسمانوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ جھونکا محکمہ تعلیم اور شعبہ ادب ہی میں نہیں' زندگی کے ہر شعبے میں آتا ہے۔ پھر بلندیوں پر اڑان کے دوران حوصلہ' ظرف' ہمت' ایثار' ہمدردی' فیاضی' وقار' شائستگی' رکھ رکھاؤ' غرض کتنی ہی اخلاقی قدروں اور رویوں کی آزمائش کا وقت آتا ہے۔ پھر اس بلندی سے اپنے اپنے ظرف' تقدیر' قسمت اور وقت کے مطابق کوئی زمین پر گر کر فنا ہو جاتا ہے' کسی کو زمین پر زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی ہے' کوئی اوپر کہیں کسی اور سطح پر رک جاتا ہے۔ اُن کے زمین پر رہ جانے والے کچھ بے بال و پر ساتھی' ان بلند پروازوں سے حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ وہی جھونکے ان بیوقوفوں کی آگ کو ہوا دے کر بھڑکا دیتے ہیں اور بھسم بھی کر دیتے ہیں۔ یا یوں کہیے' شاہینی کسی شاہین کی کاوش و کاہش کا حاصل نہیں' وہ ایک عطا ہے۔ اس عطا پر شکر گزاری تو واجب ہے مگر اس پر ناز' غرور و تکبر روا نہیں۔ خیر پہلا استعارہ ہی اپنی اصل سے بہت وضاحتی بیان سا بن گیا اور اس میں سے دوسرے استعارے کا لاوا پھوٹ نکلا۔ ذکر تھا ڈاکٹر معین الرحمن کی زندگی کے مختلف مرحلوں کا' انہوں نے کراچی میں دورانِ تعلیم مولوی عبدالحق کے علاوہ کئی مشہور ادیبوں اور شاعروں کو دیکھا ان کے دل میں ادیب بننے کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے اپنی توفیق کے مطابق لکھنا لکھانا شروع کیا۔ کسی نیک ساعت میں قدرت انہیں سید وقار عظیم کے پاس لے آئی ان کی معرفت چند بڑے لوگوں سے ملاقات' کارگزاری اور ملازمت کے مواقع ملے۔ کوئی سات برس قبل جس پبلک سروس کمیشن سے وہ لیکچرر کا انٹرویو پاس نہ کر سکے' وہاں سے وہ پروفیسر ہو کر لائل پور پہنچ گئے۔ تیس برس قبل پی ایچ ڈی کی طرح انہیں پروفیسری بھی ارزانی ہوئی تھی۔ چھوٹی عمر بڑا منصب' بڑا منصب پانے والا خود بھی حیرت زدہ' بوڑھے کولیگ بھی حیران۔ موصوف کو بڑا بننے کا

(جائز) شوق۔ اپنے لیٹر ہیڈ چھپوا' اپنے نام کی مہریں بنوا' جن پر وائس پرنسپل' صدر و پروفیسر اردو کے عہدے کندہ (وائس پرنسپل اور صدر کے باقاعدہ عہدے نہ تھے) کتاب پر ان عہدوں کا اعلان۔ لائل پور میں پروفیسر حشمت خان' میاں نامدار خان' ڈاکٹر عطا محی الدین اور سید کرامت حسین جعفری جیسے پرنسپل' شور علیگ' ڈاکٹر صفدر حسین' مرزا منور' ایم آر آصف' خواجہ کرامت' ظفر اقبال' زیڈ ڈی قریشی' رضی واسطی' مبشر احمد' مفتی لطف اللہ' حسن رضا پاشا' ڈاکٹر غلام سرور خاں نیازی کیا کیا پروفیسر اور لیکچرر آیا' لاؤڈ سپیکر استعمال کیے بغیر اپنا وقت گزار کر چلا گیا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن گورنمنٹ کالج لاہور پہنچ کر آٹھ دس سال بعد جی سی کے شاک سے نکلے تو انہیں Celebrity بننے کا خیال آیا۔ معین الرحمٰن صاحب نے بڑے آدمیوں کو اپنی شہرت اور توسیع ذات کے لیے منصوبہ بندی اور کاوش و کاہش کرتے دیکھا ہوگا یا اخبارات و رسائل سے اس کا اندازہ کیا ہوگا۔ مگر انہوں نے سیاست دانوں کے ذرائع' وسائل' طریقوں اور مقاصد کا خیال نہیں رکھا۔ معین صاحب کو بڑا آدمی بننے کا جائز طور سے شوق ہے اور انہیں اس کی تمنا رکھنے کا ہر اعتبار سے حق ہے لیکن معاشرہ اور اس حوالے سے ادب بھی کسی منفی طریق کار اور رویے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا اپنی شہرت اور ترقی کی طرف کم و بیش ہر اقدام مغالطہ انگیزی اور چالبازی پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ایک اور ہتھکنڈا خوشامد اور لجاجت ہے۔ روزانہ کی زندگی میں انہوں نے بڑی نرمی' ملائمت' شفقت' ہمدردی' غم گساری' وضعداری' عاجزی' شائستگی' نفاست اور معاونت کا پوز بنایا ہوتا ہے۔ ان رویوں کا اظہار وہ دلچسپ طریقوں سے کرتے ہیں۔ مثلاً 1965ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں اپنے ششماہی عارضی تقرر کے دنوں میں وہ ایم اے سال اول کو مضمون نگاری کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ لیکچر کے بجائے مضمون ڈکٹیٹ کراتے تھے۔ پانچ سات مضمونوں کے بعد انہوں نے ایک دن کلاس ٹیسٹ رکھا۔ پرچہ سوالات میں انہوں نے املاء کرائے گئے مضامین کے علاوہ ایک نیا عنوان دے دیا۔ اس میں اوّل' دوم اور سوم آنے والے طلباء و طالبات کو کتابیں انعام میں دیں۔ پھر اس کلاس کو ایک دوسرے موقع پر نوازا۔ اس کلاس کی ایک پرانی طالبہ اپنے ایم اے تھیس کی چھتیس سینتیس برس بعد اشاعت کے موقع پر لکھتی ہیں:

''پریویس کا نتیجہ آیا تو معین الرحمٰن کے پرچے میں کئی طلباء' طالبات نے یکساں امتیازی نمبر لیے اور ان سب کو معین الرحمٰن کی طرف سے کتابیں عطا ہوئیں۔۔۔'' [پروفیسر مسرت جبیں: آل احمد سرور (بحیثیت نقاد) الوقار لاہور' 2002ء' صفحہ 18]

اس استادانہ عطا میں مضمر جذباتی اپیل اور طفلانہ شوخی دیکھنے کی چیز ہے۔ جو بعد میں طفلانہ رنگ بھی لائی۔

خود معین الرحمٰن لکھتے ہیں:

''ایم اے پریویس کا نتیجہ آیا تو میں نے مسرت جبیں کے منجملہ کئی دوسرے ہونہار طلبا اور طالبات کو ایک مشترک مضمون پر مبنی خط لکھا۔'' یہ خط 25 مئی 1966ء کا محررہ ہے۔ اس وقت معین الرحمٰن غالباً اپنے چھ ماہ پورے کر چکے تھے اور کالج سے رخصت ہو چکے تھے اور آئندہ اس کالج میں ایک دن کے لیے بھی ان کے دوبارہ تقرر کا امکان نہ تھا۔ بہر صورت متذکرہ خط کی ترسیل پبلک ریلیشنگ کے فن سے ان کی عملی دلچسپی کا ثبوت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہنگامی، عارضی، سطحی اور کاغذی ہوتے ہیں۔ بظاہر اس فعل میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک قابلِ تعریف بات کہی جا سکتی ہے۔ مگر معین الرحمٰن کی زندگی کے عمومی مطلب پرست رویوں سے ہم آہنگ ہے۔ وہ اپنے حقیر مفادات، معمولی کاموں اور چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں جن کا بیان ہماری کم ظرفی کو ظاہر کرے گا۔

یہ شکایت بھی سننے میں آتی رہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نسبتاً دلیر اور بے باک لڑکیوں کو اہمیت دیتے تھے۔ ان سے عید کارڈ، نیا سال، سالگرہ کے کارڈوں کا تبادلہ، کسی طالبہ کی سالگرہ یا معین الرحمٰن کی سالگرہ کا کیک، منگنی کی مٹھائی، شادی کی ودھائی، ایم اے پریویس کو استقبالیہ اور ایم اے فائنل کو الوداعیہ، اگرچہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں معمول کی تقریبات ہوا کرتی ہیں مگر موصوف کے لیے یہ دن گویا عید کے دن ہوتے تھے۔ متذکرہ تمام مواقع پر طالبات دل کھول کر کیمروں پر روپیہ خرچ کرتی تھیں۔ موخر الذکر دو تقریبات میں پرنسپل صاحب اور ایم اے پڑھانے والے اساتذہ بھی مدعو ہوتے تھے۔ شعبہ میں ان کی کئی دلچسپ مصروفیات رہی ہیں مثلاً ہر سیشن میں مکالمہ میں ماہر کوئی طالبہ بھی آ جاتی تھی، جس کی صدر شعبہ کے دفتر میں بلاناغہ گھنٹوں نشست کا معمول ہوتا تھا۔ یہ ابنارمل صورت حال اور فضا شعبہ اردو پر چھائی رہتی۔ اس پر طالب علم چہ میگوئیاں کرتے۔ اپنے شعبہ کے علاوہ دوسرے شعبہ کے اساتذہ بھی کوئی نہ کوئی کمنٹ کرتے یا فقرہ کستے گزر جاتے تھے۔

خوشامد کرنا بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن کی طبیعت اور فطرت کا جزو غالب ہے۔ ظاہر ہے ایسا شخص کہیں بڑھ کر اپنی خوشامد میں بھی لطف لیتا ہے۔ کبھی کبھی معلوم ہوتا ہے، خوشامد موصوف کا وظیفہ حیات ہے۔ اگر کوئی عادت شخصی سطح تک رہے اور اس کے اثرات کسی دوسرے فرد پر مرتب نہ ہوتے ہوں تو کسی کو کسی کے شخصیاتی حسن و قبح پر تنقید یا اعتراض کا حق نہ ہونا چاہیے لیکن جب کوئی فرد اپنی کسی معاشرتی، تمدنی سرگرمی کی بنا پر کسی چھوٹی بڑی حیثیت سے پبلک فگر بنتا ہے تو اس کی ہر حرکت یا جنبش پر گرفت کا حق ہی نہیں بلکہ اس فرد پر فرض ہے جس کے نوٹس میں یہ قابل گرفت حرکت یا جنبش آتی ہے۔ ہم یہاں خوشامد کی اس نوع کا ذکر نہیں کرتے جو ڈاکٹر معین الرحمٰن کو کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں دفتری نظام کے جبر اور المیہ سے گزرتے ہوئے کرنا پڑی ہوگی۔ اس وقت یہاں دو مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔

''ذکرِ عبدالحق'' مولفہ ڈاکٹر معین الرحمٰن اس وقت میرے سامنے نہیں ہے لیکن مجھے یاد ہے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن (1975ء) کا انتساب دوسرے ایڈیشن (1985ء) کے وقت منسوخ کر کے نیا انتساب ڈاکٹر عبدالمجید اعوان (موجود) پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اور سابق پرنسپل پروفیسر خواجہ منظور حسین کے نام کیا گیا۔ اس تبدیلی کی اہمیت وہ لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے شخصیات اور کرداروں کے Motives کا مطالعہ کر رکھا ہو۔

''تحقیق نامہ'' ریسرچ جرنل اردو شعبہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شمارہ نمبر 8 کا ایک گوشہ ''لطف آگہی'' کے عنوان سے ہے۔ یہ ایک کتاب کا نام ہے۔ اس کتاب اور اس کے مصنف کا تعارف ڈاکٹر معین الرحمٰن کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''موصوف دانشور اور اہلِ تعلیم ڈاکٹر شہزاد قیصر محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کے سیکرٹری ہیں۔ انگریزی، اردو اور پنجابی میں اُن کی تصانیف کی پذیرائی ہوئی ہے۔ پنجابی ادب پر انہیں صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی مل چکا ہے۔

اپنے انشائیوں کی کلیات ''لطف آگہی'' کے لیے انہوں نے '' کچھ اپنے بارے میں'' (دو صفحہ) لکھا ہے۔ اس مختصر لیکن موثر تحریر میں انہیں اپنے بارے میں جس خود اعتمادی اور خوش ذوقی کے ساتھ ''پورا سچ'' بولنے کی توفیق ہوئی ہے اس کی مثالیں ہمارے خود نوشت ادب میں بہت عام نہیں۔۔۔ میرے فوری بس میں نہیں ورنہ میں اسے کسی نہ کسی نصابی انتخاب میں تو ضرور شامل کر لیتا۔'' (صفحہ 37)

یہ تو ماہرین تعلیم ہی ڈاکٹر معین الرحمٰن کو بتائیں گے کہ بس میں ہوتے ہوئے بھی نصاب میں کیا شامل کیا جاتا ہے اور کیوں؟ ہمارے بھی بس میں ہوتا تو ہم اہلِ وطن کو بتاتے کہ تعلیم کے شعبہ میں بھرتی کا مال کتنا ہے۔ اب زیادہ دورانِ ملازمت Length of Service یا ساز باز سے سینارٹی پانے والے محکمہ تعلیم کی کلیدی آسامیوں پر متمکن ہو گئے ہیں اور ان کے ہاتھ میں قومی تعلیم کے فیصلے اور پالیسی ہے۔ اس کے تشویش ناک نتائج سب کے سامنے ہیں۔

مجلّہ ''تحقیق نامہ'' شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور شمارہ: 6-7 بابت 98-1997ء یہ شمارہ 384 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مجلّہ مندرجہ ذیل سات سیکشن میں منقسم ہے۔ ان سے پہلے صفحہ 9 اس سرخی سے شروع ہوتا ہے۔ '' کچھ اس شمارے کے بارے میں'' اس کے مقابل گورنمنٹ کالج لاہور کا Insignia ہے جس کے نیچے اوپر نیچے دو سطروں میں ''Dean of Arts'' اور پروفیسر و صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور چھپا ہے۔ غالباً یہ دو سطریں لیٹر پیڈ کا چربہ ہیں۔ اس تعارف کے پہلے دو فقرے یہ ہیں:

''سال 1997ء اور 1998ء کو غالب کے دو صد سالہ جشنِ ولادت کے طور پر منانے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ ''تحقیق نامہ'' کی زیرِ نظر اشاعت اسی سلسلے کی کڑی ہے۔۔۔''

دو صفحوں کا یہ تعارف "27 دسمبر 1997ء" کی تاریخ "دستخط" اور "ڈاکٹر معین الرحمٰن" پر ختم ہوتا ہے۔

اس شمارہ کے صفحہ 11 پر سرخی "حرفے چند" (مہمان اداریہ): کے نیچے 25 سطری تعارف ہے۔ پہلا پیرا جمیل الدین عالی کی تعریف و توصیف اور ان کی علمی اہمیت پر محیط ہے۔

دوسرے پیرا میں بتایا گیا ہے:

"عالی صاحب نے اب سے کوئی تیس برس پہلے 1969 میں غالب کی صد سالہ برسی کے تناظر میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ۔۔۔ جمیل الدین عالی کی یہ تحریر (مطبوعہ "جنگ" کراچی 12 مئی 1969ء) ان کی دوسری بہت سی تحریروں کی طرح' کسی کتاب کا حصہ نہیں بن پائی۔۔۔۔ اگلے صفحات میں جمیل الدین عالی کا یہ اظہاریہ "تحقیق نامہ" کی زیرِ نظر اشاعت غالب کے "مہمان اداریے" کے طور پر محفوظ اور پیش کیا جا رہا ہے۔ (ڈاکٹر معین الرحمٰن)

اب یہ قارئین کا فیصلہ ہے کہ وہ سید معین الرحمٰن کی مندرجہ بالا کدو کاوش کو خوشامد کے زمرے میں رکھیں گے یا نہیں؟ اس موقع پر عالی صاحب کی قدر شناسی کا شایانِ شان علمی طریقہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ "عالی کی شاعری پر غالب کے اثرات" جیسے کسی موضوع پر مقالہ لکھ کر یا لکھوا کر شائع کرتے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کو نقل کی بھی عادت ہے۔ ان کو کسی نقل کا کوئی موقع ملنا چاہیے۔ صہبا لکھنوی نے مہمان اداریے لکھوانے کا سلسلہ تادیر قائم رکھا۔ سید معین الرحمٰن کو خیال آیا۔ عالی صاحب میری پروموشن کے لیے متعدد کالم لکھ چکے ہیں۔ عالی صاحب کی احسان مندی کے اعتراف کا یہ سنہری طریقہ ہے۔

راقم نے زیرِ نظر "تحقیق نامہ" کے مندرجات میں "مہمان اداریہ" کے آگے عالی صاحب کا نام پڑھا تو خیال کیا کہ اس مجلّہ کا مسودہ عالی صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا ہوگا۔ عالی صاحب نے اس کے حوالے اور مطالعہ سے اداریہ قلم بند فرمایا ہے مگر یہاں تو کھیل ہی دوسرا نکلا۔ بہر حال زیرِ نظر غالب نمبر کے سات سیکشنوں کے عنوانات یہ ہیں:

1۔ تراجم غالب

2۔ مطالعات غالب

3۔ جہانِ غالب

4۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی

5۔ گیتا رضا اور غالبیات

6۔ نادراتِ غالب

7۔ متفرقات اور متعارفات

ڈاکٹر معین الرحمٰن ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ایک مثال دیکھیے۔ ایک

سینئر سی ایس پی کی خوشامد کا موقع پیدا کر لیا۔ اسی سے اپنے دو تین ناپسندیدہ زعما کی تنقیص کا پہلو ابھار کر اپنا سینہ ٹھنڈا کیا۔ ان زعما کے تقابل اپنی تعریف اور برتری کا بیان تازہ کیا اور اپنی انا کی تسکین کا سامان کیا۔ جب کوئی آدمی ہینڈ گرینیڈ چلاتا ہے تو اس میں کئی دفعہ چلانے والے کے اپنے ہاتھ اڑ جاتے ہیں یا کوئی اپنا ساتھی زد میں آ جاتا ہے۔ درج ذیل سیکشن میں ایک تبصرہ نے کچھ ایسا ہی کام کیا ہے۔

سیکشن ۲ بعنوان ''نادرات غالب'' میں چوتھے نمبر پر مضمون اور مصنف کا نام حسب ذیل ہے:

۴۔ ایک غالب نمبر' چوتھائی صدی قدیم تبصرہ۔ ظہور الحق شیخ

مجلہ کے صفحہ 324 پر مضمون کا عنوان:

''راوی کا غالب نمبر

ایک چوتھائی صدی سے زیادہ قدیم تبصرہ

ظہور الحق شیخ''

جلی حروف میں درج ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا تحریر کیا ہوا ڈیڑھ صفحہ کا تعارف ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''رسالہ ''راوی'' (مجلہ گورنمنٹ کالج لاہور) کا غالب نمبر اپریل 1969ء میں شائع ہوا۔ پرچے کے نگران پروفیسر محمد منور تھے۔ مجلس ادارت میں اجمل نیازی (مدیر) احمد سعید چمن (مدیر معاون) اور بطور نائب مدیر اطہر وقار عظیم اور محمد جاوید کے اسما شامل ہیں۔

''راوی'' کے اس ''غالب نمبر'' پر گورنمنٹ کالج لاہور کے گزٹ 27 صفر 1389 ہجری/15 مئی 1969ء میں ایک تبصرہ شائع ہوا۔

''راوی پر یہ تبصرہ ظہور الحق شیخ کا لکھا ہوا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ اس مختصر اور موثر تحریر نے جو جرات اظہار کی ایک اچھی مثال ہے' اس زمانے کے کالج اور شہر کے ادبی حلقوں میں ضرور ایک تحرک پیدا کیا ہوگا۔۔۔ تبصرے کی ندرت اور معنویت کے پیش نظر اسے قند مکرر کے طور پر پیش اور محفوظ کیا جا رہا ہے۔

ظہور الحق شیخ نے اس زمانے میں جی سی (گورنمنٹ کالج لاہور) سے انگریزی میں ایم اے کیا اور ''اپنی بے شمار صحبتیں' دوپہریں اور شامیں'' پروفیسر صدیق کلیم کے ساتھ تراجم پر مبنی ایک مجموعہ مرتب کرنے میں صرف کیں۔ ''نئی تنقید'' کے نام سے یہ کتاب 1969ء میں سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی گورنمنٹ کالج لاہور کی جانب سے شائع ہوئی۔۔۔ اس کتاب نے جسے ''جی سی'' میں جدید تنقید کی اساسی دستاویز بھی کہا گیا' نئے مذاق سخن کی پرورش میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ظہور الحق شیخ آج کل پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج لاہور کے پرنسپل کے طور پر حکومت پنجاب سے وابستہ ہیں۔'' (ڈاکٹر سید معین الرحمان)

نوٹ: ظہور الحق شیخ مرحوم سیکرٹری ایجوکیشن حکومت پنجاب بھی رہے۔ ان کے افسانے رسالہ ''سویرا'' لاہور میں چھپتے تھے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا تھا۔ ظہور الحق شیخ چند برس قبل وفات پا گئے ہیں۔ (ص۔ ج)

ہم ڈاکٹر معین الرحمٰن کی انا پرستی اور شوقِ خوشامد کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ظہور الحق شیخ مرحوم کا مضمون بار دگر شائع کیا۔ اگر ہمیں اردو ادب میں (تنقید اور تحقیق) کی صحت اور زندگی مقصود ہے تو ہمیں تبصرہ نگاری میں ظہور الحق شیخ کی پیروی کرنی چاہیے۔ افسوس کہ ظہور الحق شیخ مرحوم سول سروس میں جانے کے بعد خود اپنے اس انداز میں کچھ نہ لکھ پائے۔

ظہور الحق شیخ مرحوم کا پہلا پیرا قند مکرر کے طور پر دیکھیے:

''ہر شاعر اپنے تہذیبی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ہر صورت حال میں اس کے ہنگامی اور مقامی رنگ کے باوجود ایک آفاقیت پنہاں ہوتی ہے' جو شاعر جتنا گہرا شعور رکھتا ہے' یہ آفاقیت اس میں اتنی ہی گہری ہوتی ہے۔ وقت حالات کی نت نئی صورتیں بناتا ہے مگر شاعر اپنے ہمہ گیر شعور کے باعث ہر صورتحال میں نئے معنی اختیار کر لیتا ہے۔ ایک عظیم شاعر کو زندگی دینے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ہر نئی صورت حال میں اس کے کلام کی نئی سچائی دریافت کی جائے۔ غالب صدی کی صد سالہ برسی کا یہی مقصد ہے' اور اس لیے ''راوی'' کا غالب نمبر شائع کیا گیا ہے۔۔۔

اس معیار پر ''راوی کے صرف چار مضامین ہی پورے اترتے ہیں:

1۔ غالب' جدید تنقید کی نظر میں	صدیق کلیم
2۔ غالب خستہ	ڈاکٹر محمد اجمل
3۔ ہمارے لیے غالب کی حیثیت	جیلانی کامران
4۔ غالب کی چند معدوم تصنیفات	سید معین الرحمٰن''

(آخر الذکر مضمون میں غالب کے کلام کی کون سی نئی سچائی دریافت کی گئی ہے۔ ظہور الحق شیخ مرحوم حیات ہوتے تو ان سے استفسار کرتے۔ غالباً اس مضمون میں سنین کے تانے بانے میں مضمون نگار نے کلامِ غالب کی کوئی توجیہہ نہیں کی۔ اس لیے معین الرحمٰن کا بچاؤ ہو گیا)

مضمون نگار نے متذکرہ غالب نمبر کے مضمون نگار شرکاء' ڈاکٹر عبید اللہ خاں' مرزا محمد منور' نصیر احمد ناصر' نصیر احمد زار' ڈاکٹر آغا یمین' انور سدید' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' ڈاکٹر عبادت بریلوی' ڈاکٹر عبداللہ' وقار عظیم' احمد ندیم قاسمی اور ن۔ م۔ راشد کو کمال چابکدستی اور ذہانت سے ایک ایک دو دو جملوں میں اڑا دیا ہے۔

ظہور الحق شیخ مرحوم کے مضمون کا حوالہ ہم نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی دو ایک کرداری خصوصیات بیان کرنے کے لیے دیا تھا۔ اس سلسلے میں ہم شیخ مرحوم کے مندرجہ ذیل اقتباس میں سے استنباط کرنا چاہتے

تھے۔ وہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۔۔۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تنقید کچھ اس طرح ہے۔۔۔شاعری قافیہ پیمائی نہیں' معنی آفرینی ہے۔حمزہ کا قصہ نہیں' دل گداختہ کی تفسیر ہے۔لڑکوں کا کھیل نہیں' جزو میں کل کی نمائش ہے۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔سارا مضمون ایسی ہی شاندار زورِ خطابت کی دلیل ہے"(تحقیق نامہ 6۔7' صفحہ 238)

ظہور الحق شیخ (مرحوم) کے محولہ بالا مضمون کی "تحقیق نامہ" کے اسی شمارہ (جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی" کے عنوان سے ایک گوشہ قائم کیا گیا ہے) میں اشاعت ڈاکٹر معین الرحمٰن کی کم نظری کی دلیل ہے۔انہوں نے ایک لحظہ کے لیے یہ خیال نہ کیا کہ ظہور الحق شیخ مرحوم کے مندرجہ بالا چار فقرے "گوشۂ فرمان" کو کیسا بے حقیقت بنا دیں گے۔اس مضمون کی مکرر اشاعت کا محرک جذبہ صاف طور پر یہ نظر آتا ہے کہ اس میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مضمون کی ایک جملے میں تعریف کی گئی ہے جب کہ مضمون نگار نے ان کے ممدوح ڈاکٹر فرمان فتح پوری سمیت متعدد اکابر ناقدین کو رد کر دیا ہے۔اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے معمولی مفاد پر اپنے ممدوحین اور دوستوں کو قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

O

مصنفہ کتاب "ڈاکٹر معین الرحمٰن۔شخص اور عکس" کے تعارفی مضمون "میرا آئیڈیل" کی ریڈنگ بڑی تکلیف دہ اور تحیر زا ہے۔ریڈنگ تکلیف دہ اس لیے ہے کہ ایک تو مصنفہ سید معین الرحمٰن کے رفقائے کار اور اپنے اساتذہ کے لیے ایسے "توصیفی استعارے" استعمال کرتی ہیں جسے 'برے نام' کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے اپنے بیانات سے وہ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کی شعبہ جاتی سیاست سے ناقابل یقین طور پر جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کے بیان سے ڈاکٹر معین الرحمٰن شعبہ جاتی حوالے سے ذہنی خلفشار اور جذباتی بحران کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔موصوفہ کے روایت کردہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بیانات سے ان کی بحیثیت صدر شعبہ جیسی جھنجھلاہٹ ظاہر ہوتی ہے وہ حیران کن ہے۔سید صاحب کے درپئے آزار لوگوں یا مخالفوں کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے پورے سٹاف نے بحیثیت مجموعی ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جن رفقائے کار کو اپنے قریبی معتمد ہونے کا تاثر دیتے یا یقین دلاتے تھے وہ بباطن ان سے بھی مطمئن نہ تھے۔اب تک کے شواہد کے مطابق وہ اپنے جذبات صرف موصوفہ سے Share کرتے تھے۔مثلاً مصنفہ کہتی ہیں:

"ان (ڈاکٹر معین)۔۔۔سے لوگ زیادتی کر جاتے ہیں۔۔۔خط میں مجھے لکھ دیتے ہیں۔۔۔ ٹیلی فون پر مجھے بتائیں گے۔۔۔(صفحہ 31)

"سنتی ہوں کہ ان دنوں "جی سی" میں ایک دو "فارغ البال" [غالباً معین صاحب نے ریٹائرڈ کے

معنوں میں اسے چلنے دیا ہے] سیانے نیارے" کسی ہشکارے پر ڈاکٹر صاحب کے سکون کے درپے ہیں۔ یہ وہ "تہمتی معلم" ہیں جو ہزار منت وزاری اور سعی و سفارش [ڈاکٹر صاحب آپ کو بھی پورا سچ نہیں بتاتے' کبھی ان کی اپنی روداد سنیے] سے شعبے میں آجانے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن ڈاکٹر صاحب کے بقول یہ اپنی "اصل" کے اسیر رہے' اس سے ابھر یا نکل سے (سکے)' نہ بلند ہو سکے ("جی سی" انہیں سنوار سکا' نہ بگاڑ سکا")(صفحہ 32)۔۔۔قصور کس کا؟

مصنفہ کہتی ہیں:

"ڈاکٹر صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ:

"جی سی" سے وابستہ" ہر استاذ' لازماً بہت ہی اچھا معلم اور بافیض انسان ہو۔ اس کی تو محض آرزو ہی کی جاسکتی ہے۔ عملاً یہ ممکن نہیں" (صفحہ 33)

یہ اقتباس آدمی کی ایک بوالعجبی کی کیسی عمدہ تصویر ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر خوبی کا خزینہ سمجھ کر دوسروں کی عیب جوئی اپنا استحقاق گردانتا ہے۔

مصنفہ نے مندرجہ بالا اقتباس کے تسلسل میں لکھا ہے:

"لیکن وہ (معین) اس پر ضرور اصرار کرتے ہیں کہ:

"جی سی" سے وابستہ معلم' سنجیدگی' ثقاہت اور شرافت ونفاست کے" کم سے کم" معیار پر تو ضرور پورا اترتا ہو!" (صفحہ 33)

اب معلوم نہیں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے "جی سی" سے وابستہ معلم کے علم وفضل' تصنیف وتالیف اور تحقیق کے کم سے کم معیار پر پورا اترنے کا تقاضا کیوں نہیں کیا۔ ثقاہت اور نفاست کی کیا شرائط ہوتی ہیں۔ کیا یہ شرائط سراسر موضوعی ہیں یا معروضی اور کس حد تک کیا ہیں۔ شاید ثقاہت اور نفاست کے معیار مختلف نسلوں کے نزدیک مختلف رہے ہیں۔ مثلاً راجہ ایف ایم ماجد مرحوم نے (جو ایک زمانہ میں شعبہ سیاسیات گورنمنٹ کالج لاہور سے غالباً بحیثیت صدر شعبہ منسلک رہے تھے) کئی بار حیرت سے ذکر کیا کہ انہوں نے جی سی کے استاد کو سڑک پر ریڑھی سے کھاتے ہوئے دیکھا۔ کسی بک شاپ پر روزانہ نان چھولے تناول فرمانے کا تو ذکر ہی کیا۔ ہم نے کبھی صدور شعبہ ہائے کالج / یونیورسٹی یا سینئر اساتذہ کو کبھی کسی کو ٹیکسی یا بابا یا سکوٹر پر کسی ماتحت یا شاگرد کے پیچھے بیٹھا نہیں دیکھا۔ ان کے مقابلہ میں اپنے سینئرز کے ایسے ہی معمولات کا ذکر کریں تو اپنی کم ظرفی پر رونا آئے گا۔

مصنفہ مندرجہ بالا اقتباس "۔۔۔معیار پر۔۔۔ پورا اترتا ہو" کے تسلسل میں لکھتی ہیں:

"وہ استفسار کرتے ہیں کہ

"کسی کور کسر کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص فیکلٹی سے وابستگی میں کامیاب ہو گیا ہے تو اس کی

ذمہ داری کیا بڑھ نہیں جاتی ؟'' (ص 33)

راقم کو Pedestal سے ان تیز پڑے لوگوں کا انداز تکلم سمجھ نہیں آتا جو ایک عمومی بیک گراؤنڈ سے آ کر پانچ سات برس گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے ہیں اور کسی جج' کرنل' جرنیل' وزیر' صنعت کار' میڈیکل سپیشلسٹ کے بچے کو کلاس میں دیکھ لیتے ہیں تو زمین پر پاؤں نہیں دھرتے اور اپنے ہی رفقا کو جی سی سے وابستگی اور فیکلٹی سے وابستگی کی گردان سناتے نہیں تھکتے۔ رہی بات ذمہ داری کی تو اس کی کوئی ذات' اس کی کوئی Gradation نہیں ہوتی ہے۔ بحیثیت استاد' پرائمری اسکول منڈی بہاؤالدین کے ہیچر' وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج چوکی' لیکچرار انگریزی بھائی پھیرو' لیکچرار اردو گوٹ رادھا کشن' صدر شعبہ اردو اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور' سب کی ذمہ داری برابر ہے' کہیں بڑھتی نہیں اور کہیں Relax یا Condone نہیں ہوتی۔ بہ حیثیت مدرس' ممتحن' انچارج کرکٹ ٹیم' نگران سکول/ کالج میگزین وغیرہ کسی کی بھی ذمہ داری سے ذرہ برابر روگردانی جائز نہیں۔ استاد گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک ذمہ دار استاد کی حیثیت سے آئے گا۔ وہ جائے گا تو کیا چکوال میں ذمہ دار استاد کی حیثیت سے نہیں جائے گا۔

مصنف کے مندرجہ بالا اقتباسات کے سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرما لیں۔ وہ لکھتی ہیں:

''۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ ان ''اصحاب'' کے بارے میں وہ اپنے عزیز رفیق کار اصغر ندیم سید کے اس مشورے پر عمل پیرا ہیں کہ ''نہ انہیں حافظے کا بار بنایا جائے [وہ نہیں جانتیں کہ سید صاحب نے نسخہ کی اصل آئیٹم نہیں بتائی] نہ اُن کی بے سرو پا باتوں اور پھبتیوں پر الجھ الجھ کر یا سوچ سوچ کر اپنے سینے میں کسی ناسور کو پلنے دیا جائے۔'' [کون کس کا رفیق ہوا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے جان لیا ہو گا کہ سید صاحب اب ان کے رفیق کار نہیں رہے' اور ان دنوں کسی اور کے عزیز ہیں۔ ہم بھی ایک زمانہ میں قریبی عزیز تھے۔ صبح' شام کالج' ایک دوسرے کے گھر' ناشران و تاجران کتب کے ہاں وقت گزارنا' ادبی زعما کی پذیرائی میں شریک رہنا' بچوں' ایک دوسرے کے عزیزوں اور دوستوں سے ربط ضبط رکھتے تھے۔ پھر زیادہ کارآمد عزیز درمیان میں آ گئے۔ ہماری رفاقت کار کے آخری ایک آدھ سال ہی باقی تھے کہ موصوف کے رویے سے معلوم ہونے لگا وہ ہمیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ' ریٹائرڈ دیکھنے کے متمنی ہیں] مسلسل اقتباس میں رخنے کے لیے معذرت۔ مصنفہ کہتی ہیں: ''یہ واقعی بڑا معقول مشورہ ہے لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ رویوں کی بدصورتی نے ڈاکٹر صاحب کو کسی قدر ہرٹ ضرور کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو جاننے والے ہر قدر دان کے لیے یہ صورت اذیت دینے والی ہے۔

ڈاکٹر صاحب یہ آپ ہی سے پڑھا اور سیکھا ہے اور آپ ہی سے کہتی ہوں کہ ایسے جُھٹ بھیئے تو صرف ویسے ''حسن سلوک'' کے مستحق ہونے چاہئیں جیسا ہم آپ کا' منہ پر آ جانے والی مکھی کے ساتھ

ہوتا ہے!'' (صفحہ 34)

ہم نے اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے یہ دیکھا اور سیکھا ہے کہ ہم آپ کا کھی کے ساتھ ''حسن سلوک'' یہ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ تو بہت خفا ہو کر اُسے اڑا دیتے ہیں اور دوسری دفعہ ہلاک کر دیتے ہیں۔ ہمیں اس عزیز مصنفہ سے شکوہ ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ''عزیز دوستوں'' کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے رویوں کی خوبصورتی کو محسوس کیوں نہیں کیا؟ آخر ان ''عزیز دوستوں'' کو جاننے والے قدردانوں کے لیے یہ صورت کتنی روح افزا اور مسرت بخش ہوگی۔

محترمہ نائیلہ انجم نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ میرا آئیڈیل'' میں ایک اور بات غلط اور خلاف واقعی لکھی ہے۔ میں نے اس کی تصدیق اُس وقت کے رفقائے کار سے کر لی ہے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کے لیے تھیسس لکھنے کے لیے الاٹ منٹ کا بھی ایک طریق کار موجود تھا۔ پریویس اور فائنل کا امتحان کنٹرولر امتحانات پنجاب یونیورسٹی لیتا تھا۔ شعبہ اردو اورینٹل کالج اور صوبے کے دوسرے ملحق کالجز کے شعبہ ہائے ایم اے اردو کے اکٹھے پریویس کے امتحان کے نتیجہ میں 57% فیصد نمبر حاصل کرنے والے طالب علم تھیسس لکھنے کے اہل قرار پاتے تھے۔ ایم اے اردو گورنمنٹ کالج لاہور 1986ء کے مندرجہ ذیل طلباء و طالبات تھیسس لکھنے کے اہل قرار پائے۔ 1۔ نائیلہ انجم' 2۔ بدر منیر الدین' 3۔ خورشید احمد خواجہ' 4۔ نزہت زہرا گردیزی' 5۔ ارم سلیم (دختر ڈاکٹر سلیم اختر)۔ ہر کالج کے شعبہ کا صدر اپنے طور پر یا اپنے اساتذہ یا ایک آدھ صورت میں کسی طالب علم کے مشورہ سے تھیسز کے موضوعات مختلف مستحق طلباء و طالبات کے نام اور نگران کار کی فہرست تیار کر کے کنوینر بورڈ آف سٹڈیز (صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی) کو بھجوا دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بورڈ آف سٹڈیز کی میٹنگ میں یہ فہرست زیر بحث آتی ہے خصوصاً دو کالجوں سے ایک ہی موضوع کے امیدواروں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ' امیدوار یا کسی عنوان میں جزوی تبدیلی کے مشورہ کے بعد متفقہ طور پر تیار ہونے والی فہرست کنوینر صاحب منظور کر لیتے ہیں جو بعد ازاں سرکلر کی صورت میں کنٹرولر اور متعلقہ ملحق کالجوں کو ارسال کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد مقررہ مدت کے اندر تھیسس لکھنے والا ہر امیدوار کام مکمل کر کے کنٹرولر کے دفتر میں جمع کروا دیتا ہے۔ کنوینر بورڈ آف سٹڈیز کی میٹنگ میں ہر تھیسس کے ممتحن کے نام کی منظوری لے کر کنٹرولر کو بھجوا دیتا ہے۔ وہاں سے ہر صدر شعبہ اور ممتحن کو ''مراسلہ تقرر'' مع اطلاع برائے تاریخ اور وقت Viva ارسال کر دی جاتی ہے۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر یہ Viva ہوتا ہے۔ کنوینر Viva کی کارروائی Conduct کرتا ہے۔ اس انٹرویو میں کنوینر کے علاوہ نگران استاد (Guide)' امیدوار اور ممتحن شریک ہوتے ہیں۔ ممتحن امیدوار کے کام کو زبانی سوال و جواب کی روشنی میں Evaluate کرتا ہے۔ تینوں ممبران Viva کمیٹی یعنی کنوینز' ممتحن اور گائیڈ آراء کے

تبادلے کے بعد متفقہ طور پر نمبر تجویز کرتے ہیں۔ اس کے بعد گائیڈ اور کنویز بھی اس سلپ پر دستخط کر دیتے ہیں۔۔۔ کنوینر یہ رزلٹ کنٹرولر کو بھجوا دیتا ہے۔

1987ء میں برسوں کے معمول کے خلاف متعلقہ ملحق کالج کے شعبہ کے صدر/انچارج بھی VIVAS میں شریک ہوئے۔ اس کی اجازت یونیورسٹی کی مجاز اتھارٹی سے کتنا عرصہ پہلے اور کس ضرورت کے تحت لی گئی' اس کا ریکارڈ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ قیاس کے مطابق بورڈ آف اسٹڈیز کی کسی قریبی میٹنگ میں ڈاکٹر معین الرحمن کی تحریک پر تجویز منظور ہوئی ہوگی۔ کیا یہ منظوری اس کی قانونی ضمانت تھی۔ بہر حال بعد کے سال ملحقہ کالج کے صدر/انچارج شعبہ کی Viva میں شمولیت معزول ہوگئی۔

ڈاکٹر معین الرحمن بہ حیثیت صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لائل پور اور لاہور میں تھیسس کے معاملات و مسائل میں کسی استاد کو شریک نہیں کرتے تھے۔ وہ خود ہی موضوعات تجویز کرتے اور طالب علموں کے نام الاٹ کر کے فہرست بھجوا دیتے تھے۔ بورڈ آف اسٹڈیز کی منظوری کے بعد اور کبھی پہلے بھی اپنی Sweet Will پر موضوع اور متعلقہ امیدوار کا نام ظاہر کر دیتے۔ موضوع تجویز کرنے کا انہوں نے ایک فارمولا وضع کر رکھا ہے۔ وہ غالب یا غالب سے کسی کا نام نتھی کر دیتے۔ زندہ لوگوں اور ان کے لواحقین کی خوشنودی کے لیے وہ تھیسس کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی بطور غالب شناس' آل احمد سرور بطور غالب شناس' حمید احمد خاں بطور غالب شناس وغیرہ جیسے موضوع/عنوان قائم کیا کرتے۔ ان کی دوسری ترجیح غالب کے حوالے سے اشاریہ سازی رہی ہے۔ ان کی نگرانی میں یا تجویز پر لکھے جانے والے تھیسس کی بنیاد کسی سے شخصی تعارف کا آغاز اور رابطے کا استحکام ہوتا ہے۔ مثلاً کالی داس گپتا رضا' جن پر انہوں نے تین مقالے لکھوائے اور ''تحقیق نامہ'' کا ایک گوشہ بھی وقف کیا۔ وہ غالب پر تھیسس کے کام کے اجارہ دار بن گئے تھے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد اور لاہور میں شاید ہی معین صاحب کے علاوہ کسی کو غالب کے حوالے سے کام کروانے کے لیے کہا گیا ہو۔ وہ تین تین چار چار تھیسس اپنے پاس رکھنے کے بعد ایک دو سینئر رفقاء کا نام بطور نگران تجویز کیا کرتے تھے۔

اس سال (1986ء) کے تھیسس لکھنے کا استحقاق پانے والے متذکرہ طالب علموں کو بالترتیب درج ذیل موضوعات الاٹ کیے گئے۔

1۔ رسالہ ''نقوش'' میں ذخیرۂ غالبیات
2۔ توضیحی اشاریہ رسالہ ''راوی'' (قیام پاکستان تک)
3۔ رسالہ ''راوی'' کا اشاریہ (قیام پاکستان تا 1986)
4۔ محمد طفیل بطور خاکہ نگار
5۔ اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت

ان کے نگران بالترتیب یہ لوگ تھے

1 تا 3۔ڈاکٹر معین الرحمٰن 4۔پروفیسر صابر لودھی 5۔ڈاکٹر ملک حسن اختر

گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے اردو کا یہ پہلا سیشن تھا۔رسالہ ''نقوش'' میں ذخیرۂ غالبیات اور محمد طفیل بطور خاکہ نگار،مدیر و مالک ''نقوش'' کو ممنون کرنے کے لیے اور ''راوی'' کے دو اشاریے کالج انتظامیہ پر کالج کے فروغ کے لیے اپنی کارکردگی ثابت کرنے کے لیے تھے۔یادش بخیر! پانچواں مقالہ' اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت'' جب ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر ملک حسن اختر مرحوم ارم سلیم کے لیے موضوع تلاش کر رہے تھے تو ڈاکٹر حسن اختر کو سوجھا تھا۔

دو برس کے دوران طالب علموں کی دلچسپیاں' سرگرمیاں اور ترجیحات واضح ہوگئی تھیں۔شعبہ کا ہر شخص اس امر سے باخبر تھا کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن عزیزہ نائیلہ انجم کے Favourite استاد ہیں اور وہ ان کی Favourite شاگردہ۔کتاب ''ڈاکٹر معین الرحمٰن۔شخص اور عکس۔'' سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ویسے بھی کوئی استاد نگرانی کے لیے خود تیار نہیں ہو سکتا تھا جب تک اسے مجاز اتھارٹی (صدر شعبہ) Assignement تفویض نہ کرتی۔اس پس منظر میں ''بہت سے اساتذہ'' کا نائیلہ انجم کے مقالہ کی نگرانی کے لیے تیار ہونا' کہہ کر اپنی اہمیت جتلانے کی کوشش ہے۔اس دعویٰ کا حامل مکمل اقتباس دیکھیے جو سراسر غلط بیانی پر مشتمل ہے۔مصنفہ نے لکھا ہے:

''پریولیس کے رزلٹ کے بعد تھیسس کا مرحلہ طے کرنا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے کچھ موضوعات منظور کروائے۔میں نے غالب میں دلچسپی ظاہر کی۔بہت سے اساتذہ رہنمائی کے لیے تیار تھے۔کالج میں ٹاپ کرنے کا زعم تھا کہ اپنے اساتذہ کے ساتھ گستاخی کر بیٹھی اور کہہ دیا کہ نہیں کرنا مجھے کسی کی رہنمائی میں تھیسس کا کام۔ایک دو پروفیسرز نے ڈانٹ پلائی لیکن میں بضد تھی کہ تھیسس ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی ہی میں کرنا ہے۔شاید میں سمجھتی تھی کہ سب سے زیادہ نمبر لینے کے بعد یہ میرا حق ہے جو میں نے خود حاصل کیا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا کہ ضد نہیں کرتے۔میں نے بھی تھیسس نہ کرنے کی دھمکی دے دی جو کارگر ہوئی۔سب ہار گئے اور میں جیت گئی۔چند دوسرے طالب علموں نے بھی میرا راستہ اختیار کیا لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔۔۔'' (صفحہ 22)

اوپر بیان کیا گیا ہار جیت کا تماشا کب ہوا؟ ہم بھی وہاں موجود تھے' ہم نے تو نہیں دیکھا یہ تماشا! کارگر دھمکی دینے کی بھی ایک ہی رہی۔ایم اے کے امتحان کے لیے تھیسس لکھنا نہ لازمی ہے اور نہ جبری' اگر کوئی نہیں لکھنا چاہتا تو نہ لکھے۔ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کا کیا Stake پر تھا جو وہ سمجھانے پر لگ گئے۔البتہ وہ طالب علم جو پریولیس میں مطلوبہ نمبر حاصل نہیں کر پاتے مجبور ضرور ہوتے ہیں کہ انتہائی خواہش کے باوجود تھیسس لکھنے کے اہل نہیں قرار پاتے۔(یہ پابندی کس حد تک جائز یا ناجائز ہے؟ یہ بحث سے ایک

اصولی شرط ہونے کی بنا پر بالا ہے) اسی طرح یہ ارشاد کہ "دوسرے طالب علموں نے بھی میرا راستہ اختیار کیا" درست نہیں ہے۔ ان میں بدر منیر الدین اپنی طبیعت کے مطابق Most Obedient آدمی ہیں۔ خورشید احمد خواجہ بہت نفیس' مؤدب اور مہذب انسان ہیں۔ محترمہ نزہت گردیزی سعادت مند ہونے کے علاوہ موضوع کا اپنا کوئی Choice نہیں رکھتی تھیں۔ وہ افسانہ نگار خاتون ہیں۔ ان کے لیے جو موضوع تجویز ہوا تھا' وہ ان کے مزاج سے مناسبت رکھتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ پروفیسر صابر لودھی ان کے نگران کار۔ ایک بہت سینئر استاذ' خوشگوار مزاج کے مالک' ہر وقت ہنستے کھیلتے دائیں بائیں فقرے چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ مقالہ نگاری کا استحقاق رکھنے والی آخری طالبہ ارم سلیم' نہایت شائستہ' اخلاق و آداب کی پروردہ' گھر کے علمی و ادبی ماحول میں پرورش پائے ہوئے' کم گو' ریز روڈ' اپنے کام سے کام' سارے کالج کے استاد ان کے انکل' سراپا احترام وہ دھمکی کس کو دیتیں اور کیوں دیتیں؟

ہم نے زیر تبصرہ پیراگراف کا مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے جائزہ لیا۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس پیراگراف میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا کون سا آئیڈیل رخ سامنے آیا ہے؟ ان سطور کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے ذریعہ کون سا Message دیا گیا ہے؟ اپنی آئیڈیل شخصیت پر اس مضمون کے تصور کے خالق ڈاکٹر معین الرحمٰن' وہی اس کے مرتب' مہتمم اشاعت' نظر ثانی ان کی' پروف ریڈنگ ان کی۔ انہوں نے اس پیراگراف پر خط تنسیخ کیوں نہیں کھینچا؟ بات چلی تھی فیکلٹی سے وابستگی کے بعد ذمہ داری کی۔ کیا جی سی سے وابستگی ریٹائرمنٹ کے بعد ختم ہو جاتی ہے؟ (ڈاکٹر صاحب رسالہ اخبار اردو وغیرہ میں اپنے نام کے ساتھ سابق صدر شعبہ وغیرہ لکھ رہے ہیں) یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وابستگی تو ختم ہو سکتی ہے مگر جی سی کے نام کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے مطابق جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے' وہ ختم نہیں ہوتی۔ واعظ کی طرح ذمہ داری کا وعظ اور بات ہے۔ ذمہ داری کو قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ ہمارے پیر و مرشد تو فرماتے ہیں کہ پاپی سن برسوں میں بھی نمازی نہیں بنتا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی سب تصانیف و تالیفات و مرتبات کے مصدقہ اور غیر مصدقہ مندرجات سے صرف نظر بھی کر لیا جائے اور صرف ان کی مرتبہ CV کا تجزیاتی مطالعہ کر لیا جائے تو وہ ساری اختلافی باتیں جو گزشتہ صفحات میں مختلف حوالوں اور مثالوں سے بیان ہوئی ہیں' کرسٹل کلیر (شفاف آئینہ بن کر) ہو کر سامنے آ جائیں گی۔

تقریباً پندرہ سولہ برس قبل ایک دن راقم اور ڈاکٹر معین الرحمٰن اردو کتب و رسائل کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے ایسے مصنفوں اور ادیبوں کے بارے میں بیزاری کا اظہار کیا جو اپنی کتابوں پر تبصرہ لکھوانے اور چھپوانے میں ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کا جواب سن کر میں انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ فرمایا:

"صدیق جاوید صاحب! یہ سیلز مین شپ کا زمانہ ہے۔ اگر آپ اپنے پروڈکٹ کو پروموٹ نہیں کریں گے تو کوئی نہیں پوچھے گا۔"

دنیا اس سیلز مین شپ اور پروموشن ڈرائیو کے نتیجے میں کتنا کچھ کھرا سمجھ کر کھوٹا خرید رہی ہے' بتانے کی ضرورت نہیں۔ کبھی سوچیں کتنے سیلز مین کتنی آنکھوں کو اندھا کر چکے ہیں۔ اس سیلز مین شپ کے نتیجہ میں کتنے جگر خراب ہو چکے ہیں۔ کتنے پھیپھڑے چھلنی ہو چکے ہیں۔ نہ تو کسی لیبل کی ضمانت ہے اور نہ کسی مہر میں صداقت ہے۔

میں جب بھی اردو کتاب پر کوئی تبصرہ' تعارف' پیش لفظ' فلیپ' کسی کتاب کی تقریب رونمائی کی روداد پڑھتا ہوں تو مجھے اکثر ان میں استعمال ہونے والی Phraseology اور Terminology سمجھ میں نہیں آتی۔ ان تحریروں کی زبان و بیان میں ابہام اور ژولیدگی ہوتی ہے۔ اب صاف پتہ چلنے لگا ہے کہ تبصرہ نگار یا تعارف کنندہ مناسب کتاب خوانی کے بغیر متعلقہ کتاب کی تعریف و توصیف میں محض الفاظ جوڑ رہا ہے۔ جو کچھ کہا جا رہا ہے' وہ سوچی سمجھی رائے نہیں ہے۔ نہر یا دریا کے پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے گھاس پھونس کے تنکوں کو شہتیر اور درخت بتایا جا رہا ہے۔ ہم جن ناموں کے حوالے سے لفظ ثقاہت کے معنی سمجھتے تھے' وہ بزرگ اپنی ان عاجلانہ اور غیر منطقیانہ تحریروں سے بے اعتبار ہو گئے ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے جب ادبی تاج اچھالے جائیں گے' جب تنقیدی اور تحقیقی تخت گرائے جائیں گے۔ ادبی واعظوں اور تنقیدی و تحقیقی شخصیتوں کی ملی بھگت' ان کی عبائیں اور قبائیں پھاڑ کر ادبی مخلوق کو دکھا دینی چاہیے۔

ڈاکٹر معین الرحمن کے نظر انداز کیے جانے والے کاموں کے بارے میں رسمی آرا اور کچھ سرسری تعریفوں کے کمزور پل باندھے گئے ہیں جو غیر جانبدارانہ تنقید کا ایک تھپیڑا برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی حقیقت بھی آپ کے سامنے آ جائے گی۔ سر دست ان کے CV اور سوانحی خاکہ کی تفصیلات دیکھیے گا تو اندازہ ہو جائے گا کہ موصوف نے اپنی کیسی ہوا باندھی ہے۔

مغرب میں مدت مدید سے کتاب کی اشاعت کے موقع پر یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ مصنف خود' اس کا کوئی رفیق کار یا کتاب کے متعلقہ مضمون کا کوئی معروف اسکالر مختصر یا مناسب طوالت کا تعارف لکھتے ہوئے زیر نظر تصنیف کا نمایاں پہلو یا مصنف کے نقطہ نظر یا زاویہ نظر کی تازگی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ پبلشر جلد کے اندر پہلے صفحہ پر یا جلد کی پشت پر چند فقروں میں متعلقہ مصنف کے بارے میں بائیوگرافیکل انفارمیشن درج کر دیتا ہے اور انہی فقروں میں اس مصنف کی دوسری قابل ذکر ایک دو کتابوں کا نام بھی بتا دیتا ہے یا جلد کے اندرونی ٹائٹل سے پہلے صفحہ پر By the same author کے تحت تین چار یا پانچ کتابوں کے نام درج کر دیے جاتے ہیں۔ بعض کتابوں کے اندرونی ٹائٹل پر مصنف کے نام کے نیچے اس کے نئے پرانے منصب اور کتابوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اردو میں بھی غالباً انگریزی کتابوں پر متذکرہ بالا اندراجات کی تقلید میں

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے اس قسم کا التزام کیا جانے لگا مگر تعارفی مندرجات'' دیباچہ/تعارف یا مصنف کی دوسری کتابیں'' تک محدود ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی ابتدائی مرتبہ تحریروں اور کتابوں پر مروج اور متداول انداز چھوڑ کر ایک خیرہ کن انداز میں ''تصنیفات و تالیفات'' کے زیر عنوان اپنی مرتبہ کتابوں کی فہرست چھاپنی شروع کی جن میں سے ایک بھی ان کی تصنیف نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ''اشاریۂ غالب 1969ء'' کا جو نسخہ ہے اُس کے کوائف مرتب اور انتساب پر مبنی دو صفحوں کو سریش یا گوند سے جوڑ دیا گیا ہے جو کھولنے سے پھٹ رہے ہیں۔ اس وقت ان کی تالیف ''مطالعہ یلدرم'' طبع اول مارچ 1971ء کو پہلی مطبوعہ کتاب فرض کر لیا گیا ہے۔ اس کے اندرونی ٹائٹل کے صفحہ پر نام کتاب اور نام وایڈریس پبلشر کے درمیان مصنف کا نام یوں درج ہے:

سید معین الرحمٰن
لیکچرار شعبہ اردو
ایف سی کالج لاہور

اگلے صفحہ پر سید معین الرحمٰن کی سرخی (سیاہی بھی سرخ ہے) کے نیچے عنوان مشاغل کے تحت حسب ذیل اندراجات ہیں۔

ریسرچ اسکالر ترقی اردو بورڈ کراچی 64-1963ء

استاد شعبہ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج' بہاول نگر 65-1964ء

استاد شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور 66-1965ء

استاد شعبہ اردو برائے غیر ملکی طلبا، پنجاب یونیورسٹی 1966ء

[استفسار: ریسرچ اسکالر اور کارڈ نویس میں غالباً کافی فرق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود کئی جگہ پہلی ملازمت کو کارڈ نویس کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

بہاول نگر میں بھی بطور عارضی لیکچرر صرف چھ ماہ کے لیے تقرر تھا۔

پنجاب یونیورسٹی میں بھی متذکرہ کیفیت ہی تھی۔

آخری ملازمت کا ڈاکٹر صاحب نے بعد ازاں خود بھی ذکر نہیں کیا۔ کیا Facts کے بیان میں Exactness ضروری نہیں؟]

موجودہ مصروفیت: استاد شعبہ اردو' ایف سی کالج لاہور

تصنیفات و تالیفات:

1۔ بابائے اردو۔ احوال و افکار 1964ء

2۔ افسانوی ادب کے اہم نقاد 1967ء

3۔ نقدِ عبدالحق	1968ء
4۔ خیالستان (ترتیب و مقدمہ)	1968ء
5۔ اشاریۂ غالب	1969ء
6۔ آپ بیتی: رشید احمد صدیقی	زیرِ طبع
7۔ مطالعۂ یلدرم	1971ء

پتہ: 23 الیف سی کالج کیمپس، لاہور (16)

ان کتابوں میں سے ہمیں صرف ''افسانوی ادب کے اہم نقاد'' دیکھنے یا سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ شاید نذر رسنز کے لیے گائیڈ ٹائپ کتاب ہو۔ ادبی کتابوں کے کسی شوروم میں کبھی یہ کتاب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ان سے منسوب مختلف کتابوں میں چھپنے والے ان کے ''سوانحی خاکہ'' میں ان کی تصنیفات و تالیفات کے ذیل میں یہ کتاب درج نہیں کی جاتی۔ دوسری کتابوں کے سلسلے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ مصنف / مرتب یا ناشر پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ واضح الفاظ میں اس بات کی صراحت کرے کہ فہرست میں شامل کتاب / کتابیں مرتبہ ہیں یا مصنفہ، کیونکہ طبع زاد تصنیف یا تنقید و تحقیق کی کتاب اور مرتبہ کتاب کی نوعیت، حیثیت اور اہمیت میں بھی بہت فرق ہے۔ آپ نوٹ کریں کہ ڈاکٹر معین الرحمن ابہام یا ناکافی بیان Understatement سے بہت فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمن پروپیگنڈہ کی طاقت اور ایڈورٹائزمنٹ کے اثر اور اس کی Penetrative اہمیت سے بہت پہلے سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں متذکرہ قسم کی تفصیلات سے یقیناً فائدے حاصل ہوئے ہوں گے۔ بالفاظ دیگر انہوں نے اس 'انداز تعارف' کو کافی مؤثر پایا ہوگا۔ یہ بڑا دلچسپ معائنہ ہے کہ یہ ''انداز تعارف'' کس طرح مختلف مدارج سے گزر کر اپنی ارتقائی شکل اختیار کر پایا اور اب نو دس برس سے ان کی ہمشیرہ محترمہ پروفیسر انبساط امین عباسی کے نام سے 'بعنوان ڈاکٹر معین الرحمن۔ سوانحی خاکہ' ڈاکٹر معین الرحمن کی مختلف مرتبہ کتابوں کے شروع یا آخر میں چھپ رہا ہے۔ تمام آثار اور قرائن کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سوانحی خاکہ ڈاکٹر معین الرحمن کا اپنا ڈیزائن کیا ہوا ہے اور انہی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے جو وہ بیسیوں بار اپنا سوانحی اور تصنیفی خاکہ نسبتاً اختصار کے ساتھ چھاپتے رہے اس پر اگر کوئی نام نہیں تھا تو Understood بات تھی کہ مصنف کا اپنا ترتیب دیا ہوا خاکہ ہے لیکن اب یہ ترقی یافتہ سوانحی خاکہ اپنے نام کی بجائے ہمشیرہ محترمہ کے نام سے چھپوا رہے ہیں تو کیوں؟

ہمیں تو یہ سمجھ آتا ہے کہ یہ بھی ان کی خودنمائی اور خانہ ساز عظمت کا ایک انداز ہے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت گریڈ کے حساب سے کتب و رسائل میں بہر نوع نام چھپوانے سے اور دوسری اشاعتی سرگرمیوں اور میڈیا کی وجہ سے جتنے بڑے آدمی بن گئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ بڑا وہ اپنے آپ کو تصور کرتے ہیں اور

جس طرح بار بار لکھتے لکھاتے ہیں کہ ان سے پہلے محکمہ تعلیم میں کوئی 21 واں گریڈ لینے والا پیدا نہیں ہوا۔ خواجہ محمد سعید کس شمار قطار میں ہیں۔ پطرس بخاری' ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر' صوفی تبسم' ڈاکٹر نذیر احمد' پروفیسر اشفاق علی خاں' ڈاکٹر محمد صادق' ڈاکٹر امداد حسین' پروفیسر سراج' خواجہ منظور حسین' میاں نامدار خاں' ڈاکٹر عبدالمجید اعوان' ڈاکٹر رضی واسطی' پروفیسر کرامت حسین جعفری' ڈاکٹر محمد اجمل' انیس انیس بیس بیس گریڈ میں چلتے بنے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن اپنا جیسا Stature لوگوں کے دل و دماغ میں نقش کرنا چاہتے ہیں۔ اتنے بڑے لوگوں کے کوائف تو ایجنسیاں ریلیز کیا کرتی ہیں' چھوٹی بہنیں نہیں' شاید چھوٹی بہن کو پروموٹ کرنا بھی ان کے پیش نظر ہے۔ اگر یہ سوانحی خاکہ ان کے CV میں ریسرچ ورک کے ثبوت میں شامل کرنا ہے تو سو بسم اللہ' ہم ان کے لیے بھی اکیسویں گریڈ کی دعا کرتے ہیں۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ زیر بحث' سوانحی خاکہ' اس عزیزہ کا مرتب کیا ہوا نہیں ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو اس خاکہ کے ابتدائی نقوش اور بنیادی خطوط Outer Lines] کہہ لیں ''مطالعہ یلدرم'' کے مندرجہ بالا سوانحی اور تصنیفی اشارت تھے] جو آئندہ برسوں میں معین صاحب کے مختلف مرتبات میں ابھرتے' نمایاں اور واضح ہوتے رہے۔ [1989ء میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے یون کے قریب یہ خاکہ تیار کرلیا۔ دیکھیے'' غالب اور انقلاب ستاون'' الفیصل لاہور صفحہ 9 تا 11 ''اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں'' یونیورسل بکس لاہور 1989ء صفحہ 9 تا 11۔ 1994ء تک اس خاکہ میں اضافہ نہ ہوا دیکھیے'' جاگیر غالب'' مکتبہ کارواں لاہور' صفحہ 11 تا 13] تا آنکہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے اکیسویں گریڈ کے لیے کیس بھجواتے ہوئے اپنے اس خاکہ کو ہر لحاظ سے Finishing Touch دیا۔ انہوں نے یہ خاکہ/ نقشہ اندارج کر کے ایک بڑے چارٹ پر منتقل کیا۔ یہ چارٹ میں نے ان کے دفتر کی میز پر پھیلا ہوا دیکھا ہے۔ یہ چارٹ ان کے کیس کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ کو چارٹ سائز میں گیا یا اس کو بڑی فوٹو سٹیٹ مشین پر کسی خاص سائز میں Minimise کروایا گیا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ بہرحال ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اس مرتبہ چارٹ کے مندرجات 2000ء میں'' سوانحی خاکہ۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن'' مرتبہ انبساط امین عباسی غالباً پہلی بار کتاب'' دیوان غالب (نسخہ خواجہ)۔ تجزیہ و تحسین۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معراج نیر' اصغر ندیم سید' الوقار لاہور' صفحہ 11 تا 14 پر شائع ہوا۔ (مبینہ طور پر یہ کتاب بھی درحقیقت ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مرتبہ ہے۔ مرتبین کے اعتراف کے علاوہ اس سلسلے میں بعض داخلی شواہد بھی موجود ہیں)

محترمہ انبساط امین عباسی کی یہی تحریر اضافوں کے ساتھ'' سوانحی خاکہ۔۔۔'' ایک کتاب موسوم بہ'' دل کی کتاب'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' مرتبہ انبساط امین عباسی' الوقار لاہور 2000ء صفحات 391 تا 400 پر مصروفیات' اعلیٰ مدارج میں تحقیقی اور امتحانی کام سے وابستگی' اعلیٰ ملازمتوں کے لیے ایڈوائزر' کچھ اہم حالیہ اور سابقہ علمی و تہذیبی ذمہ داریاں' کے عنوانات کے تحت اضافہ شدہ سیکشن ہیں۔ محترمہ عباسی صاحبہ کا متذکرہ بالا خاکہ بعض سیکشن خارج کرتے ہوئے'' نذر معین'' مرتبہ محمد سعید' 2003ء کے صفحات 533 تا

539 پر محیط ہے۔

متذکرہ پہلی کتاب (صفحہ 11) میں شامل سوانحی خاکہ کے ایک سیکشن بعنوان ''اعزاز'' اور دوسری کتاب (صفحہ 391) کے سیکشن بعنوان ''دیگر اعزازات'' کے تحت درج ذیل سطور پر مبنی پیرا دو تین زاویوں سے دلچسپی کا پہلو رکھتا ہے: دیکھیے:

''محکمہ تعلیم حکومت پنجاب لاہور' کالج کیڈر (مردانہ) میں بی ایس 21۔ پانے کی انفرادیت اور اولیت۔ اردو اور آرٹس فیکلٹی میں قیام پاکستان کے بعد سے یہ پہلا اور اب تک واحد امتیاز ہے جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں''

معین صاحب کا یہ اعزاز یقیناً ایسا ہے کہ اسے حاصل کرنے پر وہ جتنی بھی خوشی کا اظہار کرتے کم ہوتا۔ ان کے اہل خانہ' عزیزوں اور دوستوں کو بھی بہت خوشی ہوئی ہوگی۔ ہمیں یقین ہے معین صاحب نے ان سب کو پیٹ بھر کر مٹھائی کھلائی ہوگی۔ ہمیں بہ سبب مکانی فاصلہ اور عدم تقرب ذرا دیر سے خبر ہوئی۔ معین صاحب اور ہمارے دیرینہ عزیز رفیق کار اصغر ندیم سید جو ہمارے پڑوس میں ہی رہتے ہیں' فیصلہ نہ کر پائے کہ اگر انہوں نے ہمیں مطلع کر دیا تو خدا جانے معین صاحب خوش ہوں گے یا خفا ہو جائیں گے۔ بہر حال ہمیں تاخیر سے اطلاع ہوئی۔ ٹیلیگرام کے لیے مناسب وقت نہ مل رہا تھا لہٰذا ہم تحفہ خرید کر اس سلسلے کے ڈنر کی دعوت کا انتظار کرتے رہے' کرتے رہے کیوں کہ معین صاحب اور ہم وضعدار آدمی ٹھہرے۔ ہماری روایت میں ناراضی کے باوجود زندگی کے دو تین ایسے مواقع ہیں کہ اُن پر بلائے یا بن بلائے پہنچنا ہی پڑتا ہے۔ معین الرحمٰن صاحب ہماری باسی مبارکباد قبول فرمائیں۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ریفریجریٹر میں لگی ہے' ہرگز خراب نہیں' بالکل محفوظ رہی ہے۔

غالب نے حریفانہ دامن کھینچ لیا تھا۔ ہمارے اندر چونکہ یہ جرأت رندانہ موجود نہ تھی لہٰذا ہم سردار جی کی طرح اجازت لینے کے چکر میں نہیں پڑے ورنہ انکار ہو جاتا۔ ہم بھی مندرجہ بالا پیراگراف کے بارے میں چند ''حاسدانہ باتیں'' اجازت طلب کیے بغیر عرض کرنا چاہتے ہیں۔

1۔ سوانحی خاکہ کے مندرجہ بالا پیراگراف سے ہمارا یہ استخراج غلط نہیں کہ اکیسویں گریڈ کے اس واحد امتیاز کا تحقیق غالب سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ کسی محکمانہ کاروائی کا نتیجہ ہے۔

2۔ اپنی عزیز طالبات کے ساتھ معین صاحب کے سارے ہی لبرل رویے اور سلوک ایک طرف دھرے رہ گئے۔ آخر انہوں نے مردانہ شاونزم کا مظاہرہ کر ہی دیا۔ اکیسویں گریڈ کے امتیاز کو مردانہ اور زنانہ کمپارٹمنٹ میں تقسیم کر دیا۔ اگر یہ لکھ دیا جاتا کہ محکمہ تعلیم میں اس سال پہلی بار دو لوگوں کو اکیسویں گریڈ' امتیاز حاصل ہوا ہے۔ دوسری خوش قسمت ڈاکٹر بشریٰ متین ہیں تو اس پر موصوفہ کو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی صدق گوئی کا عملی ثبوت مل جاتا۔ وہ ان کی وسعت قلبی کی قائل ہو جاتیں۔ باقی دنیا بھی انہیں ایک

ظرف شخص کی حیثیت سے جان لیتی۔

3۔ ''اردو اور آرٹس فیکلٹی'' کی تخصیص سمجھ میں نہیں آرہی۔ کیا فزکس' کیمسٹری' باٹنی یا زوالوجی اور سائنس فیکلٹی میں قیام پاکستان کے بعد سے اب تک متعدد پروفیسر اکیس گریڈ میں ترقی پا چکے ہیں؟ یا نہیں؟

4۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کو اس پس منظر کا علم ہونا چاہیے کہ انہیں 21واں گریڈ پلیٹ میں رکھ کر کیوں پیش کیا گیا۔ وہ نہیں جانتے کہ اس پس منظر میں اساتذہ کی ٹریڈ یونین کی ایک طویل جدوجہد کارفرما ہے۔

5۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر معین الرحمٰن کو غلط طور پر یہ یقین ہے کہ انہیں' محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کے کالج کیڈر (مردانہ) میں بی ایس 21 گریڈ پانے کی انفرادیت اور اولیت' ان کی کسی بہت ہی ذاتی اہلیت' لیاقت اور خصوصیت کی بنا پر حاصل ہوئی ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر معین الرحمٰن سروس رولز سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ محکمہ تعلیم پنجاب کے کالج کیڈر میں پروفیسروں کی ایک خاص مدت ملازمت کے بعد محکمانہ ترقی کے معمول اور نظام سے بھی واقف ہوں گے۔ ان کی یہ ترقی بھی ایک محکمانہ معمول کا نتیجہ ہے جو خوشی اور مبارکباد کا مقام تھی مگر اس کو دنیا کے ساتویں عجوبہ سے زیادہ اہم اور قابل ذکر بنا دینا ڈاکٹر معین الرحمٰن کے تخیل اور تصور کا کرشمہ ہے۔

وہ 30 نومبر 1998ء کو عزیزہ صباح داؤدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

(i) ''محکمہ تعلیم حکومت پنجاب میں پہلی بار گریڈ 21 کی ایک جگہ پیدا ہوئی ہے جس پر اس خاکسار کو ترقی ملی ہے۔ صرف سمجھانے کے لیے لکھتا ہوں کہ سیکرٹری ایجوکیشن حکومت پنجاب گریڈ 20 (BS-20) میں ہیں۔ میں نے کالج میں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور صدر شعبہ اردو کے طور پر رہنے کو ترجیح دی ہے۔

(ii) صدر مملکت نے سال 1998ء کے لیے 'اعزاز فضیلت'' سے نوازا ہے'' نوازنے والی ذات تو ایک ہی ہے نام اور بہانے بہت'' (نذر معین: مرتب محمد سعید' الوقار' لاہور: 2003ء' ص 409)

2۔ جب ڈاکٹر معین الرحمٰن 1967ء میں پروفیسر حمید احمد خاں کی سفارش سے ایف سی کالج میں بطور لیکچرار داخل ہو رہے تھے تو گورنمنٹ کالجز اور غیر سرکاری کالجز کے اساتذہ میں Service terms and conditions کے حوالے سے بے چینی اور اضطراب پایا جاتا تھا۔ اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کا احساس کرتے ہوئے پروفیسر حبیب اللہ بھٹی کی تجویز اور تحریک پر گورنمنٹ کالج لائل پور میں West Pakistan Lecturers Association کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ پروفیسر حبیب اللہ بھٹی (صدر) ڈاکٹر غلام سرور خاں نیازی (جنرل سیکرٹری) پروفیسر منیر احمد چوہدری (فنانس سیکرٹری) راقم (پریس سیکرٹری) منتخب ہوئے۔

سینئر پروفیسروں میں پروفیسر رفیق محمود' پروفیسر ظفر اقبال احمد (مرحوم) پروفیسر خواجہ کرامت حسین (مرحوم) پروفیسر ایم آر آصف (مرحوم) نے اپنے مناصب کی پروا کیے بغیر سرگرم معاونت ومشاورت

کا حق ادا کیا اور بلا استثنا ہر پروفیسر مع پرنسپل نے اس جدوجہد کی سرپرستی کی۔ جب بھی ضرورت پڑی' پورے اسٹاف نے دل کھول کر Contribution میں حصہ ادا کیا۔ راقم کو لائل پور اور لاہور میں اپنے جرنلسٹ دوستوں کے ہمدردانہ رویے اور ترجیحی سلوک کا آج تک اعتراف ہے۔ پروفیسر رفیق محمود اور پروفیسر حبیب اللہ بھٹی کے اسلام آباد اور راولپنڈی میں رابطوں نے ان سرگرمیوں کو وسعت دی۔ کراچی میں ڈاکٹر انیتا غلام علی نے اس جدوجہد میں حصہ لیا اور ان کی قیادت میں وہاں بھی سرگرمیاں تیز ہوئیں۔

پروفیسر رفیق محمود اور جناب حبیب اللہ بھٹی کے غیر سرکاری کالجوں کے اہم افراد سے روابط تھے۔ لہٰذا پروفیسر فیضی (ایف سی کالج) خواجہ مسعود (گارڈن کالج) اور پروفیسر ایرک سپرین (اسلامیہ کالج سول لائنز سے یونیورسٹی آ چکے تھے) کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کے دوسرے سرگرم اصحاب میں مقصود الحسن' عبدالحئی' پروفیسر منظور' شیخ ظہور' عزیز الدین احمد اور پروفیسر امین مغل وغیرہ کی مساعی سے غیر سرکاری کالجوں کے اساتذہ کی ایک متوازی تنظیم کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن وجود میں آئی۔ اس کی ہر صوبے اور ہر شہر میں شاخیں کام کرنے لگیں۔ اساتذہ کی ان دونوں تنظیموں کی لیڈر شپ میں نمایاں افراد کی بائیں بازو سے ہمدردیوں کو دیکھتے ہوئے جماعت اسلامی نے طلبا کی ذیلی تنظیم کی طرح پروفیسر عثمان غنی کی قیادت میں تنظیم اساتذہ قائم کی۔

1968ء میں ویسٹ پاکستان لیکچرارز ایسوسی ایشن کا راولپنڈی میں کنونشن منعقد ہوا۔ پنجاب کے تقریباً ہر شہر اور مغربی پاکستان کے صوبائی صدر مقامات سے ڈیلی گیٹس نے بھرپور حصہ لیا۔ پروفیسر اشفاق علی خان (پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور) کی نگرانی میں انتخاب ہوا۔ مرکزی تنظیم کے لیے ڈاکٹر اعجاز احمد (صدر) صابر لودھی (سیکرٹری) اور راقم کا پریس سیکرٹری منتخب ہونا یاد ہے۔ یاد پڑتا ہے صوبائی سطح کے عہدیداران کا بھی انتخاب ہوا تھا جنہیں اپنے صوبے کے شہروں کی ایسوسی ایشن کی تنظیم کے لیے کہا گیا تھا۔ پروفیسر رفیق محمود' پروفیسر ظفر اقبال احمد اور پروفیسر خواجہ کرامت حسین کی طرح راولپنڈی کے ڈاکٹر اکرام (پروفیسر) نے دستور سازی اور قراردادوں کی ڈرافٹنگ وغیرہ کے فرائض میں ان تھک محنت کی۔ لیکچررز میں صابر لودھی' چودھری نذیر احمد مرحوم (فیڈرل جائنٹ سیکرٹری) چودھری غلام مصطفیٰ (حال وائس چانسلر ملتان) عارف رضا' شیخ توقیر احمد' ضیاء ڈار' خواتین میں انیتا غلام علی' عذرا حیدر' فریدہ مفتی' مسز اسلم اقبال' انیس توقیر کے نام فوری طور پر یاد آ رہے ہیں۔

کنونشن کا ایک سیشن مرکزی سیکرٹری تعلیم جناب قدرت اللہ شہاب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اکیڈمک سیشن کے شرکا کا جوش و جذبہ روح پرور تھا۔ ایسوسی ایشن کی قیادت اور سینئر ہمدرد رفقا کی کوششوں سے ایوب خان کے مرکزی وزیر تعلیم قاضی انوار الحق (جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا) ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ کے ساتھ ڈنر پر مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر انہیں بہت اطمینان اور تفصیل سے بریفنگ کی گئی۔ ایسوسی ایشن نے اپنے مطالبات کے لیے تسلسل کے ساتھ جلسے منعقد کیے اور جلوس نکالے' کالی پٹیاں باندھ کر

مطالبات پیش کیے۔ لاہور میں صابر لودھی' غلام مصطفیٰ چودھری اور عباسی صاحب بھوک ہڑتال پر تھے کہ یحییٰ خان کا مارشل لاء لگ گیا۔ اس کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو کا دور آیا۔ ایک نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان ہوا۔ ڈاکٹر اکرام' ڈاکٹر اعجاز احمد' صابر لودھی' چودھری غلام مصطفیٰ گروپ آہستہ آہستہ ایسوسی ایشن کے مطالبات کے ذریعہ اساتذہ کے لیے مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ڈاکٹر اعجاز احمد اور پروفیسر نذیر احمد چودھری وغیرہ بھٹو دور کی Lateral انٹری میں فیڈرل سول سروس میں چلے گئے۔ ملک میں سیاسی ہلچل پیدا ہو چکی تھی اور نظریاتی فضا میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں "اسلام پسند" کی اصطلاح رائج ہوئی۔ تنظیم اساتذہ نے کالجز سے لیکچررز اور سکول سے اساتذہ کی ٹریڈ یونیوں (متذکرہ ایسوسی ایشنوں) میں اثر ونفوذ بڑھایا۔ ون یونٹ کا خاتمہ ہو گیا۔ اب پنجاب لیکچررز ایسوسی ایشن کے جھنڈے تلے پروفیسرز اور لیکچررز کے مطالبات پیش ہونے لگے۔ جنرل ضیاالحق اپنے پیشرو ذوالفقار علی بھٹو کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قابض ہو گیا۔ پنجاب لیکچررز ایسوسی ایشن کی پرانی قیادت کا انتخاب کے ذریعہ تختہ الٹ کر اسلام پسند اور "تنظیم اساتذہ" کے ہمدر دلوگ کلیدی عہدوں پر آ گئے۔ نئے مرکزی عہدہ داروں میں پروفیسر افتخار باجوہ' حافظ خالد اسحاق' پروفیسر عارف رضا' پروفیسر عبدالرحمان شاکر اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے اساتذہ کی جدوجہد کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں پروفیسر عارف رضا اور پروفیسر غلام حیدر چشتی کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ انہوں نے اس جدوجہد میں اپنی صحت اور روپے پیسے کی قابل ذکر قربانی دی ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کو کیا پتہ کہ ترقی پسند اساتذہ نے کس طرح بیوروکریسی کا عتاب اور عذاب برداشت کیا۔ وہ لطیف ملک اور منور خاں جیسے تعلیم کے جابر سیکرٹریوں کے جلال اور غیض وغضب کا شکار ہوئے۔ اسی طرح اسلام پسند قیادت نے بھی بیوروکریسی کے ساتھ بہت مشکل وقت گزارا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے تو احمد صادق وغیرہ کا اپنے انتسابوں سے جمال خریدا ہے۔ بہر حال دونوں گروپوں کی مجموعی جدوجہد کے نتیجے میں لیکچررز کے ساتھ ساتھ پروفیسرز کے مسائل حل ہونے لگے۔ اس ضمن میں بڑا کام کالج کے اساتذہ کے تقرر اور تعیناتی کے نظام میں باقاعدگی کا بروئے کار آنا ہے۔ سب سے بڑا کارنامہ ایسوسی ایشن کے دیرینہ مطالبہ کا تسلیم کیا جانا ہے جسے ایک فارمولا کے مطابق ٹائم سکیل کے ساتھ Four Tiers کی شکل میں پروفیسر توقیر احمد شیخ نے پیش کیا تھا۔

اس فارمولا کے نتیجہ میں لیکچررز' اسسٹنٹ پروفیسرز' ایسوسی ایٹ پروفیسرز اور پروفیسرز کی آسامیاں براہِ راست انٹرویوز اور سینارٹی کی بنیاد پر باقاعدگی کے ساتھ پر ہونے لگیں۔ بی ایس 21 کی آسامی بھی اسی فارمولا کی پیداوار ہے۔ اس Four Tiers فارمولے سے لیکچررز اور پروفیسرز کی Service terms and conditions بہت خوشگوار ہو گئیں اور ان کی زندگیوں میں گویا بہار آ گئی۔ اب پانچ سات برس میں کالج کیڈر کا ہر آدمی آٹومیٹیکلی اگلے گریڈ میں ترقی پا جاتا ہے۔ آسامیوں کی Percentages کھلے

مقابلے کے لیے رکھی گئی ہے۔ اُس پر براہ راست سیلیکٹ ہونے والے نسبتاً زیادہ تیزی سے ترقی کے مراحل طے کرتے ہیں۔ 66-1964ء میں عارضی لیکچرار کے طور پر ملازمت کا آغاز کرنے والے سینکڑوں لیکچررز مدتوں 17 ویں گریڈ میں عارضی لیکچرار رہے۔ ان میں بیسیوں 18 ویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے۔ راقم جب ریٹائر ہوا تو سات برس سے اُس کی 19 ویں گریڈ میں پروموشن متوقع تھی۔ ریٹائرمنٹ کے اگلے دن 19 ویں گریڈ میں ترقی پانے والوں میں میرا نام آ گیا۔ چونکہ میں نے ریٹائرمنٹ سے پہلے دن afternoon تک جوائننگ رپورٹ نہیں دی تھی لہٰذا مجھے اس پروموشن سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مجھے دوستوں نے پٹیشن وغیرہ دائر کرنے کے مشورے دیے لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں نے تو Encashment کی رقم بھی وصول نہیں کی۔ شاید میں اپریل 1996ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد آج بھی پنشن کے بغیر زندگی گزار رہا ہوتا اگر صابر لودھی میری علالت کا احساس کرتے ہوئے دفتروں میں ''خجل خوار'' ہو کر میری پنشن جاری نہ کرا لیتے۔

باقی بات تو سمجھنے کی ہے۔ صدیوں سے ہر روز لوگ امیر سے غریب اور غریب سے امیر ہوتے چلے آئے ہیں۔ بیمار صحت مند ہو جاتے ہیں اور صحت مند بیمار۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختلف سروسز میں جونیئر سینئر پوسٹ پر آ جاتے ہیں' سینئر جونیئر بن جاتے ہیں۔ اس سلسلے کے بے شمار واقعات اور مثالیں ذہن میں ابھر رہی ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ کالج لائل پور میں ایک دن دوپہر کے بعد تک ہم کئی رفقائے کار پروفیسر منیر احمد چودہری (میرے استاد بھی) سمیت بیٹھے گپ شپ کرتے رہے' لطیفے سنا کر ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ اگلی صبح پتہ چلا کہ چودہری صاحب نے پرنسپل شپ کا چارج سنبھال لیا ہے۔ ڈاکٹر غلام سرور خاں نیازی نے مجھے کہا چلو چودہری صاحب کو مبارکباد دے آئیں۔ ہم پرنسپل کے دفتر کے سامنے پہنچے؛ چپراسی نے ہمیں دیکھ کر چق تھام لی۔ ڈاکٹر نیازی صاحب نے کافی بلند آواز میں پوچھا ''کیوں بھئی صاحب بیٹھے ہیں ناں۔'' میں اُس دن سے یہ واقعہ دہرا رہا ہوں کہ کس طرح ایک ہی رات میں چودہری صاحب ''صاحب'' کے مرتبہ پر جا پہنچتے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے 21 ویں گریڈ کے اعزاز پانے کے پونے چار سطری نوٹ میں عزیزہ انبساط امین عباسی کی طرف سے لکھا ہے:

''اردو اور آرٹس فیکلٹی میں قیام پاکستان کے بعد سے یہ (بی ایس 21) پہلا اور اب تک کا واحد امتیاز ہے۔ جس میں کوئی دوسرا ان (معین صاحب) کا شریک نہیں۔'' (دل کی کتاب' صفحہ 391)

یہ اقتباس ''نقل کفر' کفر نباشد'' کے اجازت نامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے نقل کیا گیا ہے۔ خوشی یقیناً ایک عظیم احساس ہے' خوشی کا واقعہ اور احساس کے مطابق اس کی مختلف ڈگریاں ہیں۔ فلموں میں دیکھا ہے اور اخباروں میں پڑھا ہے۔ کئی لوگ لاٹری نکلنے کی خوشی کی تاب نہیں لاتے رہے۔ ہمارے ڈاکٹر معین الرحمٰن کو 21 ویں گریڈ کی بدرجہ اتم خوشی ہے۔ دکھتا ہے ان کا دماغ بے اختیار ہو گیا۔ انھوں نے تو اوپر درج فقرے لکھ

لیے اور چھاپ بھی دیے لیکن میں جتنی بار پڑھتا ہوں ' لرز جاتا ہوں۔ آپ کے پڑوسی کی خوشی ٹھیک ہے۔ اس نے تو آپ کی دیوار کے ساتھ تین چار منزلہ بلڈنگ کھڑی کر لی۔ اس کے فرنٹ کے پلرز وہائٹ ہاؤس ڈیزائن کے تعمیر کروا لیے۔ آپ نے ان کی ہاؤس وارمنگ تقریب میں شریک ہو کر مبارکباد بھی دے دی۔ اب اگر وہ صبح شام لاؤڈ سپیکر بھی آن رکھے تو زیادتی ہوگی۔ دوسرے پڑوسی نے خوشی کی تقریب منعقد کی۔ رات دو بجے تک ریکارڈنگ کر لی' شادیانے بجا لیے۔ اسے فجر کی اذان کے ساتھ تو شادیانے بند کروا دینے چاہیں۔ یہ بات ڈاکٹر معین الرحمٰن نہیں سمجھے۔

اس سوانحی خاکہ کا دوسرا سیکشن ''تعلیم'' کے زیر عنوان ہے۔ اس کے ذیل میں میٹرک سے پی ایچ ڈی تک امتحان پاس کرنے کا مقام اور سند درج کیا گیا ہے اور التزام قائم کیا گیا ہے کہ کسی امتحان کی ڈویژن نہ درج ہونے پائے۔ قارئین ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مزاج کو پا چکے ہوں گے۔ اگر ان میں سے کسی ایک امتحان میں بھی ان کی فرسٹ ڈویژن ہوتی تو وہ اس کو کس کس انداز میں نمایاں کرتے' سب جانتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ان کا اکیڈمک کیریئر ہم آپ جیسا عام سا ہی ہے۔

اعلیٰ امتیاز: صدارتی ایوارڈ' اعزاز فضیلت حکومت پاکستان 1998ء

اس امتیاز اور ایوارڈ کی حقیقت بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ اس کے حصول میں بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے جو نہیں جانتے وہ نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ اعلیٰ امتیاز پانے کے لیے سب سے پہلے اس تعاقب میں رہنا پڑتا ہے کہ اس ایوارڈ کے لیے درخواستوں کے پروفارمے کب جاری ہو رہے ہیں۔ پھر انہیں اسلام آباد کے کس دفتر سے کس طرح حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد تقریباً 30 پرفارموں کا سیٹ پر کر کے ان کی تصدیق کرانی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ اسناد کی مصدقہ نقول نتھی کرنا ہوتی ہیں۔ اس کے بعد پرنسپل کے فارورڈنگ لیٹر کے لیے انہیں کالج کے ہیڈ کلرک کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔ وہاں سے ڈائریکٹر اور سیکرٹری ایجوکیشن تک پہنچنے کے مراحل ہیں۔ اس کے بعد اسلام آباد سیکرٹریٹ میں متعلقہ سیکشن میں یہ سارا پلندہ پہنچانا اور آخر میں سفارشوں کی اڈگھٹ گھاٹیاں عبور کر کے ڈیڑھ دو سو امیدواروں کے رش میں سے نکل کر ان بیس پچیس افراد کی قطار میں کھڑا ہوتا ہے جنہیں اعزاز فضیلت عطا کیا جانے والا ہے۔

دیگر اعزازات کا دوسرا اندراج:

''اردو ادب اور شعبہ تعلیم میں عالمی پذیرائی کی سند استحقاق اور نامۂ امتیاز کا اجراء بجانب انٹرنیشنل بائیوگرافیکل سنٹر کیمبرج۔ انگلینڈ 1995ء

استفسار: مندرجہ بالا دونوں شعبوں میں عالمی پذیرائی کی نوعیت اور کیفیت کیا تھی۔ اس کا مظاہرہ سند استحقاق اور نامۂ امتیاز جاری کرنے والے ادارے نے کہاں دیکھا۔

اگلے تین اعزاز بالترتیب یوں درج ہیں

1۔ فیلو آئی بی اے (کیمبرج) انگلینڈ 96-1995ء

2۔ انٹرنیشنل اقبال کانگریس گولڈ میڈل لاہور 1977ء

3۔ لوحِ اعزاز بسلسلہ دوصد سالہ جشن ولادت مرزا غالب' خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران' لاہور 1997ء

ان میں سے پہلے اعزاز کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اقبال کانگریس 1977ء میں 350 کے قریب غیر ملکی' ملکی اور لاہور کے مقامی ڈیلی گیٹس نے شرکت کی تھی۔ یہ دستور ہے کہ کسی کانفرنس یا کانگریس کے اختتام پر ڈیلی گیٹس کو تحائف از قسم بیگ' بریف کیس' قلمدان' گھڑی' شیلڈ وغیرہ یادگاری تحفہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اقبال کانگریس کے اختتام پر گولڈ میڈل بانٹے جاتے ہیں۔ یاد رہے گولڈ میڈل عموماً کسی خصوصی کارکردگی پر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا اقبال اور اقبالیات میں کوئی قابلِ ذکر کام بھی نہیں ہے۔ ''جامعات میں اقبالیات کا مطالعہ'' (فہرست سازی) اور سید وقار عظیم کے غیر مدون مضامین ''اقبالیات کا مطالعہ'' کے نام سے اقبال اکادمی نے شائع کیے۔ اس پر حاشیہ نگار اور مرتب کی حیثیت سے ڈاکٹر معین الرحمٰن کا نام ہے۔ کمال یہ ہے کہ گولڈ میڈل کی اس عام تقسیم کو موصوف خصوصی اعزاز قرار دیتے ہیں۔

غالب کے جشن دوصد سالہ پر لوحِ اعزاز کی پیش کش بھی ایک رسمی بات تھی۔ ایک بڑے آدمی (جیسا وہ بنتے ہیں) کے سی وی میں اس طرح کی معمولی شیلڈ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان کی یہ ساری نمائش بچپنے کی سی ہے۔

اعترافات:

اس عنوان کے تحت 9 مختلف اندراجات ہیں۔ پہلا اندراج ملاحظہ فرمائیے:

1۔ سال 1994ء کی ممتاز شخصیت (مین آف دی ائیر) بجانب: دی امریکن بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ' امریکہ' 1995ء

[کیا یہ ادارہ امریکن فیڈرل گورنمنٹ کا کوئی ذیلی ادارہ ہے؟ اس ادارے کے مقاصد کیا ہیں اور اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے کس کارنامے کی بنیاد پر انہیں 1994ء کا مین آف دی ائیر قرار دیا گیا؟ کیا ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مساعی اور تعلیمی تحقیقات سے متاثر ہو کر امریکہ نے اپنا تعلیمی نظام تبدیل کر لیا؟ 1994ء میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے صرف ''تحقیق نامہ'' مجلہ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج کا شمارہ 3-4 (1994-95) مرتب کیا۔ (دیکھیے دل کی کتاب صفحات:400)

اس سال ان کا دوسرا بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے پرتھوی چندر کی کتاب ''جا گیر غالب'' ایسے انداز میں شائع کی جس سے معین الرحمٰن' اس کتاب کے مصنف معلوم پڑتے ہیں۔ کتاب کے ٹائٹل پر جاگیر غالب۔ ترتیب نو' تعارف' مقدمہ۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (بحروف جلی) اندرونی ٹائٹل' صفحہ 3 پر نام کتاب (جاگیر غالب)۔ تعارف' مقدمہ۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن۔ مکتبہ ٥، دال چکھ نی روڈ لاہور' مختلف قلموں سے لکھے

گئے ہیں۔ پرتھوی چندر کا نام پہلی بار زیرنظر کتاب کے صفحہ 15 پر شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کے ایک اقتباس میں اس طرح آیا ہے۔

''۔۔۔اس کتاب کے مترجم اور ناشر دہلی کے ایک صاحب پرتھوی چندر ہیں۔۔''

[اس کتاب میں شامل CV میں جاگیر غالب کا سنہ اشاعت 1991ء درج ہے]

مجلہ ''تحقیق نامہ'' کے متذکرہ شمارہ میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے دو مضمون ''اقبال پر غالب کا اثر اور ان کی گرفت'' اور ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی'' [اگر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر نذیر احمد (دہلی) ان دونوں مضامین کی تنقیدی و تحقیقی قدر و قیمت کی وضاحت فرمادیں تو بہتوں کا بھلا ہوگا] شامل ہیں۔

کیا ان دونوں مضمونوں کی بنیاد پر موصوف کو 1994ء کا Man of the Year قرار دیا گیا ہے؟ حوالہ کے لیے اس ادارہ کے کسی رسالہ یا کتاب کا نام وغیرہ نہیں دیا گیا۔

2۔ اس اندراج کے مطابق بورڈ آف انٹرنیشنل ریسرچ 'امریکن بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ امریکہ 1995ء نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کو عشرہ رواں کی ممتاز شخصیت "Most Admired Man of the Decade" قرار دیا ہے [جب حقائق' واقعات اور حوالے سامنے نہ ہوں تو قیاس ہی سے کام لیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے بوسٹن کے کسی پبلک ہال میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے جناب ڈاکٹر داؤد رہبر کے فلسفہ ادیان کے بخیے ادھیڑ کر مقبولیت حاصل کی ہو]

3۔ انٹرنیشنل ہواز ہو آف انٹیلکچولز کے گیارہویں ایڈیشن مطبوعہ کیمبرج' انگلینڈ 96-1995ء میں نمایاں کامیابیوں کا اندراج''

[موصوف کی تصنیف و تالیف کے حوالے سے ایک نمایاں کامیابی یہ ہو سکتی ہے کہ شاید انہوں نے ایڈورڈ سعید کی کتاب Orientalism کے موقف کو رد کرتے ہوئے New Orientalism کے نام سے کتاب برطانیہ میں محدود اشاعت کے طور پر چھپوائی ہو]

4۔ ڈکشنری آف انٹرنیشنل بائیوگرافی کے چوبیسویں ایڈیشن' مطبوعہ کیمبرج انگلینڈ 1996ء میں نمایاں خدمات کا اعتراف''

[ہمیں متعدد قارئین نے بلا وجہ اس الجھن میں ڈال دیا کہ ہم ان کے لیے ڈاکٹر معین صاحب کے دیگر اعزازات کی توضیح و توجیہہ کریں۔ کافی دیر سے ہم ''ڈکشنری آف انٹرنیشنل بائیوگرافی'' کے الفاظ اور معین صاحب کی نمایاں خدمات کا اعتراف'' میں ربط ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس اثنا میں ہمیں لائل پور کی ''تعلیمی دنیا'' سے دو واقعات یاد آگئے۔ ہمیں علم نفسیات میں Free Association کی سائنسی بنیاد یہ اجازت بھی دیتی ہے کہ ہم اس کی رو سے جو چاہیں لکھ دیں۔ ہمیں یاد آیا ہے:

1960ء اور 1965ء کے دوران مشہور عالم نفسیات پروفیسر کرامت حسین جعفری گورنمنٹ کالج

لائل پور کے پرنسپل تھے۔ ایک سال یونیورسٹی کے امتحان بی اے/ بی ایس سی کے نتائج آئے۔ ان کے ایک فزکس یا کیمسٹری کے استاد کی کلاس کا نتیجہ یونیورسٹی کے نتیجے سے کم آیا۔ مرحوم جعفری صاحب نے متعلقہ استاد کو بلا کر وضاحت چاہی۔ استاد محترم نے جواب دیا۔ سر' میں نے کلاس کو پڑھایا تو بہت تھا۔ جعفری صاحب نے جواب دیا۔ ''پروفیسر صاحب اس بار نہ پڑھا کر دیکھ لیں' انشاء اللہ آپ کا یونیورسٹی سے above رزلٹ رہے گا۔''

ہمارے ایک مرحوم دوست رانا ارشاد احمد خاں لائل پور کی ایک جینئس شخصیت تھے۔ میونسپل ڈگری کالج لائل پور میں پڑھاتے تو اردو تھے مگر انگریزی اور اس کے توسط سے یورپی ادب' فارسی' فلسفہ' نفسیات' سیاسیات' تاریخ' انٹرنیشنل افیرز اور مارکسزم میں لفظاً ومعناً دسترس رکھتے تھے۔ ن۔ م۔ راشد لائل پور تشریف لاتے تو ان سے ملاقات کے لیے لائل پور کی علمی' ادبی' صحافتی اور تعلیمی سرکردہ شخصیات پہنچتی تھیں۔ ہر روز کی ایک نہ ایک نشست میں ادبیات کے پروفیسروں کے ہمراہ رانا ارشاد احمد خاں بھی موجود ہوتے تھے۔ وہ اپنے فطری انکسار طبیعت کے ساتھ راشد صاحب سے ان کی نظموں کے بارے میں استفسار کرتے تو سوال در سوال اور جواب در جواب میں معلوم ہوتا۔ راشد کی نظموں کی Interpretation نہ کسی نے کی ہوگی اور نہ کرے گا۔ افسوس ہم یہ گفتگوئیں حافظے میں بھی ریکارڈ نہ کر سکے۔

ایک دن میاں عبدالسلام رسول پرنسپل ڈگری کالج لائل پور نے پروفیسر رانا ارشاد احمد خاں کو اپنے دفتر میں بلوایا۔ انہیں نامۂ تحسین تھماتے ہوئے کہا۔ مبارک ہو' آپ کی انٹر کلاس کا اردو میں سو فیصد رزلٹ رہا۔ پروفیسر رانا ارشاد احمد خاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جب آپے میں آئے تو کہا۔ میاں صاحب میں آج معافی کا خواستگار ہوتے ہوئے آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے کبھی یہ کلاس لی ہی نہ تھی۔

رانا صاحب مرحوم کینٹین پر یا لائبریری میں شہریوں' پروفیسروں اور طالب علموں کے جمگھٹ میں بیٹھے علمی اور درسی باتیں کرتے' لطیفے سناتے' ہنستے ہنساتے' ہر نئے آنے والے کے لیے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے شام کر دیتے تھے۔

[ہمارا خیال ہے ڈکشنری آف انٹرنیشنل بائیوگرافی کے مرتبین نے بھی یہی کیا اور سوچا ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کا ڈکشنری میں اندراج ہم کر دیتے ہیں۔ اپنی خدمات لوگ خود سر انجام دے لیں گے]

5۔ یادگاری شیلڈ' علامہ اقبال کانگریس کراچی 1984ء

6۔ یادگاری شیلڈ کل پاکستان انشائیہ کانفرنس' ملتان 1988ء

عام قارئین کے لیے یہ علمی کانگریسیں' کانفرنسیں اور مشاعرے وغیرہ بعد میں ان کی مطبوعہ روداد یں ایک غیر زمینی' رومانٹک اور ماورائی سی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ ان سے مسحور ہو کر حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ مختلف پیشہ ورانہ تنظیمیں اپنے پیشے کے فروغ کے لیے ایسی کانگرسوں اور کانفرنسوں وغیرہ کا انعقاد

کرتی رہتی ہیں۔ ان تنظیموں کا بالائی اور فعال طبقہ باہمی لین دین اور من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کو مدعو کرتا رہتا ہے۔ ان کانفرنسوں میں شرکت سے لوگوں کا سیر سپاٹا اور باہمی ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔ وہاں اپنی خدمات جتا کر لوگ اپنا نام بھی کر لیتے ہیں۔ اقبالیات کے مورخ اور اقبال شناسوں کے سوانح نگار ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا اقبالیات میں امتیازی کام کیا ہے' جس کے پیش نظر انہیں کراچی کے لیے سفر کرنے کی زحمت دی گئی۔ جہاں تک یادگاری شیلڈ کا تعلق ہے' ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ معین صاحب کے منصب اور عمر کے لوگ ایسے شیلڈ اور یادگاری تحفے متعلقہ کانفرنس کے شہر میں اپنے بھائی یا بہن کے بچوں کو دے آتے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر معین الرحمٰن کا فن انشائیہ کی تنقید و تاریخ یا انشائیہ نگاری سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ دراصل اس کانفرنس کا انتظام وانصرام ملتان کی اُس وقت کی انٹیلکچویل انتظامیہ نے کیا تھا۔ وہاں معین صاحب اور راقم کے لائل پور میں ایک پرانے رفیق کار (محمد افسر ساجد) اے سی تھے۔ خون اور دوستی کے رشتوں کی طرح منصب بھی رشتہ و پیوند کا باعث ہوتا ہے۔ جناب اے سی صاحب نے صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کو بلانا تھا سو بلا لیا۔ پتہ نہیں انہوں نے وہاں کیا پڑھا۔ اگر ہم سے مشورہ کر کے جاتے تو ہم انہیں تجویز کرتے کہ ''مرزا غالب اور موئخین میں وحدت فکر'' کے موضوع پر مقالہ لکھیں۔ غالب کو وہ جانتے ہیں۔ موئخین کا دال دلیہ ہم کر لیتے' یوں مل ملا کر ایسا شاندار مقالہ تیار ہوتا کہ وزیر آغا' نظیر صدیقی' ڈاکٹر سلیم اختر اور مشکور حسین یاد ایک دفعہ تو تڑپ اٹھتے۔ اس طرح معین صاحب کے لیے نہ صرف یادگاری شیلڈ وصول کرنے کا بلکہ اپنے CV میں اس اندراج کا جواز بھی بن جاتا۔ یہاں پھر ایک واقعہ یاد آ گیا۔

کوئی اٹھارہ بیس برس قبل ہمارے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے اردو کے فروغ اور اسے قومی زبان کا مرتبہ دینے کی اپنی تحریک کے سلسلے میں اردو کانفرنس کا ایک اجلاس سرگودھا میں منعقد کیا۔ ہمارے دوست مشہور مورخ پروفیسر شیر محمد گریوال شرکت کے بعد واپس آئے تو اگلے دن گورنمنٹ کالج کے برآمدوں میں ملے۔ میں نے مبارکباد دی اور شاید سید صاحب کا گلہ کیا کہ انہوں نے اپنے ایک زمانے کے معتمد یعنی راقم کو نظر انداز کیا۔ انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا:

''سید صاحب کو مقالہ پڑھنے والے کی ضرورت تھی اور ہم جیسے نو وارد کو اسٹیج چاہیے تھا۔ انہوں نے بلایا ہم وہاں جا کر مقالہ پڑھ آئے' دونوں کا کام ہو گیا۔'' مقصد یہ ہے کہ اگر خالی ہال میں کانفرنس اور کانگریس کامیاب قرار پا جایا کرے تو منتظمین کو پیپر زلکھوانے' لکھنے والوں اور حاضرین کو جمع کرنے اور ان سب کے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کیا ضرورت ہوتی۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن جیسے مندوبین کو یادگاری شیلڈ کا بوجھ اٹھا کر ملتان' تا لاہور کا سفر نہ کرنا پڑتا۔ پھر اس کے ذکر کے لیے CV میں تقریب پیدا کرنے کی سردردی نہ مول لینی پڑتی۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے سوانحی خاکہ کے سرسری مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے تئیں ایک کامیاب آدمی کی مثال ہیں۔ بلاشبہ اس کامیابی میں ان کی محنت' ذہانت اور لیاقت کے علاوہ تائید غیبی بھی شامل ہے۔

ہمارے نزدیک ان کا اصل عظیم کارنامہ ایک کتاب ''گورنمنٹ کالج اور میں'' ہے، جو انہوں نے خواجہ محمد سعید جیسے ہشیار اور سیانے آدمی سے لکھوائی اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف اپنے جذبہ انتقام میں انہیں شریک کیا۔ خواجہ محمد سعید نے اس کتاب میں بتایا کہ یہ کتاب ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مسلسل' متواتر اور برابر اصرار سے مجبور ہو کر لکھی گئی ہے ورنہ انہوں نے تو 85 سال کی عمر تک کوئی خط بھی ڈھنگ سے نہیں لکھا تھا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن واقعی واعظ سے بھی زیادہ باریک چالیں چلنے میں ماہر ہیں۔ ایک طرف انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا تھا' خواجہ محمد سعید سے کہلوایا۔ دوسری طرف انہوں نے خواجہ محمد سعید کے خلاف اپنے کسی پس پردہ گلے کا بھی حساب چکا دیا اور خواجہ محمد سعید کے اپنے قلم سے یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ جنہیں پروفیسر پطرس بخاری (پرنسپل) اور صوفی تبسم نے 1948ء میں اردو پڑھانے کے لیے گورنمنٹ کالج میں تقرری دی اور جنہیں بعد ازاں ڈاکٹر محمد صادق جیسے بلند پایہ اردو محقق اور نقاد کی ہیڈ شپ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ کئی برس اردو لیکچرار کے طور پر اور دس برس صدر شعبہ اردو کی حیثیت میں فرائض انجام دیے اور سات آٹھ برس گورنمنٹ کالج کی طرف سے پنجاب یونیورسٹی شعبہ اردو میں بہ حیثیت خارجی استاد ایم اے کلاس کو ہفتہ میں ایک پیریڈ بھی پڑھایا اور اپنی اس بیالیس سالہ تدریسی زندگی میں کتاب تو رہی ایک طرف' کوئی مضمون بھی شائع نہ کرایا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن اور عزیزہ نائیلہ انجم کی 15 سالہ باہمی مراسلت میں کئی جگہ ڈاکٹر صاحب کا ثقاہت پر اصرار اور زور بیان صرف ہوا ہے مگر خطابت ایک چیز ہے اور خطاب میں تلقین' اخلاقی درس اور پھر ذاتی عمل دوسری چیز ہے۔ مگر یہ بھی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا ایک عمومی المیہ ہے کہ قارئین' سامعین اور ناظرین اپنے خطیبوں' ادیبوں اور آئیڈیل کرداروں کے قول و فعل میں تضاد اور دوئی دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے۔ شاید اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ کلمات تلقین کو پڑھ اور سن کر یا پرفارمنس کی صورت میں دیکھ کر باطنی طور پر متاثر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ انہیں اعلیٰ قدروں سے رغبت اور احسن افعال سے دلچسپی ہونے لگتی ہے مگر جب وہ اپنی ان بلند مقام اور ممتاز شخصیات کے قول و فعل کا تضاد دیکھتے ہیں تو ان کے اقوال اور تلقین سے پیدا ہونے والی رغبت' دلچسپی اور آمادگی زلزلے کی زد میں آ جاتی ہے۔ ان کے نوزائیدہ ارادے اور عقیدہ میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا نفاست اور ثقاہت کا پیٹا ہوا ڈھول قارئین کے کانوں کی خراش بن جاتا ہے جب ''دل کی کتاب'' کی پشت پر اپنی تصویر کے نیچے سید ضمیر جعفری سے منسوب نمایاں حروف میں وہ درج

ذیل سطریں نقل کرتے ہیں:

''ڈاکٹر معین الرحمٰن اپنی تصویر سے کہیں زیادہ پیارے اور خوبصورت ہیں۔۔۔میں ان کی تحریر کی اندرونی رعنائیوں کا مدت سے دلدادہ تھا' مگر وہ تو لکھتے بھی موتیوں کی طرح ہیں! اب لگتا ہے کہ یہ چاندنی 'اُن کو اپنے خاندان کے ماحول' روایات اور تربیت سے ملی ہے۔'' خود پرستی کا یہ اعلان کہاں کی ثقاہت ہے۔

کاش ڈاکٹر معین الرحمٰن یہاں پر بڑھاپے یا ادھیڑ عمری کی تصویر کی بجائے اپنی نوجوانی کی تصویر چھپاں کرتے جیسے مشہور مزاح نگار ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کرتے رہے ہیں۔ تو سید ضمیر جعفری کی غلط فہمی دور ہو جاتی اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ موصوف اپنی تصویر میں بھی بہت خوبصورت تھے۔ غالباً سید ضمیر جعفری ٹھیک کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کی تصویر اچھی نہیں بنتی۔ فارسی کے ایک استاد اور ڈیرہ غازی خان کے شاعر پروفیسر شریف اشرف کو بھی تو ڈاکٹر صاحب کی خوبصورتی دیکھ کر غزل کہنے کی تحریک ہوئی تھی۔

اگر یہ سب درست ہے تو ہمیں اعتراض کس بات پر ہے۔ شاید ہمیں معین صاحب کے لفظ ثقاہت پر اصرار نے گمراہ کیا اور ہم بھول گئے کہ اگرچہ زمانے کے ساتھ لفظوں کے لغوی معنی نہیں بدلتے مگر ان کی Connotation ضرور بدل جاتی ہے۔ اب غالب کے میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں تصویر کا ایک فریم دیکھیے:

میر سرفراز حسین سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ ان کی بیوی اپنے شوہر کو درپیش سفر اور جدائی کا تصور کر کے شوہر سے لپٹ کر رونا چاہتی تھی مگر اس زمانے کی ثقاہت مانع رہی' وہ دور کھڑی اپنے آنسو ضبط کرتی رہی۔ اب ہم ہر روز ایرپورٹ پر دیکھتے ہیں کہ میر سرفراز حسین جیسا ہی ایک نوجوان الوداعی کلمات کہتے ہوئے ماں' بہن' خالہ' چچی' ممانی' بھابی' باپ' بھائی کو خدا حافظ کہتے ہوئے کسی کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے' کسی سے پیار لیتے ہوئے' بے اختیار ہو کر اپنی بیوی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے وہ اسے بھینچ لیتی ہے۔ وہ اُسے چوم کر آنکھوں میں ابلتے ہوئے آنسو چھپا کر مسافروں کے لاؤنج میں بھاگ کر داخل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح انارکلی اور لبرٹی مارکیٹ میں شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ میاں بیوی رواں چلے جا رہے ہیں۔ میاں نے اپنا دودھ پیتا بچہ گود میں اٹھایا ہوا ہے۔ وہ اسے پچکار رہا ہے یا اس کے منہ میں فیڈر دے کر خاموش رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیوی اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالے گرد و پیش کے ہجوم کو مفتخرانہ دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ثقاہت کے باب میں یہ روایت سنتے رہے ہیں کہ باپ گھر سے باہر یا خاندان کے لوگوں کے سامنے اپنے بچے کو گود نہیں لیتا تھا۔ اسے فیڈ کرنا تو دور کی بات ہے۔

ہماری تالیف ''ناطقہ سر بگریباں'' کے محرک جناب احسن خاں (لغت والے) نے کتاب کے مطالعہ کے بعد ہمیں فون کیا' دو چار باتوں کے بعد فرمایا۔ ''اچھا وہ جو آپ نے اس کتاب کے ایک ضمیمہ بعنوان ''کچھ ویسٹ لینڈ کے اردو ترجمہ کی باتیں'' کے آخر میں لکھا ہے کہ مانٹریال میں منعقدہ سیمینار میں شرکت پر

آپ کے ساٹھ ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ یہ کیوں لکھا؟"

ہم نے جواب دیا: کیوں نہ لکھتا۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ بزم ادب مانٹریال کے صدر ڈاکٹر شفیق علوی (سابقہ ریسرچ آفیسر پاکستان پلاننگ کمیشن اور کنکورڈیا یونیورسٹی مانٹریال کے صدر شعبہ معاشیات) نے کہا تھا کینیڈا حکومت کی کلچرل گرانٹ ملنے والی ہے۔ اپنا ٹکٹ خرید کر سیمینار میں شرکت کیجیے۔ گرانٹ میں دیر ہوئی تو مشاعرے سے ٹکٹوں پر آمدنی اور بزم ادب کے فنڈز یا عہدیداران کی کنٹری بیوشن سے ادائیگی ہو جائے گی۔ نامور شعرا اور بعض دوسرے شرکاء کو تو ادائیگی کی تھی نا"

احسن خاں نے فرمایا "اس کے باوجود آپ کو نہیں لکھنا چاہیے تھا"

میں نے پھر پوچھا "بھئی آخر کیوں نہ لکھتا"

خاں صاحب نے پوری متانت سے فرمایا: "یہ ثقاہت کے خلاف ہے۔ اس طرح کی باتوں سے اپنی سبکی ہوتی ہے۔"

انہی خاں صاحب کو جب میرے کسی بزرگ، دوست، رفیق کار یا میرے دوست ناشر پر اعتراض یا اس سے اختلاف ہوتا ہے تو وہ سرزنش میری کرتے ہیں "اس نے یہ کیا لکھا ہے۔ اُس نے ایسا کیوں چھاپا ہے" اب میں اس دن سے ڈرتا ہوں جب وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصنیف "دل کی کتاب" دیکھیں گے تو یقیناً مجھ سے پوچھیں گے: "یہ معین الرحمٰن کی تصنیف کیسے ہوئی؟ کتاب کا پون حصہ تو مختلف لوگوں کے ساتھ انٹرویوز پر شامل ہے۔ میں کوئی جواز پیش کروں گا تو وہ کہیں گے اس کتاب کے باہر اور اندر کے ٹائٹل پر "از ڈاکٹر معین الرحمٰن اور مرتبہ انبساط امین عباسی" چھپا ہوا ہے۔ میں ان سے کہوں گا کہ میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ وہ اصرار کریں گے "نہیں آپ بتائیں اردو آپ کا مضمون ہے، آپ ان کے بہت قریب تھے۔ وہ آپ کے سابق صدر شعبہ تھے۔"

اب میں خاں صاحب کو کیسے بتاؤں کہ بلاوجہ اعتراض اور اصرار نہیں کرتے کہ ان کا یہ طریقہ بھی اُس ثقاہت کی تکذیب کرتا ہے، جس کی وہ تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح "اعتراف خدمات، توثیقی دستاویز:

125 سالہ تقریبات گورنمنٹ کالج لاہور 1989ء" کا اندراج بھی دلچسپ ہے۔

شاید قارئین سمجھتے ہوں گے کہ یہ توثیقی دستاویز Exculsively ڈاکٹر معین الرحمٰن کو ملی تھی، جی نہیں یہ درست نہیں، کوئی پونے دوسو کے قریب یہی اسناد اوپر سے لے کر بیلدار تک کسی تقریب میں نہیں عطا ہوئی تھیں، متعلقہ شعبوں میں متعلقہ اشخاص وافراد کو دینے کے لیے بھجوادی گئی تھیں۔

اعترافات کے سلسلے کا اگلا اندراج" کالج کا نشان اور لوح سیمیں، صدارتی اعزاز فضیلت ملنے پر گورنمنٹ کالج لاہور 1999ء" ہے۔

اعزازِ فضیلت کی کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔کالج کا نشان اور لوح ہمیں معلوم بات ہے۔

باقی رہا تحفۂ یادگار 'داتیو بنکا یونیورسٹی جاپان 1999ء

اس یونیورسٹی کا سٹیٹس تو معلوم نہیں بہر حال قیاس ہے کہ کسی ''سالگرہی'' تقریبات کے موقع پر کوئی قیمتی پین یا بال پوائنٹ کسی رسمی حوالہ سے آیا ہوگا۔

متذکرہ اعترافات کے بعد صفحات 393 تا 396 پر مندرجہ ذیل پانچ عنوانات کے تحت بعض تفصیلات درج ہیں:

1۔انعامات

2۔موجودہ مصروفیت

3۔پچھلی مصروفیات

4۔اعلیٰ مدارج میں تحقیقی اور امتحانی کام سے وابستگی

5۔کچھ اہم حالیہ اور سابقہ علمی وتہذیبی ذمہ داریاں

حقیقت کے متلاشی قارئین ڈاکٹر معین الرحمٰن کے زیرِ نظر سوانحی خاکہ میں متذکرہ پانچوں سیکشن کی تفصیلات دیکھ لیں اور گزشتہ صفحات کے جائزے کی روشنی میں اندازہ کر لیں کہ روزانہ معمول کی باتیں اور مصروفیتیں ہیں جنہیں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے زیبِ داستان یا شخصی طلسم باندھنے کے لیے Glorify کرنے کے لیے ذرا پھیلا کر بیان کیا ہے۔

اس سوانحی خاکہ کے آخری سیکشن کا عنوان ''تصنیفات وتالیفات' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن'' ہے۔یہ سیکشن چھ ذیلی سلسلوں پر مشتمل ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ چون (54) کتابوں کی فہرست ہے۔یہ فہرست مبہم سے انداز میں مرتب کی گئی ہے۔سرسری انداز میں (فہرست دیکھنے کا عام انداز) دیکھنے سے پہلا بھرپور یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ تمام کتابوں کے مصنف ڈاکٹر معین الرحمٰن ہیں مگر یہ ایک مغالطہ ہے۔یہ مغالطہ انگیزی ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ متعدد کتابیں جو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصنیف نہیں ہیں' ان کے باہر اور اندر کے سرورق پر ڈاکٹر معین الرحمٰن کا نام بحیثیت مصنف کتاب ظاہر کیا گیا ہے' جبکہ امرِ واقعہ اور حقیقت کے پیشِ نظر واضح طور پر ''مرتب کتاب'' لکھا جانا چاہیے۔اسی طرح محتاط اندازے کے مطابق متذکرہ چون (54) کتابوں میں سے 90 فی صد کتابیں ان کی تصنیف نہیں ہیں۔انہوں نے ہلکے ہلکے بہانوں سے رشید احمد صدیقی' مولوی عبدالحق' سید وقار عظیم' یلدرم اور آل احمد سرور کی کتابوں اور ان کے اسماء سے اپنا نام جوڑ رکھا ہے۔وہ زیرک' سمجھ دار اور ہوشیار آدمی ہیں مگر وہ اپنی ایک خواہش کے ہاتھوں مجبور ہیں۔بات دراصل یہ ہے کہ اپنے اپنے حلقے' طبقہ اور دائرہ کار میں تھوڑا بہت اہم یا بڑا آدمی بننے کا جذبہ یا شوق ہر فرد کو ہوتا ہے۔بالفاظِ دیگر ایک شخص پہلے سے بہتر ہونے یا بننے کا آرزومند ہوتا ہے اور یہ بڑا مثبت اور مستحسن جذبہ ہے

جسے ساری انسانی تمدنی اور تہذیبی زندگی کا ضامن کہنا چاہیے۔ انسان میں آگے بڑھنے یا ترقی پانے کی آرزو اُسے کہاں تک لے جاتی ہے' یہ قدرت کا اپنا ایک پراسرار عمل ہے جو منحصر ہوتا ہے قدرت اور فطرت کی عطا کردہ Opportunity اور Potential پر۔ داستانوں میں 'ہما' کا جو استعارہ ہے وہ شاید زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کسی انسان کی زندگی میں خوش بختی کا لمحہ کون سا ہے اور یہ کب آتا ہے یہ ایک پراسرار اور ناقابل فہم واردات ہے۔ لوگوں کا شب و روز کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ ان کے دائیں بائیں ہی سے غیر متوقع طور پر اور اچانک ایک آدمی نکلتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کا ستارا بن جاتا ہے۔ کم و بیش کچھ ایسے ہی انداز میں غیر متوقع طور پر ایک آدمی کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے کہ نحوست اور زوال اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ایک آدمی کا بہترین طرز عمل کیا ہونا چاہیے' اسے ایک گُر یا فارمولے میں تو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ طرز عمل مختلف طبیعتوں اور حالتوں سے مشروط ہے مگر ایک بات ہے جسے حسن معیار قرار دیا گیا ہے وہ ہے توازن' تحمل' بردباری' قناعت اور صبر۔ جہاں اور جب توازن بگڑا' فساد اور خرابی کا عمل شروع ہوا۔

اس زاویے سے دیکھیں تو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی زندگی فطرت کے ایک معمول کے مطابق ہے۔ ان کا بچپن' لڑکپن اور نوجوانی کا وقت مشکل رہا مگر وہ اس کو آسان بنانے کے لیے کوشاں رہے تا آنکہ 74-1973ء میں ان پر ہما سایہ فگن ہوا۔ ان پر نحوست اور ادبار کا دور دورہ ختم ہونا شروع ہوا۔ خوش بختی اور خوش نصیبی نے اُن کی دست گیری کی۔ ان کے لیے منزلیں سہل ہوتی رہیں۔ فضل ربی نے انہیں 21ویں گریڈ کی منزل بھی دکھائی۔ ان کے سارے سفر میں آرزو اور تمنا متجاوز ہونے کی کوشش کرتی ہے وہ اسے اپنے اختیاری انکسار' شرافت' ثقاہت اور وضعداری وغیرہ کے ظاہری رویوں سے اپنے کنٹرول میں ہونے کا اشارہ دیتے ہیں مگر خواہش کی فطری توسیع پسندی کے آگے وہ بے بس ہیں۔ بیماری بیماری ہے' کبھی ٹوٹکے سے مغلوب ہوجاتی ہے تو کبھی جدید ترین طریق علاج کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کئی ایک نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہیں۔ ہم اس وقت ان کی اس نفسیاتی بیماری کا ذکر کریں گے جس کا تعلق ان کے تحقیقی اور تصنیفی عمل سے ہے۔ ان کے اپنے شخصی اور اپنی تحریروں کے اشاعتی رویے سے جو نفسیاتی علامات سامنے آئی ہیں' ان کا منبع اور سرچشمہ کچھ بیمار قسم کی نرگسیت ہے جو ان کی Obssession بن گئی ہے۔ خود نمائی Exhibitionism ' توسیع پسندی Self Expansionism یا Aggrandisement اور خبط عظمت Maglomania اس خود پرستی (نرگسیت) کی شاخیں ہیں۔ ان سب عناصر کے آمیزے سے ایک دوسری چیز بنی ہے جس کو لیجینڈری شخصیت کا نام دیا جاتا ہے۔ دو تین برسوں سے ان پر ایک لیجینڈری شخصیت بننے کا بھوت سوار ہے۔ اس کا ثبوت وہ کتابیں ہیں جو وہ اپنی اس "لیجینڈری شخصیت" کے تصور کی پروجیکشن اور پروموشن کے لیے مرتب کرکے دوسروں کے نام سے چھپوا رہے ہیں۔ مثلاً

1۔ ''ڈاکٹر معین الرحمٰن۔ شخص اور عکس''

2۔ ''نذرِ معین''

3۔ ''دل کی کتاب''

4۔ ''دیوانِ غالب۔ تجزیہ و تحسین۔''

5۔ ''سوانحی خاکہ۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (مرتب انبساط امین عباسی)''

6۔ متعارفات: ''یہ متعارفہ کیا ہے؟ اگلی سطور دیکھیے:

ڈاکٹر معین الرحمٰن ہر رسالہ کے ہر شمارہ میں بقول ان کے ''تازہ رہنے کے لیے'' چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس مطالب کو پورا کرنے کے لیے وہ کثیر تعداد میں مضامین یا مقالے نہیں لکھ سکتے لہٰذا وہ کسی کی پینتیس چالیس برس پرانی کوئی تحریر پکڑ کر اس پر دس پندرہ سطریں یا ایک صفحہ لکھ کر چھپوا لیتے ہیں۔ مضمون کے عنوان کی قریبی جگہ مصنف کے نام کے ساتھ متعارفہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن چھپ جاتا ہے۔ اُسے دیکھ کر نہال اور خوش ہو جاتے ہیں۔ اس سے تازہ دم ہو کر وہ پھر کسی بہانے ان دو باتوں کا اعادہ کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں کہ مجھے کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولوی عبدالحق پر پی ایچ ڈی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس سے وہ ان دونوں مرحومین کے خلاف اپنے عناد کا اظہار تو کرتے ہی ہیں مگر اس سے ان کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق کے ہمدرد اور مداح حلقوں میں ان دونوں مرحومین کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کی جائے۔ دوسرے وہ اس بات کے اعادہ و تکرار سے کبھی نہیں چوکتے کہ میں جب لائل پور میں پروفیسر اردو کی پوسٹ پر تھا تو میرے زیرِ اثر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی (عربی اسکالر) ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر ریاض مجید اور ڈاکٹر ریاض احمد ریاض (اردو۔ کالرز) نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں۔ ہمیں تو یہ معلوم ہے کہ ڈاکٹر معین صاحب، جناب انور محمود خالد اور جناب ریاض مجید سے کوسوں دور بھاگتے تھے کیونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کی چٹکیاں لیتے تھے مثلاً کسی محفل میں ڈاکٹر معین صاحب غالب کا کوئی آدھا مصرعہ پڑھتے یا ایک آدھ لفظ ادا کر کے اس کے متعلقہ مصرعہ کی طرف اشارہ کرتے تو وہ دونوں شریر استاد جس کر فرمائش کرتے: ڈاکٹر صاحب پورا مصرعہ عطا کیجیے مگر ان کی یہ فرمائش کبھی پوری نہ ہوئی۔

[قارئین کرام راقم کو معذور جانیے، وہ ریٹائرڈ آدمی ہے، فراغت کا وقت ہے، ایک بات کرتا ہے تو اس سے جڑی کئی یادیں قطار میں لگ جاتی ہیں]

اب ہم بار بار ذکر میں آنے والے سوانحی خاکہ کے آخر میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصنیفات و تالیفات کے ذیل میں درج کتابوں کی قارئین کی آسانی کے لیے ''کلاسی فیکیشن'' کرتے ہوئے بتانے کی کوشش کریں گے کہ کون کون سی کتاب ڈاکٹر صاحب کی تصنیف یا تالیف ہے؟ کون سی کتابوں پر اُن کا مصنف

کی جگہ پر اپنا نام چھاپنا جائز نہیں اور کون سی کتب کے وہ مرتب ہیں؟

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی کوئی مرتبہ یا مصنفہ کتاب شائع ہونے سے پہلے ان کا بابائے اردو کے بارے میں سوانحی تحریروں اور تنقیدی آراء پر مبنی جو جائزہ ''قومی زبان'' کراچی کے بابائے اردو نمبر اگست 1964ء میں شائع ہوا تھا وہ 1930ء سے 1961ء کے درمیان مولوی عبدالحق پر چھپنے والے مواد کا تقریباً سوا سو صفحے میں احاطہ اور اعادہ [اخذ و اقتباس] تھا۔ ڈاکٹر معین الرحمن کے مطابق ''اس جائزے کی محدود کتابی اشاعت بھی عمل میں آئی۔ ''بابائے اردو۔ احوال و افکار'' کا پہلا ایڈیشن اب عام طور پر دستیاب نہیں۔''

[بابائے اردو۔ خدمات اور فرمودات

مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' الوقار لاہور 1996ء صفحہ 12]

مؤلف و مرتب نے متعدد اہل علم اور اخبارات و رسائل کو یہ کتاب ارسال کی ہوگی۔ اُس زمانے میں خط کا جواب اور کتاب کی رسید واجب و لازم اور وضعداری کا تقاضا خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس کتاب کو وصول پا کر مولانا عبدالماجد دریابادی (صدق جدید میں) علامہ نیاز فتح پوری (نگار میں) اور مولانا غلام رسول مہر' پروفیسر حمید احمد خاں' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں' ڈاکٹر محمد باقر' پروفیسر محمد طاہر فاروقی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شیوۂ بزرگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کتابچہ میں جمع کیے گئے اقتباسات کے سلسلے میں مؤلف کی محنت کو رسمی طور پر سراہا ہے۔ اس تعریف و تحسین نے معین الرحمٰن کو حوصلہ ضرور بخشا مگر راقم کا خیال ہے کہ سید معین الرحمٰن نے اس تعریف و تحسین سے غلط نتیجہ اخذ کیا اور اپنے آئندہ کاموں میں وہ اقتباسات چننے اور انہیں جوڑنے ہی کو اپنا فن اور کمال سمجھنے لگے۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر نے 16 مارچ 1965ء کو اپنے مکتوب میں لکھا:

''یہ کام مستقل تصنیف سے بدرجہا زیادہ مشقت طلب اور صبر آزما تھا۔ آپ نے اسے نہایت خوش اسلوبی اور جامعیت سے انجام دیا۔ اس کی تحسین کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔۔۔'' (محولہ بالا صفحہ 25)

اس اقتباس میں اگرچہ مولانا مہر نے ''مستقل تصنیف'' کا ذکر زیریں لہجہ میں کیا ہے مگر اس کے باوجود ''مستقل تصنیف'' کی اہمیت اور برتری کا اعتراف اپنی جگہ قائم ہے جس کا احساس اور فہم معین الرحمٰن نہیں کر پائے یا قدرت نے مستقل تصنیف کا ان میں جوہر نہیں رکھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں پیوندکاری کا چسکا پڑ گیا۔ وہ اسی جگہ رک گئے بلکہ کہنا چاہیے وہ اس مقام پر اڑ گئے۔ اس سے وہ خود بھی خراب ہوئے اور اپنے شاگردوں کو بھی خراب کیا۔ بالفاظ دیگر خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کرتے رہے۔ راقم نے ان کی نگرانی میں مکمل ہونے والے ایم اے کے تین چار مقالات دیکھے ہیں' انہوں نے کسی کو ذاتی فکر اور سوچ کی نہج پر نہ ڈالا۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو بھی اقتباس اکٹھے کرنے کی تربیت دی۔ اس پر راقم کہا کرتا ہے کہ انہوں نے ذہنی اور علمی طور پر مفلوج نسلیں پیدا کی ہیں۔ نہ صرف طالب علم بلکہ بعض سینئر لوگوں نے بھی اس

طریق تحقیق کو اختیار کر لیا۔ میں اس طریق تحقیق کو "داوینی تحقیق" کا نام دیا کرتا ہوں۔ بہر حال 1976ء میں بابائے اردو کی پندرہویں برسی کے موقع پر اضافے اور ترمیم کے ساتھ لاہور سے اس کتاب کی دوسری اشاعت عمل میں آئی "بابائے اردو۔ احوال وافکار" کا تیسرا ایڈیشن 1982ء میں لاہور ہی سے شائع ہوا۔"
(محولہ بالا صفحہ 12)

سید معین الرحمن نے جولائی 1964ء میں "عرض مرتب (دیباچہ طبع اول)" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے وضاحت کی کہ مندرجہ ذیل پانچ رسالے مولوی عبدالحق کی زندگی میں ان کے خصوصی حوالے سے شائع ہوئے۔

1۔ نورس۔ حیدرآباد دکن (1930ء)
2۔ رسالہ جوہر۔ دہلی (مارچ 1940ء)
3۔ ماہنامہ الشجاع کراچی (اگست 1959ء)
4۔ سہ ماہی نورس کراچی (جولائی 1960ء)
5۔ سہ ماہی مجلس حیدرآباد دکن (جنوری 1961ء)

مرتب نے لکھا ہے:

"۔۔۔ محولہ بالا پانچ رسائل کو جن کی مجموعی ضخامت نوسو صفحات کے قریب ہوتی ہے یہ امتیاز حاصل ہے کہ مولوی صاحب نے ان کا مطالعہ فرمایا۔ یہ مولوی صاحب کی نظر سے گزرے۔ "بابائے اردو: احوال و افکار" ان پانچ رسائل کے نثری مشمولات ہی کی تلخیص ہے۔" (محولہ بالا صفحہ 16)

اب مستقل تصنیف کا راستہ اختیار کرنا ہے یا پیوند کاری کو اپنی تالیف کی بنیاد بنانا ہے ان دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے یا منتخب کرنے کا کام سید معین الرحمن کا تھا۔ "اقتباس پیوستگی" اور پیوند کاری یا ترتیب وتدوین کو آپ کیسا ہی مشکل یا مشقت طلب کہہ لیں مگر یہ کام اپنی اصل کے اعتبار سے سادہ، سہل اور آسان ہے۔ اپنے مطلوبہ مواد کے حصول کے لیے کتاب، رسالہ یا اخبار پر متعلقہ ضرورت کی تحریر کو نشان زد کر کے فوٹو سٹیٹ مشین کے آپریٹر کو دے دیں۔ اپنے موضوع سے متعلق جمع تراشے یا اوریجنل کتاب/رسالہ کمپوزر کے سپرد کر دیں، پھر پروف خود پڑھ لیں، معاوضہ پر پڑھوا لیں یا کسی جونیئر رفیق کار، شاگرد، بہن، بیٹے اور بیٹی کو دکھا لیں، آپ کی تالیف وتدوین کا کام تکمیل کو پہنچا۔

ہم نے "بابائے اردو۔ احوال وافکار" (1964ء) کی متذکرہ محدود اشاعت کے نسخہ کی تلاش کی ہے۔ پتہ چلا کہ جسے "محدود اشاعت" کہا گیا ہے وہ الگ اور مستقل کتاب نہیں تھی۔ "یہ قومی زبان" کراچی کے بابائے اردو نمبر 16 اگست 1964ء میں سید معین الرحمن کے مرتبہ جائزہ (صفحہ 321-455) کا آف پرنٹ تھا۔ اس کی تائید وتصدیق مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے رسیدی تبصرہ مطبوعہ "صدق جدید" لکھنؤ

21 مئی 1965ء سے ہوتی ہے۔ انہوں نے بھی متذکرہ کتاب کی ضخامت 135 صفحات ہی لکھی ہے (دیکھیے بابائے اردو۔ خدمات اور فرمودات مرتبہ ڈاکٹر معین الرحمٰن۔ الوقار لاہور 1996ء صفحہ 24۔ اگر ''قومی زبان'' کے 455 صفحات میں سے 321 صفحے منہا کیے جائیں تو حاصل 135 صفحے بنتا ہے۔

متذکرہ 135 صفحاتی جائزہ کی محدود کتابی اشاعت' سید معین الرحمٰن کی زندگی کے ایک خاص پہلو کی غماز ہے۔ غور کیجیے ''قومی زبان'' کراچی 1964ء کا محولہ بالا اہم شمارہ جس میں زیر نظر 135 صفحے بھی شامل ہیں' اردو ادب سے متعلق ہر ادارہ' لائبریری اور شخصیت کے پاس گیا ہوگا۔ اصولاً زیر بحث 135 صفحے ہر قاری کے مطالعہ کیے ہوئے یا دیکھے ہوئے ہوں گے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر حوالہ ''ان صفحات'' کی اشاعت ماضی بعید کی بات نہیں' صرف ''محدود کتابی اشاعت'' سے تقریباً سات مہینے پہلے کی بات تھی۔ معین الرحمٰن کی اپنی پلاننگ یا ان کے صلاح کار کے مشورہ کی داد دیجیے۔ ادھر وہ 1964ء میں کراچی سے ایم اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج بہاولنگر میں بطور عارضی لیکچرار جوائن کرتے ہیں۔ ادھر متذکرہ آف پرنٹ کو سرورق وغیرہ لگا کر زعما کی خدمت میں ارسال کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ''نگار'' اور ''صدق جدید'' میں دو تبصرے اور چھ زعماء کے مکتوب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قابل توجہ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ متذکرہ مدیران گرامی اور زعمائے ادب اردو میں سے کسی کو ''محدود کتابی اشاعت'' کا اصلاً ''قومی زبان'' بابائے اردو نمبر میں چھپنا یاد نہیں۔ اس سے سید معین الرحمٰن اس درست نتیجہ پر پہنچے کہ زعما بھی عوام میں سے ہوتے ہیں لہٰذا قدرتی طور پر ان کا حافظہ بھی کمزور ہوتا ہے۔ دوسرے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس قسم کی کارروائی' سرگرمی اور عمل سے لوگوں کی یادداشت میں اپنا نام رجسٹر کرایا جا سکتا ہے اور کسی بڑی شخصیت کے حلقہ اثر کے لوگوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور ان کی ہمدردی اور قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ سید معین الرحمٰن کے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں چھ ماہی تقرر میں پروفیسر حمید احمد خاں کی یادداشت میں متذکرہ کتابچہ کو پروفیسر سید وقار عظیم کی سفارش کے علاوہ کتنا دخل ہے۔ یقیناً اس سفارش میں پروفیسر مرحوم کی یادداشت نے مدد کی ہوگی۔ سید معین الرحمٰن کی اس کامیابی سے ثابت ہے کہ کسی معتبر' صاحب حیثیت اور بااثر شخصیت کے حلقہ ارادت منداں میں شامل ہو کر علمی و روحانی فیوض کے علاوہ کتنی دنیاوی برکات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یہ رویہ اور طرز عمل سید معین الرحمٰن تک محدود اور ان سے مخصوص نہیں ہے۔ درگاہوں' مقبروں' مدرسوں' فقیہوں' مفسروں اور صوفیوں وغیرہ کے اپنے اپنے حلقے ہیں۔ اگر ان حلقوں میں باصفا' اہل دل' صدق و خلوص کے حامل اور مہر و وفا کے حامل جاتے ہیں تو وہاں غرض کے بندے اور ہوس کے غلام بھی پہنچتے ہیں اور آپس میں بھائی بند ہونے کا دم بھرتے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے حلقہ مولوی (عبدالحق) میں شریک ہونے کے بعد اگلی صفوں میں پہنچنے کی کوشش شروع کر دی۔ مولوی صاحب مرحوم کی وفات کے ساتھ ہی آگے پیچھے مختلف رسالوں کے بابائے اردو

نمبروں کا ڈھیر لگ گیا۔ چار پانچ برس میں مولوی عبدالحق اردو نقادوں' محققوں اور سوانح نگاروں کا واحد موضوع رہ گیا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی موج ہوگئی۔ رسالوں میں مواد ابھی سیال حالت ہی میں تھا' ٹھنڈا ہو کر جما نہیں تھا کہ اسے کٹھالی میں ڈھالنا پڑتا۔ موصوف نے عنوانات کے سات سانچوں میں یہ سیال مواد انڈیلا' اس مال کو گتے کی جلد میں بند کیا اور اپنے نام کا ٹھپہ لگا کر بازار میں لے آئے اور اس پراڈکٹ کا نام "نقد عبدالحق" رکھا۔

ہر انسان کی زندگی کے واقعات اور اس کی کڑیوں اور سلسلے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ قدرت نے انسان کی زندگی کی کہانی یا ڈرامے کا پلاٹ بہت سوچ سمجھ کر تیار کیا ہوگا۔ غور کیجیے' ایک واقعہ دوسرے واقعہ کا کیسا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے وسط 1965ء میں "بابائے اردو۔ احوال و افکار" کا آف پرنٹ پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کو ارسال کیا۔ انہوں نے 20 اگست 1965ء کو رسید دی۔ انہیں ایام میں سید وقار عظیم قائم مقام صدر شعبہ اردو نے چھ ماہ کے لیے سید معین الرحمٰن کے تقرر کی تجویز بھجوائی جس پر وہ کام کرنے لگے۔ 1967ء میں پروفیسر حمید احمد خاں نے پروفیسر سید وقار عظیم کی درخواست پر معین الرحمٰن کی ایف سی کالج میں تقرری کے لیے پرنسپل سنکلیئر سے سفارش کی۔

1967ء تک بابائے اردو کے مقدمات اور خطبات (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی) "افکار عبدالحق" (مرتبہ آمنہ صدیقی) کے علاوہ کئی رسالوں کے بابائے اردو نمبر شائع ہو گئے۔ اسی طرح سید معین الرحمٰن کے سامنے عبدالحق پر نیا اور پرانا مطبوعہ مواد اور لوازمہ موجود تھا۔ چنانچہ سید معین الرحمٰن نے چنگی بجاتے ہوئے اس مواد میں سے تقریباً پچیس لوگوں کے مضامین کا انتخاب اگست 1968ء میں "نقد عبدالحق" نام کی کتاب میں شائع کروا دیا (ناشر: نذر سنز' لاہور' کراچی' راولپنڈی) اس کا انتساب "نذر" کے عنوان سے درج ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

بابائے اردو کے رفیق دیرینہ اور اپنے کرم فرما

پروفیسر حمید احمد خاں

کی خدمت اقدس میں'

جن کی ذات گرامی اردو اور اس کے خادموں

کے لیے

باعث صد تقویت و ہزار برکت ہے

اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن طبع 1995ء کا انتساب بھی "نذر" کے عنوان سے بہ الفاظ ذیل کیا گیا ہے:

"بابائے اردو کے رفیق دیرینہ اور اپنے کرم فرما:

پروفیسر حمید احمد خاں کی یاد میں

جن کی ذات گرامی اردو اور اس کے خادموں

کے لیے

باعث صد تقویت و ہزار برکت رہی ہے"

یعنی دوسرے ایڈیشن میں پروفیسر حمید احمد خاں کی خدمت اقدس میں۔۔۔ کے الفاظ کو "پروفیسر حمید احمد خاں کی یاد میں" کے الفاظ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ کسی کی نیک نیتی پر شک نہ کرنا چاہیے مگر شاید یہ بدگمانی درست ہو کہ موصوف کا یہ انتساب پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے غالب پر مضامین کے مسودہ کو اپنا رنگ اور اپنا نام دے کر شائع کرنے اور مدتوں سے دبائے رکھنے پر مرحوم کے لواحقین کے لیے حرف تسلی کے طور پر کیا گیا ہو۔ خاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے جناب سعید احمد خاں نے کتنی سعی و کوشش سے اپنے والد مرحوم و مغفور کا مسودہ واگزار کرا کر "مرقع غالب" کے نام سے شائع کرایا۔ اس سلسلے کی بہت سی حکایتیں سننے میں آئی تھیں۔ بہر حال سید معین الرحمٰن کی زندگی میں اللہ کے فضل سے جتنی کامرانی و شادمانی آئی' وہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی سرپرستی اور سید وقار عظیم کی مہربان کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے موصوف جتنا اور جس طرح اظہار تشکر کریں' وہ کم ہے۔ خاں صاحب مرحوم کی سرپرستی کا اگلا واقعہ مجلس یادگار غالب کے اشاعتی پروگرام (1969ء) میں سید معین الرحمٰن کے نام "اشاریۂ غالب" کی ترتیب و تدوین کی الاٹ منٹ ہے جو غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر شائع ہونے والی مطبوعات میں اچھا کام ہے۔ اس کے بعد موصوف نے کچھ دیر کے لیے مولوی عبدالحق کو فراموش کر دیا اور غالب کی طرف مائل بہ کرم ہو گئے۔ غالب کی طرف رغبت غالب کی شخصیت یا اس کے شعر و ادب میں اس کے نہایت اعلیٰ مرتبہ کی وجہ سے نہیں ہے۔

پچھلے صفحات میں یہ سوال اٹھایا جا چکا ہے کہ سید معین الرحمٰن' وقار عظیم کے زمانہ صدارت شعبہ میں مولوی عبدالحق پر پی ایچ ڈی کے لیے کیوں رجسٹر نہیں ہوئے؟ کیا سندھ یونیورسٹی جامشورو میں ڈاکٹر غلام مصطفی خاں نے بھی مولوی عبدالحق پر کام کی اجازت نہ دی تھی؟ کیا انہوں نے "مجبور محض" کے طور پر "غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے جامشورو میں کام شروع کیا؟ کیا اس موضوع کی رجسٹریشن پنجاب یونیورسٹی میں نہ ہو سکتی تھی؟ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مولوی عبدالحق پر پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ترک ارادہ کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس کا یقینی جواب اور ثبوت تو نہیں ہے مگر ایسے قرائن موجود ہیں جو امر واقعہ کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔

اسی زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔

1۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی جگہ علامہ علاؤ الدین صدیقی وائس چانسلر ہو گئے۔

2۔ شعبہ اردو میں کرسیٔ غالب قائم ہوئی۔ نئے وائس چانسلر نے ''مجلس یادگار غالب'' کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں کے مختصر پیش لفظ (محررہ مارچ 1969ء) کی آخری ڈھائی سطروں میں اعلان کیا:

''یونیورسٹی کے ایک اور فیصلہ کی رو سے شعبہ اردو میں کرسیٔ غالب قائم ہوئی۔ میں مسرت کے ساتھ اعلان کر رہا ہوں کہ اس اسامی پر پروفیسر سید وقار عظیم کا تقرر کیا جا چکا ہے۔''

اسی زمانہ میں ایران سے کسی شاعر اور ادیب کا متخصص قرار دیے جانے یا قرار پانے کا تصور شروع ہوا، جس کے لیے بعد میں شناس اور شناسی کے لاحقہ کا رواج ہوا۔

دنیا بھر میں غالب صدی کی تقریبات منعقد ہوئیں اور غالب پر ریسرچ کے لیے:

☆ یونیورسٹیوں میں غالب چیئرز قائم ہونے لگیں۔

☆ دنیا کی مختلف زبانوں میں کلام غالب کا ترجمہ ہونے لگا۔

☆ موسیقاروں اور گلوکاروں نے بھی کلام غالب کو بنیاد بنا کر کمال فن کا مظاہرہ شروع کیا۔

☆ مشہور مصوروں نے کلام غالب پر مبنی تصاویری نمائشیں منعقد کیں۔

☆ سالانہ کیلنڈروں اور ڈائریوں میں اشعار غالب کی السٹریشن شائع ہوئی۔

یونیورسٹیوں اور اکادمیوں میں غالب کی زندگی اور کاموں پر ریسرچ امتیازی شان کا علمی کام قرار پایا۔ عام مضمون نگار بھی انٹرنیشنل غالب کانفرنسوں اور کانگرسوں میں مدعو ہونے لگے۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے غالب کی اہمیت کے ہشت پہلو پیدا ہو گئے۔ غالب مختلف شعبوں سے متعلق ایک Marketable Commodity بن گیا۔ خصوصاً تعلیمی اداروں اور تعلیمی و ادبی ناشرین اور رسائل و جرائد کے مدیروں کے ہاں ماہرین غالب کی مانگ ہوئی۔

پنجاب یونیورسٹی میں غالب پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم کی متوقع ریٹائرمنٹ کے بعد اس منصب پر کون براجمان ہوتا ہے؟ شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کی سیاست کا ایک تشویش ناک سوال بن گیا۔ ایک ہی Patent امیدوار سامنے نظر آ رہا تھا، وہ ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ سوچا گیا کہ ایک متخصص غالب ہی ان کا راستہ روک سکتا ہے۔ چنانچہ سید معین الرحمٰن کو سندھ یونیورسٹی جامشورو میں خراد پر چڑھا کر ''غالب شناس'' گھڑا گیا۔ مولوی عبدالحق پر پی ایچ ڈی کا پرانا خواب 'خواب و خیال' میں نہ رہا۔ مولوی عبدالحق سے عشق فراموش ہوا۔ اس لیے نہیں کہ معین صاحب کو خدانخواستہ دمشق کا سا قحط درپیش تھا۔ بلکہ اس کے برعکس ترک عشق نے ان کی روزی میں اضافہ کیا اور ان کے روزگار کو فروغ ہوا۔ دو تین برس میں سندھ یونیورسٹی جامشورو سے 1972ء میں معین الرحمٰن غالب پر پی ایچ ڈی ہو گئے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اس ڈگری کی قوت اور چند بزرگوں کی نیک خواہشات کے ساتھ 1973ء کے آخر میں پنجاب پبلک سروس کمیشن میں 19ویں گریڈ میں منتخب ہوئے۔ اس انٹرویو کے ایڈوائزر ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر محمد عثمان نے انہیں

مبارکباد دی۔ 1974ء میں انچارج شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لائل پور ہو گئے۔

راقم اپنی رو میں رواں اور بہاؤ میں جارہا تھا کہ اسے ایک منٹ رکنے کی مہلت ملی تو اسے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر انور محمود خالد کی بات بہت وقیع معلوم ہوئی۔ وہ اسے اکثر روکتے ٹوکتے رہتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ میں اکثر کسی نکتہ کی وضاحت کے خیال میں بہک کر طول کلامی اختیار کرتا ہوں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ معین الرحمٰن کی چند کتابوں کا انتخاب کر لیا جائے جنھیں ان کی مستقل تصانیف سمجھا جاتا ہے یا وہ خود کسی ایسی کتاب کو اپنی تصنیف ہونے کا تاثر دیتے ہیں مگر وہ کتاب مرتبہ کہلانے کا مطالبہ کر رہی ہوتی ہے۔ معین صاحب کی اپنی مرتبہ فہرست تصنیفات و مرتبات یا محترمہ انبساط امین عباسی کے نام سے چھپنے والے سید معین الرحمٰن کے سوانحی خاکہ میں تصنیفات و مرتبات کی فہرست میں ایسی کتابیں بھی ہیں جنھیں مصنفہ کی ذیل میں رکھنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہاں گنتی کی چند کتابوں پر مختصر مگر ضروری تبصرہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے انداز پیشکش سے "غالب اور انقلاب ستاون" ان کی مستقل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بالترتیب 1974، 1976، 1988 (دہلی) اور 1989ء میں چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے ایڈیشن کا دیباچہ "کلمات استقبال" کے عنوان سے مبینہ طور پر مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی نے لکھا تھا۔ ان کے مطابق:

"۔۔۔ زیر نظر کتاب۔۔۔ غالب کا معروضی مطالعہ ہے اور غالب کو ایک بالکل نئے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ معین صاحب نے۔۔۔ انقلاب ستاون کے حوالے سے غالب کے شعری رویے کا احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ 'اس انقلاب نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا جبکہ نثر نگار غالب نے اس انقلاب کے بعد ظہور پایا۔'"

(سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ بار اول 1974ء صفحہ 22)

اس پہلے ایڈیشن میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور حامد علی خاں کی آراء (معین الرحمٰن کے اپنے ہینڈ رائٹنگ میں) فلیپ پر درج ہیں۔ دونوں تحریروں میں معین الرحمٰن صاحب کو "دستنبو" کے سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ پر داد دی گئی ہے، حالانکہ یہ ترجمہ انکا کیا ہوا نہ تھا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے چوتھے ایڈیشن (1989ء) کے "حرفے چند" میں رشید احمد صدیقی، خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، ڈاکٹر سید عابد حسین اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے پہلے ایڈیشن کی وصولی پر رسیدی خطوں کے اقتباس درج کیے ہیں۔ سب نے کم و بیش عبدالرحمان چغتائی کے مطابق تحسین کی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسیدی خط میں جو رائے اظہار پاتی ہے وہ ہمیشہ غیر مشروط طور پر مثبت اور مروت و لحاظ پر مبنی ہوتی ہے۔ کیا اسے پرنٹ میں لانا جائز اور درست ہے؟ بہرحال لکھنے والا اس کی

ذمہ داری سے آزاد نہیں ہے۔ اردو میں مکتوباتی تحسین قلب 'تبصرہ' دیباچہ یا تقریباتی تعارفی مضمون وغیرہ ناقابل اعتبار اور قارئین کے لیے اکثر گمراہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

راقم کے نزدیک زیر نظر کتاب ایک قائم بالذات تصنیف نہیں ہے۔ مجھے حیرانی ہے کہ رشید حسن خاں جیسے مشہور محقق اور بلند پایہ عالم نے غالب انسٹی ٹیوٹ' دہلی کی پبلی کیشنز کمیٹی سے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع کرنے کے فیصلہ کی کیسے تائید کر دی۔ اس وقت میرے پیش نظر اس کتاب کا دوسرا پاکستانی ایڈیشن (1989ء) ہے۔ اصل کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''دستنبو'' کا تعارف ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے 13 صفحہ کے مفصل دیباچہ کے 6 ڈی پارٹ کے آخر میں لکھا ہے:

''۔۔۔کتاب کے پہلے دو ابواب میں ''دستنبو'' کے تفصیلی تعارف کے ساتھ ساتھ پوری کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا جا رہا ہے تاکہ عام قاری بھی اس کتاب کے نہاں خانے میں جھانک کر جان سکے کہ غالب نے اس میں کیا کہا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ''دستنبو'' کا اتنا مفصل جائزہ اور اس کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔''

(محولہ بالا صفحہ 39,38)

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا بحیثیت ایک محقق کے ایک بڑا عیب اور نقص یہ ہے کہ وہ بعض بڑی معمولی مگر ضروری باتوں کو جان بوجھ کر پردۂ اخفا میں رکھتے ہیں جبکہ موقع اور مقام توضیح و تشریح کا ہوتا ہے اور یہ بات فن تحقیق کے بنیادی اصول سے روگردانی کا درجہ رکھتی ہے۔ جہاں تک اس پہلے باب کا تعلق ہے تو اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ باب زیر نظر کتاب کے نقطۂ نظر اور اس کے لیے نہیں لکھا گیا بلکہ ان کی کتاب ''غالب کا علمی سرمایہ'' میں غالب کی کتاب ''دستنبو'' کے جائزے پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اصلاً ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے وہ سترہ اٹھارہ برس بڑے سنوارنے کے بعد 1989ء ہی میں منصۂ شہود پر لائے ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس حقیقت کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔ قارئین اگر یہ سمجھتے ہیں کہ زیر بحث باب کتاب کے سٹرکچر کی بنیاد کے طور پر لکھا گیا ہے تو ہم تعارض کرنے والے کون؟ مگر ایک موضوع پر جس طرح کتاب قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے یہاں اُس کا فقدان ہے۔ اس کتاب کے پہلے دو باب ایک یونٹ ہیں اور آخری دو باب الگ الگ خیال کے مطابق زمانی ترتیب سے خطوط غالب کے اقتباسات کا ڈھیر ہیں۔

دوسرا باب تو سرے سے ''مصنف'' کا اپنا نہیں ہے۔ انہوں نے صرف ایک صفحہ میں ''دستنبو'' کے چار تراجم کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کے بعد اول تا آخر رشید حسن خاں کا ترجمہ شامل کر دیا ہے۔ اگر ایک صفحہ کا پس منظر لکھنے کے بعد وہ اپنا نام جلی حروف میں چھپوا سکتے ہیں تو رشید حسن خاں کو Playdown کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ بلکہ چاہیے تو یہ تھا کہ کتاب کے مندرجات کی فہرست میں ''دستنبو کا اردو ترجمہ'' کے سامنے رشید حسن خاں صاحب کا نام لکھا جاتا۔ اسی طرح ''دوسرے باب کے ٹائٹل'' صفحہ 115 پر ''دستنبو'' نے

جا'' کی وضاحتی سرخی اردو ترجمہ: ''دستنبو'' کے نیچے ''از رشید حسن خاں'' کے الفاظ شائع کرنے چاہئیں تھے۔ مصنف یہ ترجمہ خود کرنے کے اہل نہ تھے۔ کیونکہ انہیں فارسی نہیں آتی مگر دستنبو کے ترجمہ کی اشاعت بھی ضروری تھی۔ کتاب کی ضخامت بھی بڑھانی تھی۔ کتاب کا کوئی ''حجم'' نہ ہوتو کتاب کی شکل کیسے نکلے۔ سید صاحب کو تحقیق میں دیانت' اعتراف اور وسعت قلبی کی اہمیت ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ اس سے معترف اور وسیع القلب آدمی کا نام دبتا نہیں ہے۔ رشید حسن خاں صاحب کے بہت کام ہیں اور بہت نام ہے ویسے بھی عالم اور بے نیاز لوگوں کو ان حقیر باتوں کی پروانہیں ہوتی۔

تیسرا باب ''انقلاب 1857: روداد اور اثرات مابعد'' کے عنوان سے ہے۔ اس عنوان کے نیچے ''ماخذ: خطوط غالب'' چھپا ہے۔ مصنف نے کسی کتاب کے باب کے آغاز کی جو رسم اور روایت ہے اسے یکسر قلم زد اور نظر انداز کر دیا ہے۔ جس طرح کسی موضوع پر مضمون لکھتے ہوئے ابتدائیہ تعارفی یا تمہیدی جملے لکھے جاتے ہیں' اسی طرح کتاب کے ہر نئے باب کا پچھلے باب سے ربط قائم کرنے یا اس باب میں آنے والی بحث یا گفتگو کے لیے قاری کو مستعد اور آمادہ کرنے کے لیے تعارف اور تمہید ایک ناگزیر فنی ضرورت ہے مگر ہمارے فاضل مصنف اس قدر اہم اور بنیادی بات سے بے خبر ہیں۔ یہ باب انور الدولہ شفق کے نام غالب کے خط محررہ 24 اگست 1860ء کے تین سطری اقتباس سے یکا یک شروع ہو جاتا ہے۔ یاد رہے اس باب کا عنوان ''انقلاب 1857ء: روداد اور اثرات مابعد'' ہے۔ کیا ''انقلاب 1857ء'' تین برس بعد 1860ء میں وقوع پذیر ہوا تھا؟ مرتب کو اگر 1860ء سے پہلے کسی خط میں شہادت نہیں مل پائی تھی تو اسے اپنے بیان سے 1857ء تا 1860ء کا خلا پر کرنا چاہیے تھا۔ تعجب خیز یہ امر ہے کہ اگلے صفحات میں آخر تک 1858، 1859، 1860، 1861 اور 1862 کے خطوط کے ملے جلے اقتباس آتے چلے جاتے ہیں۔ آخری اقتباس مجروح کے نام 16 دسمبر 1862ء کے مکتوب سے لیا گیا ہے مگر آغاز کی طرح کوئی اختتامی پیراگراف نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ کسی جگہ بھی دو اقتباسات کو مربوط کرنے کے لیے توضیحی' توجیہی یا تجزیاتی فقرہ نہیں ڈالا گیا۔ خطوط غالب کے اقتباسات چھوٹے بڑے انمل بے جوڑ روڑوں کی طرح ڈھیر میں ڈال دیے گئے ہیں۔ مصنف/ مرتب اقتباسات کی اس جمع بندی کو روداد کا نام دیتے ہیں مگر روداد اور روداد نگاری کے تصور سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ کسی روداد کے بیان میں جو ایک تسلسل اور منطقی نجوت ہوتی ہے' وہ یہاں کلی طور پر مفقود ہے۔

عام کیا کئی خاص لوگ یعنی نقاد اور محقق بھی ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے اس کام کو ان کی اپج اور اختراع اور تخلیقی استعداد قرار دیتے ہیں کہ انہوں نے غالب کے خطوط میں سے انقلاب 1857ء کی تاریخ ابھاری ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ ترقی یافتہ ملکوں اور وہاں کی زبانوں کی تحقیق میں کسی شخصیت کے مکتوبات کو ایک نہایت اہم ماخذ کے طور پر ہمیشہ سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنے کلاسیکی لٹریچر میں بھی اس کی مثالیں مل جائیں گی۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن سے بہت پہلے خود غالب کے مکاتیب کو اس

زاویہ سے سوانح غالب کی تشکیل کے لیے کام میں لایا جاچکا ہے۔ (مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" اس کی نمائندہ مثال ہے) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اسی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے:

"انقلاب 1857ء اور اس کے اثرات مابعد کے بارے میں کلام غالب سے استشہاد کی روایت پٹنہ کے ڈاکٹر سید محمود نے ڈالی۔ انہوں نے 1919ء میں دیوانِ غالب نظامی ایڈیشن پر ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا اور دو برس بعد 1921ء میں اُس پر نظر ثانی کر کے اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے بارہ تیرہ صفحات (33-45) محض اس بحث کے لیے وقف کیے ہیں کہ: "انقلاب ستاون کا غالب کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا۔ وہ سیاسی خیالات سے بے بہرہ نہیں تھے۔ انہیں ملکی و قومی تباہی کا بھرپور احساس تھا۔" اپنے اس موقف کی تائید میں ڈاکٹر سید محمود نے غالب کے تیس سے زیادہ اردو اشعار پیش کیے ہیں۔۔۔ لیکن اس نکتہ آفرینی کی کچھ حقیقت اور وقعت باقی نہیں رہتی جب یہ معلوم ہے کہ غالب کے جن اشعار کو سند میں پیش کیا ہے وہ بیشتر 1857 سے 25 تا 41 سال پہلے کے ہیں جب غالب کی عمر 18 سے 24 سال کی رہی ہوگی۔ ان اشعار میں سے کسی ایک کا بھی انقلاب ستاون سے کچھ تعلق نہیں۔۔۔ (غالب اور انقلاب ستاون الفیصل لاہور 1989ء صفحہ 252-253)

ہمیں اس بحث سے کوئی غرض نہیں کہ کن اشعار کا انقلاب ستاون سے تعلق ہے اور کن کا نہیں۔ ہم نے یہ طویل اقتباس محض یہ دکھانے کے لیے نقل کیا ہے کہ اگر کسی مسئلہ کے باب میں کلام غالب سے استشہاد کیا جا سکتا ہے تو خطوطِ غالب سے کسی اور مسئلہ میں استشہاد کر لینا کوئی انوکھی بات نہیں بخصوصاً اس صورت میں کہ سید معین الرحمٰن سے پہلے "غدر کا حال مرزا غالب کی زبانی"[1] سنایا گیا۔ اور "مرزا غالب کی سرگذشت خود ان کے قلم" سے لکھی گئی[2]۔ "دلی کی کہانی' غالب کی زبانی"[3] "غالب کی کہانی' غالب کی زبانی"[4]

کاش ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے جمع شدہ اقتباسات کا تجزیہ و تحلیل اور دوسری تاریخی کتابوں سے استناد کرتے ہوئے کوئی ایسا سائنٹفک مطالعہ کیا ہوتا جس کی روشنی میں ہم انقلاب 1857ء کی روداد غالب کے حوالے سے دیکھ پاتے۔

1۔ صلائے عام' دہلی' نومبر دسمبر 1926ء
2۔ الف۔ معیار' بانکی پور' مارچ 1936ء
ب۔ فروغِ اردو' لکھنؤ' فروری 1955ء (منقول "اشاریہ غالب" 1969ء از لاہور صفحہ 254
3۔ از اعجاز جاوید' نیا دور اگست 1957ء
4۔ مرتبہ: حفیظ عباسی
ہما اردو ڈائجسٹ دہلی' دسمبر 1968ء صفحہ 128-134
منقول از "اشاریہ غالب" لاہور 1969 صفحہ 246

زیرِ مطالعہ کتاب کے چوتھے باب کا عنوان: ''انقلاب ستاون اور غالب کا شعری رویہ'' ہے۔
ہمیں سب سے پہلے تو عنوان میں 'شعری رویہ' کی Phrase سے اختلاف ہے جو کچھ اس عنوان کے ذیل میں کہا گیا ہے اس کی رو سے یہاں شعری رویہ کی بجائے شعری تجربہ کہنا مناسب تھا۔ اس مضمون پر سید معین الرحمٰن نے بہت داد چاہی ہے اور کچھ کوتاہ نظر لوگوں نے داد دی بھی ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر مناسب مطالعہ 'خطوط غالب' اُس وقت کے ماحول اور فضا کے علم اور بیدار تنقیدی شعور کے بغیر یہ مضمون پڑھا جائے تو اس کا Paradoxical نتیجہ متاثر کرتا ہے۔ خود راقم نے یہ باب اس کتاب کی چوتھی اشاعت 1989ء کے ساتھ ہی پڑھا تھا تو کہا تھا شکر ہے سید معین الرحمٰن نے فہرست سازی/اشاریہ سازی اور ''وادینی تحقیق'' کی بجائے کوئی اپنا تھیسس بنایا ہے۔ مگر جلد ہی اس مضمون کے دلائل اور نتیجہ پر تخلیقی عمل اور اس کے مسائل کی روشنی میں غور کیا تو ڈاکٹر معین کے نتیجہ سے اختلاف کی صورت پیدا ہوئی۔ میں کئی بار ڈاکٹر یوسف حسین خان کا یہ قول دہرا چکا ہوں کہ ''تخلیقی عمل ایک پراسرار اور پیچیدہ عمل ہے'' مختلف فنون میں سرگرم کار فنکاروں کے احوال و آثار نظر میں آئے تو پتہ چلا کہ بہتوں کے ہاں تخلیقی عمل فعال ہوا تو کبھی چشمہ بن کر اور کبھی آتش فشاں کا لاوا بن کر پھوٹ نکلا۔ جب غیب سے تخلیقی تحریک ختم ہوئی تو رواں شفاف پانی برف کے تودوں میں بدل گیا۔ لاوا ٹھنڈا ہو کر جامد پہاڑ بن گیا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن اور شاید کسی دوسرے نے بھی اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ غالب کے خطوط میں محسوسات' جذبات' خیالات المناک سماجی Ironic صورتحال اور ماتمی اداس فضا میں جو شدت ہے وہ شوق اظہار اور نغموں پر اکسانے والی ہے۔ مگر 1857ء کے گردوپیش یہ جذبہ و احساس غالب کے ہاں شعر میں ڈھلنے نہیں پا رہا۔ شاید انقلاب کے شوروغوغا اور ہلچل میں ضروری شعری ارتکاز اور تخلیقی انسپریشن کو برسرِ عمل آنے کی مہلت نہیں مل رہی۔ اس فضا میں طبیعت کا وہ ٹھہراؤ موجود نہیں جو جذبات کی باز آفرینی کا باعث ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں ورڈز ورتھ کے مشہور قول Emotions recollected in tranquility کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔

تخلیقی جوش اور وفور ایسی چیز ہے کہ وہ کسی بند اور رکاوٹ کو قبول نہیں کرتا۔ اقبال کے استاد گرامی ٹامس آرنلڈ اگر علامہ کی شاعری کے لیے حکم امتناعی جاری کر دیتے تو تمام تر احترام اور سعادت مندی کے باوجود اقبال کا تخلیقی اظہار رک نہ پاتا۔ غالب کے جوش اظہار کو کوئی تادیبی کارروائی یا دارو گیر کا خوف مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر وہ کیا کرتا۔ اُس کے صریرِ خامہ میں نوائے سروش کا عمل دخل ختم ہو چکا تھا۔ فطرت کبھی خود لالہ کی حنا بندی کرتی ہے تو کبھی خود لالے کی ہر ایک پتی کو منتشر کر دیتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ غالب کا جذبہ و احساس پختہ ہو کر شعری تجربہ بننے سے پہلے ہی کسی نہ کسی مکتوب میں Release ہو جاتا ہو؟

میں نے فال نکالنے کے طریقے پر کتاب ''غالب کے خطوط'' (جلد اول) مرتبہ خلیق انجم کھولی تو جون 1854ء میں ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں یہ سطور بھی ملیں:

''جواب یہ ہے کہ بھائی! میرا دل اب شعر و سخن و امارت و ریاست و دین و دنیا و مرگ و زیست و کفر و اسلام سے سرد ہو گیا ہے' مگر تمہاری خاطر۔ سو یہ خوب یاد رہے کہ جتنی دیر میں تم ایک نئی غزل لکھ سکتے ہو' مجھ سے اتنے عرصے میں آپ کی ایک غزل کی اصلاح نہیں دی جاتی۔ جلدی نہ کرو اور میرے طور پر رہنے دو۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس قدر تمہاری جو کہ از قسم غزلیات ہیں' وہ سب دیکھ کر بھیج دوں گا۔ نصف دیوان سابق دیکھ چکا ہوں' نصف باقی ہے' مگر اب خدا کے واسطے' جب تک یہ آپ کا کلام نہ پہنچے اور کلام نہ بھیجئے کہ میں گھبرایا جاتا ہوں۔ (صفحہ 264-265)

مندرجہ بالا اقتباس میں زیر نظر بحث کے حوالہ سے ایسے توجہ طلب نکات موجود ہیں کہ مزید گفتگو کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہم قرائن کی روشنی میں یہ کہتے ہیں کہ اس مضمون / باب کا یہ نتیجہ کہ انقلاب ستاون نے ہم سے شاعر غالب چھین لیا اور نثر نگار غالب کا ظہور انقلاب ستاون کے بعد ہوا! نہ صرف یہ کہ درست نہیں ہے بلکہ ان کے ذہن کی پیداوار بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے چوتھے باب کے آخری تین صفحوں میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور شیخ محمد اکرام کا ایک ایک اقتباس دو جگہوں پر درج کیا ہے۔ یہ وہ اقتباس ہیں جو سید معین الرحمٰن کے مضمون کی تحریر کا محرک بنے تھے۔ مثلاً وہ درج ذیل فقرہ کے بعد اقتباس نقل کرتے ہیں:

''ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ:

''ساٹھ برس کی زندگی میں غالب کے ذہن اور زندگی پر یہ آخری اور سب سے بڑی ضرب تھی۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے۔ ان کی توجہ نثر پر رہی۔ فارسی میں کم' اردو میں زیادہ''

''شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ:

''غدر اور غدر کے بعد جو اشعار لکھے گئے۔۔۔ دو تین اردو غزلیں اور چند فارسی قصائد۔۔۔ ان سے ایک علیحدہ دور شاعری ترتیب دینے میں کوئی مصلحت نہیں۔ حقیقتاً یہ زمانہ مرزا غالب کی اردو نثر کا تھا۔''

[منقول از ''غالب اور انقلاب ستاون'' الفیصل لاہور' 1989ء' صفحہ 275]

اب ہم خصوصاً غالب کے خطوط کے متخصص ڈاکٹر خلیق انجم کی متذکرہ مسئلہ اور بحث کے بارے میں شواہد کی روشنی میں بہت سوچی سمجھی رائے نقل کریں گے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے خطوط'' (5 جلدیں) طویل تحقیقی ممارست' تدوین و ترتیب کا تجربہ' محنت اور دقت نظر رکھنے والے سچے اور بے لوث ریسرچ اسکالر

Library

کی حیثیت سے مرتب کیے ہیں۔ ان کا مقدمہ اور تعارف تقریباً 220 صفحات پر مشتمل ہے۔ ان خطوط پر ڈاکٹر خلیق انجم کے حواشی اور توضیحات خود مکتفی ہیں۔ یہ ایک ایسا تحقیقی علمی کارنامہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی کو چاہیے کہ وہ مرتب کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کرے۔ جب ایسے شخص نے غالب کی شاعری اور نثر پر 1857ء کے اثرات کا جائزہ لیا ہوگا تو ایک ''آشنائے فن تجزیہ'' ہو کر رائے قائم کی ہوگی۔ ان کی رائے انہی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

''ان دونوں حضرات (ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور شیخ محمد اکرام) کے بیانات (منقولہ بالا) بالکل درست ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے دلچسپ بیان ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''انقلاب 1857ء نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا۔ جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اس انقلاب کے بعد ہوا۔''

شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری دونوں کے بیانات درست ہیں۔ لیکن ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے 1857ء کے بعد شعر و شاعری ترک کر کے پوری توجہ نثر کی طرف مبذول کر دی۔ یہ صحیح نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اس بیان کی خاصی پذیرائی ہوئی۔

پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ اس بیان میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے سامنے کی حقیقت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ محمد عبدالرحمٰن چغتائی نے اس فقرے کی داد دیتے ہوئے لکھا کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے موقف کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے اور اس کی تائید میں ایسی محکم شہادتیں پیش کی ہیں اور خوش تدبیری سے نتائج نکالے ہیں کہ ان کی بات مانے بغیر چارہ نہیں۔

مجھے اس فقرے کے دونوں حصوں سے اختلاف ہے۔ انقلاب 1857ء نے ہم سے شاعر غالب کو نہیں چھینا' کیوں کہ شاعر غالب 1857ء سے بہت پہلے ہم سے چھینے جا چکے تھے اور نہ ہی نثر نگار غالب کا ظہور 1857ء کے بعد ہوا کیوں کہ یہ ظہور بہت پہلے ہو چکا تھا۔

پہلے ان کی شاعری کو لیجیے۔ یہ تو عام طور پر ہوتا ہے کہ فنکار مدت تک تخلیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور جب اس کا موڈ آتا ہے تو ساری کسر نکل جاتی ہے لیکن غالب کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ ذاتی زندگی کی ناکامی نے ان کے دل و دماغ کو اس بری طرح متاثر کیا تھا کہ ان کے تخلیقی سوتے بہت پہلے خشک ہونے لگے تھے۔

غالب کی زندگی کا سب سے پہلا ہولناک واقعہ پنشن کے معاملے میں ان کی ناکامی تھی۔ غالب بہت امیدوں سے کلکتے گئے تھے۔ کلکتے کے سفر اور وہاں کے قیام نے انہیں بہت مقروض کر دیا تھا۔ جب جنوری 1831ء میں اُن کے خلاف فیصلہ ہوا تو اُن کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اور بہ قول غالب ''قرض الگ' رسوائی الگ اور مستقبل کا خوف الگ'' اس واقعے سے غالب ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ انہیں شعر گوئی سے دلچسپی نہیں

رہی۔ بہ قول مولانا امتیاز علی خاں عرشی:

''اور پھر جنوری 1831ء میں مقدمہ ان کے خلاف فیصل ہوا تو مستقبل کے خوفناک تصور نے ان کے دل و دماغ کو سخت اذیت پہنچائی اور پہلی بار اُن کی طبیعت نے فکرِ شعر و سخن سے تنفر کا اظہار کیا۔ اب وہ غزل کہتے تھے مگر دوستوں کے اصرار پر اور قصائد بھی لکھتے تھے مگر مالی پریشانیوں کے بھوت کو دفع کرنے کے لیے۔''

مولوی سراج الدین احمد سے غالب کی ملاقات کلکتے میں ہوئی تھی اور کلکتے سے واپسی پر اُن سے خط و کتابت ہوئی۔ مولوی صاحب کے نام غالب کا ایک خط فارسی خط ہے جس پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مولانا عرشی کا خیال ہے کہ یہ 1835ء یا 1836ء میں لکھا گیا۔ غالب لکھتے ہیں:

''تازہ غزل بھیجنے کے بارے میں آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ مگر دل کی خونابہ فشانی اور فکر کی جگر کاوی کے بغیر غزل موزوں نہیں ہوتی اگر مجھے غم روزگار سے تھوڑی سی بھی مہلت ملتی تو پھر آپ میری فکر کے جوہر دیکھتے۔ بہ ہر حال اس افسردگی کے باوجود جس وقت بھی کوئی شعر زبان پر آجائے گا اُسے سپردِ قلم کر کے خدمت گرامی میں بھیج دوں گا۔'' (فارسی سے ترجمہ)

1840ء میں جب رام پور کے نواب محمد سعید خاں تخت نشین ہوئے تو ان کے بھائی نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ نے اس موقع کے لیے غالب سے قصیدے کی فرمائش کی۔ غالب اُن کے نام ایک فارسی خط میں جواب دیتے ہیں:

''لیکن کیا کروں کہ شعر گوئی کا تعلق دل سے ہے۔ جب دل ہی ٹھکانے نہ ہو تو زبانِ سخن کہاں سے ملے؟ آپ جیسے دیدہ ور صاحب دل سے بڑھ کر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہوگا کہ شعر کہنے کے لیے دل کا یکسو ہونا ضروری ہے۔ یقین کیجیے کہ یہ دلِ صد پارہ جو میرے سینے میں ہے میرا دشمن بن گیا ہے اور اب سخن گستری اور معنی آفرینی کا اہل نہیں رہا۔۔۔ امید ہے کہ اس گزارش کے بعد آپ نظم و نثر کے لحاظ سے مجھے مردہ تصور فرمائیں گے اور دعائے خیر میں یاد رکھیں گے۔'' (فارسی سے ترجمہ)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب سخن گستری اور معنی آفرینی سے متنفر ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ ذہنی اعتبار سے شعر گوئی کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب قصیدہ ضرور لکھتے۔ کیوں کہ اس کا پورا امکان تھا کہ غالب کو اس قصیدے پر انعام ملتا۔ یہ خیال رکھیے کہ اس وقت غالب کی عمر تقریباً 43 سال ہے اور ابھی 1857ء کے ناکام انقلاب میں سترہ سال باقی ہیں۔

غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن 1841ء میں شائع ہوا تھا اس میں اشعار کی تعداد 1095 تھی۔ دوسرا ایڈیشن 1847ء میں شائع ہوا تو یہ تعداد 1111 ہوگئی گویا چھ سال میں کم و بیش سولہ شعر کا اضافہ ہوا۔ تیسرا ایڈیشن 1861ء میں شائع ہوا تو اس میں اشعار کی تعداد 1796 ہوگئی اور چوتھا اور غالب کی زندگی کا آخری ایڈیشن 1862ء میں شائع ہوا تو یہ تعداد 1802 ہوگئی۔ ممکن ہے کہ غالب نے زیادہ تعداد میں

شعر کہے ہوں لیکن انتخاب انہیں اشعار کا کیا۔ پھر بھی منتخب اشعار کی تعداد سے ان اشعار کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے' جو اُس زمانے میں کہے ہوں گے۔

ان اعداد و شمار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 1841ء اور 1847ء کے درمیان غالب نے شعر گوئی تقریباً ترک کر دی تھی۔ اس لیے 1847ء کے ایڈیشن میں صرف سولہ اشعار کا اضافہ ہوا۔ 1850ء میں غالب قلعے میں ملازم ہو گئے تو بادشاہ اور شہزادوں کے اصرار پر انہیں مجبوراً اردو میں غزلیں کہنی پڑیں۔

غالب اپنی اس مجبوری کا ذکر انور الدولہ نواب سعد الدین شفق کے نام اس طرح کرتے ہیں:

"ہر چند ایک مدت سے طبیعت اردو شعر کہنے پر مائل نہیں لیکن کبھی کبھی بادشاہ کی رضاجوئی اور ملکۂ عالیہ کے فرمان کی تعمیل میں اردو میں بھی شعر کہنے پڑتے ہیں۔" (پنج آہنگ' اردو ترجمہ' ص 150)

3 جنوری 1855ء کے ایک خط میں سید بدر الدین احمد المعروف بہ فقیر کو لکھتے ہیں:

"آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں' سو وہ یا تمہارے دوست حسین مرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس۔"

گویا قلعے کی ملازمت کے دوران غالب نے اردو میں کچھ غزلیں کہیں اور فارسی میں شاید ایک بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان اردو کا جب تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں 685 اور چوتھے ایڈیشن میں مزید چھ شعر کا اضافہ ہوا۔ اگر پہلے ایڈیشن کے سنہ طباعت یعنی 1841ء سے آخری ایڈیشن کے سنہ طباعت 1862ء تک کہے گئے اردو اشعار کی سالانہ اوسط نکالی جائے تو غالب نے اکیس سال میں کم و بیش 727 اشعار یعنی اوسطاً چونتیس شعر فی سال کہے۔ اگر غالب قلعے میں ملازم نہ ہوئے ہوتے اور بادشاہ کی مجبوری نہ ہوتی تو ان اشعار کی تعداد غالباً اور بھی کم ہوتی۔

اس کا مطلب ہے کہ پنشن کے مقدمے میں ناکامی' مالی دشواری' 1841ء اور پھر 1847ء میں جوئے کے الزام میں گرفتاری جیسے واقعات نے غالب کی تخلیقی قوت 1857ء سے بہت پہلے ہی سلب کر لی تھی اور غدر نے نہیں بلکہ غالب کی زندگی کے اندوہناک واقعات نے شاعر غالب کو 1857ء سے بہت پہلے ہم سے چھین لیا تھا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بیان کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ: "نثر نگار غالب کا ظہور 1857ء کے بعد ہوا۔" اگر معین الرحمٰن صاحب کہتے کہ غالب نے 1857ء کے بعد اردو نثر پر زیادہ زور دیا' تو یہ بات زیادہ قابل اعتراض نہیں تھی۔ کیونکہ غالب کا 1857ء سے پہلے فارسی اور اردو نثری سرمایہ اتنا کم نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

غالب نے 1857ء سے قبل منشی نبی بخش حقیر' مرزا ہرگوپال تفتہ' نواب یوسف مرزا' بدر الدین احمد

کاشف اور منشی عبداللطیف وغیرہ کے نام اردو میں جو خط لکھے ہیں' اُن میں سے سوئے قریب دستیاب ہوئے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ ان خطوط کا 9/1 حصہ 1857ء سے قبل لکھا گیا تھا۔اس کا امکان زیادہ ہے کہ 1857ء سے قبل کے غالب کے خطوط زیادہ تعداد میں ضائع ہوئے ہوں۔غرض اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نثر نگار غالب کا ظہور 1857ء سے بہت پہلے ہو چکا تھا' ہاں 1857ء کے بعد غالب نے اردو نثر اور خاص طور پر اردو مکتوب نگاری پر زیادہ توجہ دی۔" [غالب کے خطوط' جلد اول' مرتبہ خلیق انجم' غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی' 1993ء' صفحات 111-116]

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے "غالب اور انقلاب ستاون" پر ایک پروگرام پاکستان ٹیلی وژن پر لاہور' کراچی' پنڈی' پشاور' کوئٹہ سے جولائی' اگست' ستمبر 1975ء میں ٹیلی کاسٹ کرایا۔اس پروگرام میں مبصر: پروفیسر وقار عظیم' میزبان: کشور ناہید اور مہمان: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن تھے۔اس گفتگو کے انجام کے قریب کشور ناہید نے غالب کے "شعری رویوں" کی طرف اشارہ کیا۔سید معین الرحمٰن نے یہاں اپنا وہی موقف دہرایا۔ اس پر کشور ناہید نے کہا: "ابھی وقار بھائی سے پوچھے لیتے ہیں۔" اس پر پروفیسر وقار عظیم مرحوم نے اپنے مدہم' مبہم اور ملائم انداز میں کہا: "بات یہ ہے۔ بلکہ میں چاہتا بھی تھا کہ اس پر معین صاحب سے تھوڑی سی بات کروں کہ اس بیان کی صداقت' بڑی حد تک تو درست ہے کہ 1857ء کے واقعات نے شعر اور غالب کو ایک دوسرے سے دور کر لیا' لیکن یہ بات تو "غدر" سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔حقیقت میں ("غدر" میں اپنے جذبے کا اظہار نہیں کر رہا ہوں' عام لفظ ہے انقلاب کے لیے) جب کلکتے میں ان کی تھوڑی سی رسوائی ہوئی' ان کی فارسی دانی پر اعتراض ہوئے اور گئے تھے اپنے مقدمے کے سلسلے میں (اس کا فیصلہ ان کے حق میں نہیں ہوا) اس کے بعد کے فوراً بعد کے جو بعض خط ہیں' اس میں ایک خط میں خاص طور پر غالب نے لکھا ہے "اب قافیہ تخن تنجی تنگ است" تو اسی وقت سے غالب' میری رائے ہے کہ شعر کی طرف مائل نہیں تھے اور اس کے بعد سے بچ جاتے ہیں' جب کوئی ان سے شعر گوئی کا تقاضا کرتا ہے قصیدے کے لیے کہتا ہے۔" [دل کی کتاب' از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔مرتبہ: انبساط امین عباسی' الوقار پبلی کیشنز لاہور' 2000ء' صفحہ 30]

ان آراء کے پیش نظر یہ کہنے میں کوئی وقت یا حجاب محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تنقیدی بصیرت ناقص اور خام ہے۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مزعومہ مستقل کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" کو حتمی طور پر ان کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کا آغاز و انجام ہی منطقی نہیں ہے۔ یہ کتاب وحدت فکر و نظر سے عاری ہے۔اس کتاب کی تصنیفی کاوش میں ارتقا کی کیفیت نہیں ہے۔ کتاب کے چاروں ابواب ایک دوسرے میں سمائے اور سموئے ہوئے نہیں ہیں۔ایک باب رشید حسن خاں کے دستنبو کے مستعار ترجمہ پر محیط ہے۔دوسرا باب سید معین الرحمٰن نے اپنی زیر طباعت کتاب "غالب کا علمی سرمایہ" میں

سے نکال کر ڈالا ہوا ہے۔ آخری دونوں باب لخت لخت ہیں۔ آخر میں شامل ضمیمے تصنیف سے الگ اور زائد تحریریں ہیں۔ظاہر ہے وہ سید معین الرحمٰن کی تصنیف نہیں ہیں۔اس کتاب (ایڈیشن 1989ء) کی پشت پر اردو کے ایک معتبر نقاد اور ایک نامور محقق کی سفارشی آراء کے ساتھ مصنف کی وضاحت چھپی ہے: ملاحظہ کیجیے:

''ڈاکٹر معین الرحمٰن کی کتاب ''غالب اور انقلاب ستاون'' نے متاثر کیا۔اس کتاب سے معین صاحب کی بالغ نظری' تنقیدی صلاحیت اور تحقیقی استعداد سب کا اندازہ ہوا۔انہوں نے غالب کی تقریباً ہر تحریر کو کھنگال لیا ہے۔'' آل احمد سرور

''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن متعارف شخصیت کے مالک ہیں۔اُن کی کتاب ''غالب اور انقلاب ستاون'' کے بارے میں بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اپنے انداز کی یہ منفرد کتاب' اپنے مشتملات کی افادیت کے پیش نظر مختلف اعتبارات سے غالب فہمی کی روایت کی توسیع میں معاون ثابت ہوگی۔'' رشید حسن خاں

''غالب پر میری پہلی کتاب 1969ء میں پنجاب یونیورسٹی نے شائع کی تھی' اُسی زمانے میں ''غالب اور انقلاب ستاون'' کے موضوع سے میری دلچسپی بڑھی اور بالآخر زیر نظر کتاب کی صورت میں (یہ) منتج ہوئی۔بصورت موجودہ' کتاب کی یہ چوتھی اشاعت' میری بیس برس کی تلاش و جستجو اور ریاضت و محنت کا حاصل ہے۔میرا عاجزانہ احساس یہ ہے کہ کتاب کی یہ آخری ترقی یافتہ صورت ہے اور اب تادیر اس پر کوئی اضافہ شاید (مجھ سے) ممکن نہ ہو سکے۔'' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

راقم کو بہ صد احترام پہلی دو آراء سے سخت اختلاف ہے۔مشہور شاعر حبیب جالب نے جنرل محمد ایوب خاں صدر پاکستان' کے ملکی دستور کو اپنی ایک مشہور نظم میں مسترد کرتے ہوئے کہا تھا:

میں نہیں مانتا ایسے دستور کو' صبح بے نور کو میں نہیں مانتا

اسی رو میں' میں کہتا ہوں:

میں کسی ایسے سرور و رشید کو نہیں مانتا جس کی تنقیدی رائے بے نور ہو۔

میں معین الرحمٰن کی وضاحت پر یہ کہوں گا کہ اگر وہ اضافہ کر بھی سکتے ہوں تو ہرگز نہ کریں البتہ انہیں کتاب میں تخفیف و ترمیم ضرور کر لینی چاہیے۔یہ بات ہر تعارف کنندہ' نقاد اور مبصر کو کبھی اور کسی وقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اُسے وضعداری' تعلق داری اور مروت نباہنے کی کوشش میں' پوری طرح جانچے سوچے سمجھے بغیر محض لفاظی پر مبنی بے معنی اور بے مغز رائے کبھی نہ لکھنی چاہیے۔انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی غلط اور گمراہ کن رائے سے نوجوان قارئین کا اپنی ذات پر سے ایمان اور اپنی ذہانت پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

سوانحی خاکہ میں سیکشن ''تصنیفات و تالیفات' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن'' کی ذیلی فہرست ''بسلسلہ غالب'' میں شمار نمبر 4' متداول دیوانِ غالب (اردو) 1976ء ہے۔متداول دیوان غالب کا ان کی

تصنیفات وتالیفات سے کیا واسطہ ہے؟ غالباً انہوں نے دیوان غالب پر چند حواشی لکھے ہیں مگر یہ بات موصوف یا مرتب سوانحی خاکہ کو یہ حق فراہم نہیں کرتی کہ "متداول دیوان غالب" کو ڈاکٹر صاحب کی مستقل تصنیف کے طور پر فہرست میں شامل کیا جائے۔

تحقیق غالب' اشاعت: 1981، 1998 اس کتاب کو بھی مستقل تصنیف کہا گیا ہے۔ مصنف نے اس تاثر کو گہرا کرنے اور اس پر Pride کا اظہار کرنے میں کافی کوشش کی ہے۔ مگر یہ ایک مستقل تصنیف نہیں ہے۔ البتہ دس متفرق مقالات کا مجموعہ ضرور ہے۔ متفرق مقالات پر مبنی مجموعہ کی اشاعت کی ایک پرانی روایت ہے۔ جب متفرق تحریروں پر مبنی کوئی نیا مجموعہ شائع کیا جاتا ہے تو کوشش یہ کی جاتی ہے کہ مشمولہ تحریریں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ قبل ازیں کسی مجموعہ میں شامل نہ رہی ہوں اور یہی نئے مجموعے کا جواز بھی ہوتا ہے۔ کسی نئے مجموعہ کی تدوین کے لیے یہ شرط تحریری تو نہیں البتہ Unwritten اور Understood ہے کہ ہر مضمون کے خاتمہ پر فٹ نوٹ میں یا آخری مضمون کے بعد "فہرست مآخذ" میں قاری کی یادآوری یا معلومات کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھا جاتا تھا کہ فلاں فلاں مضمون کس کتاب یا رسالہ سے لے کر یہاں نقل کیا گیا ہے۔ مگر ڈاکٹر سید معین الرحمن ان حقائق کو چھپانے اور دبانے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک اور ٹائٹل ان کے نام ریکارڈ ہو جائے۔

"تحقیق غالب" 1981ء میں بھی مستقل نئی تصنیف نہیں تھی۔ مثلاً کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" کا چوتھا باب بعنوان "انقلاب ستاون اور غالب کا شعری رویہ" "تحقیق غالب" میں شمار نمبر 2 اور نسبتاً نئے عنوان "غالب کا شعری رویہ۔ 1857ء کے پس منظر میں" کے تحت شامل ہے۔ "گل رعنا" کے تین نسخوں پر تین مضمون دراصل "غالب کا علمی سرمایہ" 1989ء کا حصہ تھے مگر اس سے پہلے یہ مضامین مختلف رسائل میں [بقول مصنف 1969-1979 میں لکھے گئے رہے۔ فے چند، زیر نظر کتاب صفحہ 11] شائع ہوئے۔ بالکل یہی کیفیت "قطعہ غالب بسلسلہ قضیہ برہان" اور "عود ہندی" "غالب کے خطوں کا پہلا مجموعہ" کی ہے۔ آخری مضمون "غالب کی معدوم تصنیفات" سات حصوں میں منقسم ہے۔ پہلی معدوم تصنیف "میخانۂ آرزو سر انجام" میں کسی قدر اضافہ ہے ورنہ باقی چھ معدوم تصانیف پر نوٹ "اشاریہ غالب" 1969ء ہی سے اٹھائے گئے ہیں۔

"تحقیق غالب" کے آخری صفحات (صفحہ 283 تا 288) پر اردو کے ایک درجن محققین' ناقدین اور مبصرین کی مبالغہ آمیز آراء شائع کی گئی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک آدمی بھی اس حقیقت سے باخبر نہیں کہ یہ کتاب مصنف کی دوسری تصنیفات وتالیفات سے کھینچے گئے مضامین پر مشتمل ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی عالم کو اپنی رائے کے اظہار سے پہلے محض ورق گردانی کرنے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ جب صورت یہ ہو تو لوگ "بلا خوف گرفت" کتابیں چھاپ یا چھپوا کر اردو زبان وادب کی خدمت کے نام پر انعام اور ایوارڈ

حاصل کیوں نہ کریں۔

غالب کا علمی سرمایہ: (1989ء اور 2000ء) اس کتاب پر کسی بحث کے حوالے سے گزشتہ صفحات میں بھی کچھ لکھا گیا تھا۔ جمیل الدین عالی لکھتے ہیں:

''غالب کا علمی سرمایہ'' پی ایچ ڈی کے مقالے کا ایک ایسا ایڈیشن ہے جس میں ڈاکٹر سید معین الرحمن نے بڑی تلاش وجستجو کے بعد غالب کی تمام شائع شدہ اور غیر مطبوعہ یہاں تک کہ معدوم نظم ونثر کا ایک سائنٹفک جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی ماخذات اور مرتبات غالب پر سیر حاصل علمی بحث کی ہے۔'' غالب کا علمی سرمایہ'' غالبیات سے شغف رکھنے والوں کے لیے ایک ناگزیر کتاب ہے۔۔۔'' صفحہ 20

مصنف اپنے پیش لفظ محررہ 15 فروری 1989ء میں لکھتے ہیں:

یہ مقالہ جس پر 1972ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو نے پی ایچ ڈی کی سند فضیلت عطا کی تھی' تازہ مصادر سے استفادے کے بعد اب کسی قدر ترمیم اور تخفیف کے ساتھ غالب کی ایک سو بیسویں برسی کے موقع پر شائع ہو رہا ہے یہ غالب کی اُن تصانیف کے جائزے پر مبنی ہے جو غالب کی زندگی میں یا مابعد منصۂ شہود پر آئیں۔'' (صفحہ 23)

۔۔۔ مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مناسب حدوں میں جملہ تصانیف غالب کا تحقیقی تعارف پیش کر دیا جائے۔ اس تعارف میں یہ حد ملحوظ رہی ہے کہ صرف بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا جائے اور صرف وہیں ثانوی مآخذ سے کام لیا جائے جہاں اساسی اور اصلی مآخذ خاموش یا مخدوش ہوں۔۔۔'' صفحہ (24)

ڈاکٹر معین الرحمن کے ایک بیان [جو انہوں نے کئی بار اور کئی جگہ دیا] کے مطابق:

''غالبیات کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ'' میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ یہ کام میں نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نگرانی میں مکمل کیا اور اس پر مجھے جامعہ سندھ سے ڈگری ملی۔ غالب پر پاکستان میں پی ایچ ڈی کی سطح پر قبول کیا جانے والا یہ پہلا تحقیقی کام ہے۔''

دیکھیے [''دل کی کتاب'' از ڈاکٹر سید معین الرحمن' مرتبہ انبساط امین عباسی' الوقار لاہور' 2000ء' صفحہ 102]

ڈاکٹر معین الرحمن کے مقالہ پی ایچ ڈی کے متذکرہ دونوں موضوعات اور عنوانات میں ایک بین تفاوت اور فرق ہے' اس سے ڈاکٹر معین صاحب کے مقالہ پی ایچ ڈی کے بارے میں افواہیں اور شکوک و شبہات کان رکھنے والا آدمی متاثر ہو کر سوچتا ہے کہ اس مسئلے کی پس پردہ حقیقت کیا ہے؟ بات یوں سمجھ آئی ہے کہ 1970ء میں کسی جگہ کسی سطح پر فیصلہ ہوا کہ شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی میں غالب پروفیسر کی آسامی کے لیے آئندہ اسٹرٹیجی کے پیش نظر سید معین الرحمن کو غالب پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دلائی جائے۔ 1966ء میں شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر عبادت بریلوی انگلستان سے واپسی پر صدر شعبہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے

ایم اے کی تدریس کے لیے لیکچرار کے لیے فرسٹ ڈویژن کی شرط ملحوظ رکھتے ہوئے سید معین الرحمن کے عارضی تقرر میں توسیع کے لیے سفارش نہ کی۔ لہٰذا اُن سے پی ایچ ڈی کی رجسٹریشن کے لیے کہنا عبث خیال کیا گیا۔ پی ایچ ڈی کے لیے "غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کا موضوع سندھ یونیورسٹی میں رجسٹر کروالیا گیا۔ مگر موضوع بہت پھیلا ہوا تھا۔ ڈگری بھی عمومی معینہ مدت سے پہلے درکار تھی۔ لہٰذا ایسی صورت سامنے آئی ہو گی کہ "اشاریہ غالب" میں تصانیف غالب سے متعلق حصہ میں ممکنہ حد تک اضافہ کر کے رجسٹرڈ عنوان کے تحت ہی پیش کر دیا جائے۔ دو اڑھائی سال کے اندر ڈگری حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ جس کام پر ڈگری عطا ہوئی وہ شاید اس قابل نہ ہوگا کہ اسے شائع کرایا جائے۔ 1969ء کے بعد غالب کے بارے میں اکتشافی تحریروں، تحقیقات اور تنقیدات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ اس مواد کو مناسب جدول کے اندر تصانیف غالب کے مطالعہ میں سمونا ہی بہت مشکل تھا۔ چنانچہ 1969ء تا 1988ء تک سید معین الرحمن کے سترہ اٹھارہ برس اس کام میں صرف ہو گئے۔ اصل موضوع "غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کی طرف ایک قدم نہ اٹھایا جا سکا۔ چنانچہ "اشاریہ غالب" کی ترقی یافتہ صورت کو "غالب کا علمی سرمایہ" کے نام سے 1989ء میں پیش کر دیا گیا اور اسے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ قرار دے دیا گیا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ دوسرے ریسرچ اسکالرز اور اس شعبہ میں کام کرنے والے نو وارد اوریجنل مقالہ دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ اس کے دیکھنے سے نہ صرف معیار کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں بلکہ اگر وہ اس کام کو اطمینان بخش پاتے ہیں تو اسے اپنے لیے مثال اور نمونہ بناتے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمن کی سلسلہ غالب کی فہرست میں اگلی کتاب "تحقیق اور تلاش" ہے۔ موصوف کے سوانحی خاکہ کی اطلاع کے مطابق اس کے چار ایڈیشن بمطابق 1990، 1991، 1992، 1995 شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کی اس رفتارِ اشاعت سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ شاید ڈاکٹر معین کی یہ کوئی مستقل تصنیف ہے۔ میں گذشتہ صفحات میں بھی مستقل تصنیف کا ذکر کرتا رہا ہوں۔ میرے ہاں یہ اعادہ اور تکرار کیوں ہے؟ غالباً میرے نہاں خانۂ دل میں کہیں یہ خیال چھپا بیٹھا ہے کہ مستقل تصنیف سے جو میری مراد ہے وہ پوری طرح واضح نہیں اور مطلب "فی بطن شاعر" رہ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں میرا مسئلہ اُس وقت شروع ہوتا ہے جب میں ایسی غیر مدون تحریروں کے مجموعے کو مستقل اور باقاعدہ کتاب کے زمرے میں رکھتا ہوں جو رسائل و جرائد کی حد تک تو مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ ہیں مگر اس سے پہلے کسی کتاب اور مجموعہ کا حصہ نہیں بنی ہیں۔ البتہ وہ تحریریں جو حال ہی میں یا قریبی زمانے میں شائع ہونے والے مجموعہ میں شامل ہیں ان کی کسی نئے مجموعہ میں شمولیت پر کوئی قانونی پابندی تو نہیں ہوتی مگر ان کا شمول اخلاقی اور ذوقی حوالے سے پسندیدہ نہیں ہوتا۔ خصوصاً جب یہ بات ظاہر اور واضح ہو کہ اس ترتیب و تدوین سے مصنف/مؤلف کا مقصد صرف تصنیفات میں ایک نئے ٹائٹل کے حوالے سے عددی اور "شماری" اضافہ ہے۔ غیر مدون، مختلف یا

متفرق تحریروں کو یک جا پیش کیے جانے کی کئی صورتیں دیکھی گئی ہیں۔ اس کی عام صورتوں کو Collected Essays یا Selected Essays کے نام دیے جاتے ہیں۔ اکثر مرتبہ مجموعوں میں مختلف مصنفین کی مستقل مطبوعہ کتابوں کے ابواب یا چھوٹے بڑے ٹکڑے بھی مستعار لیے ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنی کسی تقریب، موقع، مناسبت اور ضرورت کے تحت انتخاب کیے ہوتے ہیں۔ غیر مدون یا منتخب تحریروں پر مبنی مجموعوں میں ایک بات کا خصوصی طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہماری مراد مرتب کے اظہار تشکر اور متعلقہ مضامین کے مآخذ کے اعلان سے ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن اس تقاضے سے یقینی طور پر واقف اور آگاہ ہیں مگر اس سے کہیں زیادہ اہتمام وہ اس بات کا کرتے ہیں کہ ان کے اپنے ہی مضامین سے بذات خود مرتب کیے گئے مجموعوں میں، ان کے مقالہ پی ایچ ڈی ''غالب کا علمی سرمایہ'' کے شامل ابواب یا ذیلی ابواب کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ مثلاً ''تحقیق غالب'' اور ''تحقیق اور تلاش'' نامی کتابوں میں متذکرہ مقالہ پی ایچ ڈی سے لے کر شامل کیے گئے ابواب کا کسی طریقہ یا قرینہ سے ذکر نہیں۔ ہماری فہم سے یہ بات بالا ہے کہ وہ احساس جرم کے سے انداز کے ساتھ یہ حقائق پوشیدہ رکھنے کے لیے تکلیف وہ کوشش کیوں کرتے ہیں؟

بہر حال ایک طرف دیکھیے: دو مضامین کتاب ''تحقیق و تلاش'' کے پہلے حصے بعنوان ''غالبیات'' میں شمار نمبر 5 کے مطابق بعنوان ''قادر نامہ غالب اور اس کی ابتدائی اشاعتیں'' اور دوسرا مضمون شمار نمبر 6 کے تحت بعنوان ''دیوان غالب کی معاصر اشاعتیں''، دونوں مضمون اس کتاب کے صفحہ 79 تا 146 پر محیط ہیں۔ [''تحقیق و تلاش''، مقبول اکیڈمی لاہور، 1990ء]

دوسری طرف یہی دونوں مضمون بہ تفصیل ذیل ''غالب کا علمی سرمایہ'' 2000ء میں موجود ہیں۔

1۔ قادر نامہ غالب: ''غالب کا علمی سرمایہ'' کے صفحات 121 تا 132 پر پھیلا ہوا ہے۔

یہاں نہایت اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ کتاب ''تحقیق و تلاش'' میں محولہ مضمون کے اختتام کے بعد (صفحہ 90) پر [تحریر فروری 1984ء] کے الفاظ اور ہندسے بریکٹ میں لکھے ہوئے ہیں۔

2۔ دیوان غالب کی معاصر اشاعتیں: ''غالب کا علمی سرمایہ'' کے صفحات 27-82 پر پھیلا ہوا ہے۔

یہاں بھی یہ بات قابل توجہ ہے کہ کتاب ''تحقیق و تلاش'' میں زیر حوالہ مضمون (۔۔۔ معاصر اشاعتیں) کے آخری صفحہ 146 کے خاتمہ پر [تحریر: نومبر 1981ء] درج ہے۔

مندرجہ بالا زیر بحث دونوں مضمونوں (مشمولہ تلاش و تحقیق) کے آخر پر انہیں تحریر کیے جانے کی تاریخوں کا اندراج بہت بڑے انکشاف کا باعث ہوا ہے۔ امید ہے ان سے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی اصلیت اور حقیقت جاننے میں بڑی مدد ملے گی۔

جناب جمیل الدین عالی نے ''غالب کا علمی سرمایہ'' پر اپنے حرفے چند میں لکھا ہے:

''غالب کے بارے میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی یہ انتہائی مفید اشاعت ''غالب کا علمی سرمایہ

''اس شکل میں پہلی بار پیش کی جا رہی ہے۔۔۔

لطیفہ دیکھیے کہ غالب صدی تک منائی گئی مگر غالب کے جملہ سرمائے پر (اسے مصنف نے علمی سرمائے کا نام خود دیا ہے) اس ایک مقالے کے سوا نہ کوئی دوسری بڑی کوشش کی گئی نہ اشاعت سامنے آئی۔ 1972ء میں فاضل مصنف ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو جامعہ سندھ سے اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ آج 1988ء تک کسی اور فاضل محقق نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ (صفحہ 17)

غالب کی ولادت (1797ء) پر ایک سو پچھتر برس گزرتے ہیں کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے اس مقالے کو (1972ء میں) جامعہ سندھ پی ایچ ڈی دیتی ہے جو اب انجمن کے زیر اہتمام چھپ رہا ہے۔ (صفحہ 18)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ملک کے پہلے ریسرچ اسکالر ہیں جنہوں نے غالب پر ڈاکٹریٹ کا اعزاز اور امتیاز حاصل کیا۔ غالب کے ایک سو پچھترویں جشن ولادت (1972ء) پر سندھ یونیورسٹی نے سید معین الرحمٰن صاحب کو اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی سند فضیلت عطا کی تھی اور اب ہم اسے بڑے شوق اور فخر کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔''

1988ء دستخط جمیل الدین عالی

معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

[''غالب کا علمی سرمایہ'' الوقار لاہور 2000ء ص 19]

نوٹ: جمیل الدین عالی کے اعلان کے مطابق یہ مقالہ انجمن ترقی اردو کراچی سے بوجوہ نہ چھپ سکا۔ مگر 1989ء میں یونیورسل بکس اردو بازار لاہور نے شائع کر دیا۔ اس کے بعد الوقار لاہور نے 2000ء میں دوسرا زیر نظر ایڈیشن شائع کیا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ میں 15 فروری 1989ء کو لکھا:

''یہ مقالہ جس پر 1972ء میں سندھ یونیورسٹی جام شورو نے پی ایچ ڈی کی سند فضیلت عطا کی تھی' تازہ مصادر سے استفادے کے بعد اب کسی قدر ترمیم اور تخفیف کے ساتھ' غالب کی ایک سو بیسویں برسی کے موقع پر شائع ہو رہا ہے۔ یہ غالب کی اُن تصانیف کے جائزے پر مبنی ہے جو غالب کی زندگی میں یا مابعد منصۂ شہود پر آئیں'' (طبع دوم صفحہ 23)

ڈاکٹر معین الرحمٰن 15 فروری 2000ء کو '' کچھ اس ایڈیشن کے بارے میں'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

''یہ مقالہ غالب کے ایک سو پچھترویں جشن ولادت (1972ء) کے موقع پر سندھ یونیورسٹی سے

پی ایچ ڈی کے لیے منظور ہوا۔۔۔اور غالب کی ایک سو بیسویں (1989ء) برسی کی مناسبت سے فروری 1989ء میں پہلی بار' ترمیم اور اضافے کے ساتھ شائع ہوا۔۔۔'' (صفحہ 15)

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے عالی صاحب کے حرفے چند کی آخری سطور کے نیچے ایک باکس (چوکھٹے) میں کتاب کی اشاعت میں تاخیر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کتاب کی اشاعت کئی برس پہلے' انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے قبول کی تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ کتابت وغیرہ کا سارا کام' میں اپنی نگرانی میں کراؤں گا۔ اس میں بوجوہ اندازے سے بہت زیادہ تاخیر ہوگئی اور جب کام' کسی نہ کسی طرح اتمام کو پہنچا تو میں چاہتا یہ تھا کہ کتاب' غالب کی ایک سو بیسویں برسی کی مناسبت سے 1989ء میں ضرور شائع ہو جائے۔ اس میں کچھ دفتری اور تکنیکی امور اور مسائل مزاحم ہوئے۔ کاش میں اپنے حصے کا کام بروقت پورا کرنے پر قادر ہو پاتا! بہر حال یہ اعتراف ضروری ہے کہ اصحاب انجمن کی عنایات اور اپنی بدتوفیقی' ہر دو کی کوئی حد نہیں: ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے! کتاب انجمن سے شائع ہوتی تو بجائے خود میرے لیے بڑی عزت اور مسرت کی بات ہوتی۔'' دستخط (ڈاکٹر معین الرحمٰن تاریخ ندارد) [صفحہ 19]

ڈاکٹر معین کی یہ وضاحت بھی مبہم ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی اس وضاحت میں اگر یہ بتا دیتے کہ ان کی نگرانی میں کتابت کب تمام ہوئی تو تاخیر کی مدت کا کچھ اندازہ ہو جاتا۔ تاہم عالی صاحب کے حرفے چند (1988ء) سے طے ہو جاتا ہے کہ کتاب وسط 1987ء اور اوائل 1988ء کے درمیان مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد عالی صاحب نے حرفے چند لکھ دیا۔ مگر انجمن کی کتاب کی اشاعت میں مجبوریوں کی بناء پر ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کوئی وقت ضائع نہیں کیا اور اپنی خواہش کے مطابق ''غالب کا علمی سرمایہ'' 1989ء کے اوائل میں یونیورسل بکس لاہور سے چھپوالی۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے باکس میں مقتبسہ بیان سے متبادر ہوتا ہے کہ انجمن نے ''کتاب کی اشاعت کئی برس پہلے قبول کر لی تھی'' مگر کتابت کا کام معین صاحب کے لیے کرنا باقی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ انجمن نے کئی برس پہلے اشاعت کے لیے صرف آمادگی ظاہر کی تھی بشرطیکہ معین الرحمٰن صاحب کتابت مکمل کروا لیں۔'' مگر بوجوہ ڈاکٹر معین کے اندازے سے بہت زیادہ تاخیر ہوگئی۔ کتنی تاخیر؟ پانچ سال؟ مطلب یہ ہوا کہ 1983ء میں انجمن سے مقالہ کی اشاعت کی شرائط طے پا گئی تھیں۔ لہٰذا 1983ء اور 1988ء کے درمیان ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کتابت مکمل کروائی۔ 1972 تا 1983ء کس چیز کا انتظار تھا۔ اول تو ڈاکٹر معین الرحمٰن جیسا کتاب کی اشاعت کے لیے ہمہ وقت مستعد آدمی' جس کے پاس کتابت کا خصوصی انتظام ہو' جسے 1972ء تک سات کتابوں کی اشاعت کا تجربہ بھی حاصل ہو' منظوری کے بعد اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ فوری طور پر چھپوانے سے قاصر کیوں رہا؟ ان کے مزاج' پی ایچ ڈی کرنے کے چاؤ' اس مقالہ کی اشاعت کے شوق و

جذبہ اور پبلک سروس کمیشن میں سینئر پروفیسر کے لیے انٹرویو میں مطبوعہ مقالے کی ضرورت وغیرہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ مطبوعہ مقالہ لے کر انٹرویو میں پیش ہوتے؟

ضمناً ایک خفی اور خفیف عذر پیش کیا گیا ہے؟ کہ پی ایچ ڈی کے مقالہ ''غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ'' میں ''ترمیم' تخفیف اور اضافہ'' کرنا پڑا۔ بہت اچھا کیا' مقالہ کی اشاعت سے پہلے یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ کیا اس کام میں گیارہ برس (1972 تا 1983ء) صرف ہو گئے؟

اس کام میں رموز اوقاف پر توجہ دینی ہوتی ہے۔ الفاظ کے درست ہجا اور املاء کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ کوئی لفظ بدلنا ہوتا ہے۔ کوئی فقرہ کاٹنا ہوتا ہے۔ کوئی نیا فقرہ ڈالنا ہوتا ہے۔ فقروں کے باہمی ربط کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ گویا فقروں کی در و بست ٹھیک کرنا ہوتی ہے۔ کسی حوالہ کی تصدیق کرنا ہوتی ہے۔ کوئی پیرا خارج کرنا ہوتا ہے۔ کہیں فٹ نوٹ کی نوک پلک درست کرنا ہوتی ہے۔ کسی مقام پر تاریخ کی تصحیح کرنی پڑ جاتی ہے۔ آخر میں ببلیوگرافی پر نظر ثانی کرنا ہوتی ہے۔ انتساب کے لیے نام اور الفاظ تلاش کرنے ہوتے ہیں اور پیش لفظ میں ایک آدھ پیرا گراف کا اضافہ کرتے ہوئے اپنے نگران وغیرہ کا شکریہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ بظاہر جتنے کام گنوائے گئے ہیں بڑے دقت طلب اور وقت طلب دکھائی دیتے ہیں لیکن پورے مقالہ کی صرف ایک ریڈنگ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اردو ادب میں مختلف موضوعات' شخصیات اور ان کے احوال و آثار اور افکار پر کتابوں کی شدید کمی رہی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے میں ہند و پاک کی یونیورسٹیوں میں ایم اے' ایم فل اور پی ایچ ڈی وغیرہ کے لیے قلم بند کیے گئے مقالات کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جبکہ ان مقالات میں سے ایک بڑی تعداد کی بوجوہ اشاعت کی نوبت نہیں آئی یا تین طرح کے مقالات نہیں چھپتے۔

1۔ وہ مقالات نہیں چھپتے جنہیں ممتحنین نے ناقابل اشاعت قرار دے دیا ہو اور رپورٹ میں لکھ دیا ہو کہ انہیں شائع نہ کیا جائے۔ [تعلقات کی بناء پر ''اشاعت سے پہلے نظر ثانی'' کر لی جائے جیسے نرم اور ملائم الفاظ لکھ دیے جاتے ہیں] اگر ہمدردانہ خیال سے ڈگری دے دی جائے۔

2۔ جن سے لکھنے والا خود مطمئن نہ ہو (اپنے مقالے کو معیاری خیال نہ کرتا ہو) اور خوفزدہ ہو کہ اس کی اشاعت پر ناقابل برداشت تنقید ہوگی۔

3۔ وہ مقالے نہیں چھپتے جن کے مقالہ نگاروں میں initiative نہیں ہوتا۔ سستی' تساہل اور تغافل جن کا شعار ہے۔ اُن کی اشاعتی اداروں تک رسائی نہیں ہوتی۔ طباعتی مراحل سے گزرنے کی سکت اور تجربہ نہیں رکھتے۔ اُن کے مقالات کا ذکر آخر آخر فہارس میں رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کو 1964ء سے اپنی مرتبہ کتابوں کے چھپوانے کا تجربہ ہے بلکہ انہوں نے تو پہلی بار ایک آف پرنٹ کو ٹائٹل وغیرہ لگوا کر زعما کی خدمت میں بطور کتاب ارسال کیا اور اُن پر بہت اچھے الفاظ

میں تائیدی آرا پائیں۔ موصوف 1964ء سے 1989ء تک دس بارہ کتابیں چھپوا چکے تھے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے والے اُن کمیاب لوگوں میں سے ہیں جنھیں رجسٹریشن کے اڑھائی تین برسوں میں ڈگری ارزانی ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے متعدد بار اپنے انٹرویوز میں کہا اور کئی بار لکھا کہ اُن کا پی ایچ ڈی کے لیے موضوع ''غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ'' پر 1972ء میں ڈگری عطا ہوئی لیکن اس عنوان سے یہ مقالہ آج تک شائع نہیں ہوا اور نہ اس کا کوئی جزو دیکھنے سننے میں آیا ہے۔ کیا یہ نامکمل یا غیر معیاری مقالہ تھا۔ بعد ازاں کسی وضاحت کے بغیر ''غالب کا علمی سرمایہ'' کو ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ کہا گیا ہے مگر ایک شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے باب اول کا پہلا جزو [صفحہ 27 تا 82] نومبر 1981ء کی تحریر ہے۔ (دیکھیے تحقیق اور تلاش صفحہ 146) ''غالب کا علمی سرمایہ'' کے صفحات 121 تا 131 فروری 1984ء کی تحریر ثابت ہوتے ہیں۔ (تحقیق اور تلاش صفحہ 90) ان دونوں تاریخوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ 1972ء میں ڈگری پانے والے مقالہ کی 1981ء میں تسوید شروع ہوئی اور اسے مرحلہ وار لکھنا شروع کیا گیا۔ یہ کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جس مقالہ کے ابتدائی 55 صفحات نومبر 1981ء میں قلم بند ہوئے ہوں۔ اُس پر 1972ء میں ڈگری دی جا چکی تھی۔

مجموعہ مضامین ''تحقیق و تلاش'' کا پہلا مضمون: ''غالب کے اصلاحی دیوان کا ایک اہم قلمی نسخہ'' [ص 21 تا 46] جولائی، دسمبر 1988ء کی تحریر [دیکھیے صفحہ نمبر 46] بتایا گیا ہے جو 1998ء میں دیوان غالب نسخہ خواجہ [ص 15-38] کے مقدمہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے مگر اسے 15 فروری 1997ء کی تحریر [دیکھیے نسخہ خواجہ صفحہ 40] بتایا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے اگلے دو حصوں بعنوان ادبیات اور نادرات کے تحت شامل مضامین اس سے پہلے کن کتابوں کا حصہ تھے اس کی تفصیل بیان ہو سکتی ہے مگر اسے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ ایک دوسری بات نظر انداز کرنے کے باوجود فراموش نہیں ہو رہی۔ وہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا مضمون کے عنوان میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ''اصلاحی'' کا لفظ جن معنوں میں استعمال کیا ہے وہ خلاف لغت ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے 1998ء میں دیوان غالب نسخہ خواجہ شائع کراتے وقت اس کا ٹائٹل چار بار دہرایا ہے۔ چوتھی بار نام کتاب اور تعارف کنندہ کے درمیان جلی حروف میں مندرجہ ذیل اندراج ہے:

''غالب کے اصلاحی دیوان کا یہ اہم قلمی نسخہ مبنی بر اصلاحات غالب'' (صفحہ 13)

یہاں پھر لفظ اصلاحی کتاب ''تحقیق و تلاش'' کے پہلے مضمون کے عنوان میں لفظ اصلاحی ہی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اصلاحی کے ان معنوں کی لغات تائید نہیں کرتے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے غالب کی تصنیف ''لطائف غیبی'' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ اب معلوم نہیں موصوف نے غالب کو اردو خواں دنیا سے متعارف کرایا ہے یا ان کی کتاب ''لطائف غیبی''

گویا اپنے آپ کو غالباً غالب کو ہی تعارف کنندہ نے متعارف کرانے کا یہ اعزاز بخشا ہے۔ آخر بیسویں صدی کے آخری سال تھے۔ غالب کو محتاج تعارف ہونا ہی چاہیے تھا۔

ٹائٹل کا عنوان: لطائف غیبی

از مرزا اسد اللہ خان غالب

ترتیب تعارف مقدمہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن

ڈاکٹر صاحب نے جو صفحات 1972ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دلانے والے امتحانی مقالہ ''غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' کے لیے نہیں لکھے تھے وہ 1989ء میں ان کے تحقیقی مقالہ ''غالب کا علمی سرمایہ'' (صفحہ 393-435) میں غالب کی ایک تصنیف ''لطائف غیبی'' کا توضیحی بیان بن کر جگہ پا گئے۔ ڈاکٹر معین الرحمن کے جی میں جانے کیا آئی کہ انہیں 1995ء میں وہاں سے اٹھایا اور مقدمہ کا نام دے کر الوقار لاہور کے دامن سے ایک اور کتاب وابستہ کر دی۔

کتاب ''غالب کا علمی سرمایہ'' کو منقسم اور منتشر کرنے کے عمل سے واضح ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن کی ترجیحات تحقیق اور فروغ ادب نہیں بلکہ کاروبار اور شہرت ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمن بطور مصنف' مولف اور مرتب کتابوں کی عددی کثرت سے ایک ابوالہول کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ وہ جانتے ہیں کہ ابوالہول تاریخی عمل کے ایک مرحلے کا پیدا کردہ ہے۔ دراصل ''غالب کا علمی سرمایہ'' پر ڈاکٹر معین الرحمن کے غیر فطری انحصار کی ایک وجہ ہے۔ جب ایک نئی کتاب سامنے لانے کی خواہش انہیں بے چین کرتی ہے تو ان کے پاس کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ پھر وہ پرانا مال ٹٹولتے ہیں۔ انہیں وہاں بھی کچھ نہیں ملتا تو دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی تین کبھی چار ٹکڑے ''غالب کا علمی سرمایہ'' سے نکالتے ہیں۔ دو تین مضمون کسی پرانے مجموعے سے کھینچتے ہیں۔ دو تین مولوی عبدالحق کے مضمون نادرات کے عنوان سے ڈالتے ہیں۔ مجموعے کا ایک نام رکھتے ہیں۔ اس میں اپنا cv درج کرتے ہیں۔ حرفے چند کے صفحات لکھ لیتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اپنی شان اور تعریف میں بڑے ادیبوں کی آراء مرتب کرتے ہیں۔ پھر اس نئے (بباطن پرانے) مجموعے پر جلب تحسین کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں۔ لوگ مروت اور لحاظ کرتے ہوئے کتاب کی رسید میں دو چار رسمی جملے لکھ دیتے ہیں جنہیں موصوف جا و بے جا مشتہر کرتے رہتے ہیں۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں کئی بار اور کئی مواقع پر زیر نظر بحث اور تبصرہ کے زیر نظر انداز کو ترک کرنا چاہا یا اسے کوئی نیا موڑ دے کر کسی نئے نکتہ پر بات کرنا چاہی۔ مگر 'سوانحی خاکہ' میں موصوف کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست بسلسلہ غالب میں اگلی کتاب اٹھاتے ہیں تو پھر وہی موضوع سامنے آ جاتا ہے۔

بہر حال اگلی کتاب کا نام ''نقوش غالب'' مصنفہ ڈاکٹر سید معین الرحمن اور ناشر الوقار لاہور ہے۔ مختلف لوگوں کے اس مجموعہ مضامین کے لیے اس کتاب کا نام ''نقوش غالب'' موزوں نہیں ہے۔ اس کا

نام ''معین الرحمٰن نامہ'' ہی مناسب تھا جس کا وہ اپنے آپ کو مصنف ظاہر کرتے ہیں کیونکہ کتاب کے ''چسپاں سرورق'' اور جلد کے اندر ٹائٹل پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن چھاپا گیا ہے۔ البتہ دیباچہ یا پیش لفظ کی جگہ ''عرضِ مرتب'' (کچھ اس کتاب کے بارے میں) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن لکھا ہے۔ سوا پانچ صفحات کے اس ''عرضِ مرتب'' کے آخر میں ''معین الرحمٰن کے دستخط ہیں۔ اگر موصوف اس کتاب پر اپنی جگہ کسی عزیز یا شاگرد کا نام دے دیتے تو تھوڑا سا پردہ رہ جاتا اور یہ پیش لفظ صورت کی طرح خودنمائی اور خودستائی کی بہترین مثال اور نمونہ نہ بن جاتا۔ ان کے نام کا بول بالا نہ ہو' ڈاکٹر صاحب کسی حال میں بھی اس بات کا Risk نہیں لیتے۔ ان کا ''وسیع تجربہ اور مشاہدہ'' انہیں بتاتا ہے کہ کتاب تو کوئی وقت کا مارا' ہی کھولتا ہے۔ ٹائٹل تو کوئی چاہے نہ چاہے اُسے دیکھنا ہی ہوتا ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ ''نقشِ قدم'' اکیس ذیلی عنوانات کے تحت چھوٹے چھوٹے مضامین پر مشتمل ہے۔ ایک طالبہ حنا سرور کا نام دوبار آیا ہے کیونکہ انکی دو تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ اس طرح بیس لکھنے والوں میں سے دو پروفیسر اور دو پیشہ ور ادبی صحافی ہیں۔ سولہ طالبات کے یہ مضمون ان کے امتحانی مقالات کے اجزا ہیں۔ پروفیسر عارف ثاقب کا مضمون ''شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور میں مطالعۂ غالب'' کا محرک اور مقصد ڈاکٹر معین الرحمٰن کی پروجیکشن ہے۔ پروفیسر ثاقب نے ''1987ء سے 1994ء تک غالب شناسوں پر گیارہ مقالات کے موضوعات' مقالہ نگاروں کے نام' نگران مقالہ کا نام' (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)' مقالوں کی ضخامت بشمول کتابیات اور مقالات کے مندرجات: (ابواب' ذیلی ابواب) درج کردیئے ہیں۔ ان مقالات کی نگرانی فردِ واحد سے منسوب ہے۔ کسی ملک اور قوم کے تمدنی و معاشرتی اداروں میں ''ون مین شو'' کا مظاہرہ ان اداروں اور ان کے متعلقہ ملک و قوم کی ترقی' عروج اور فروغ کے لیے کس قدر مثبت یا منفی کردار ادا کرتا ہے: ایک فکر انگیز اور جاذبِ توجہ پہلو ہے۔

اس مضمون کو آخر میں پروفیسر عارف ثاقب نے سمیٹتے ہوئے لکھا ہے:

''گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو میں مطالعۂ غالب کے حوالے سے لکھے جانے والے تحقیقی مقالوں کے اس تعارفی جائزے میں دو باتیں قدرِ مشترک کے طور پر دکھائی دیتی ہیں:

۱۔ یہ تمام مقالے ان اشخاص پر تحریر کیے گئے ہیں جو غالب شناسی کے حوالے سے ایک معتبر حوالہ ہیں۔۔۔

(جو اشخاص غالب ناشناسی کے حوالے سے ایک معتبر حوالہ ہیں' ان کو درخورِ اعتنا کیوں نہیں سمجھا گیا)

ان تمام مقالوں میں ''غالب شناسی کی روایت'' کے حوالے سے خصوصی باب شامل کیے گئے ہیں۔۔۔ (ایک مہربان استاد مشہور ہونے کے لیے شاگردوں کی سہولت اور آسانی کا بھی سامان کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شاگرد غالب شناسی کی روایت 1860ء تا 1950ء قلم بند کرے گا۔ دوسرا 1860ء تا 1959ء علیٰ ہذا)

2۔ مندرجہ بالا مقالوں میں دوسری مشترک قدر یہ ہے کہ ان تمام مقالوں کی رہنمائی کا فریضہ اس دور کے ایک اہم غالب شناس (ڈاکٹر معین الرحمٰن) نے انجام دیا ہے۔۔۔

3۔ پروفیسر عارف ثاقب نے ان مقالوں میں ایک تیسری مشترک خصوصیت کا ذکر نہیں کیا جو یہ ہے کہ "ایک ہی نگران" نے سب مقالوں کے لیے عرق ریزی اور جانفشانی سے ایک فریم تیار کر لیا تھا۔

ان سطور سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور میں کیسا مثالی ٹیم ورک ہوتا رہا۔
اس کتاب کا حصہ 2 بعنوان "نقش وفا" "وجہ تسلی نہ ہوا"
ذیلی عنوان "نگارشات و متعارفات: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن" بہ تفصیل ذیل چھ تحریروں پر مشتمل ہے۔

1۔ غالب کے تین نئے خطوط
2۔ غالب کے پانچ خطوں کا مستند متن
3۔ "جاگیر غالب" میں غالب کی قلمی تحریریں اور مہریں
4۔ اقبال پر غالب کا اثر اور ان کی گرفت
5۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی
6۔ غالب کے فارسی کلام پر ناقدانہ نظر

ان میں بہ استثنٰی شمار نمبر 3 تمام تحریریں مجلّہ "تحقیق نامہ" گورنمنٹ کالج لاہور کے شمارہ 3-4 (1994-1995ء) میں چھپی تھیں "تحقیق نامہ" کے علاوہ ان تحریروں کی اشاعت کی کیفیت یہ ہے:

<u>"جاگیر غالب" میں غالب کی قلمی تحریریں اور مہریں:</u>

1۔ "نقوش غالب" 1995ء
2۔ "تحقیق اور تلاش" 1990ء (تحریر دسمبر 1987ء)

<u>اقبال پر غالب کا اثر اور ان کی گرفت</u>

1۔ "نقوش غالب" 1995ء
2۔ "تحقیق نامہ" 3-4 (1994-1995ء)
3۔ "جہانِ اقبال" 1977ء

راقم نے ایک روز ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مرتبہ کتاب (انہوں نے اپنا نام بطور مصنف ہی لکھا ہے) "جہان اقبال" کے "حسن تصنیف" (کہ آدھی کتاب اشاریوں اور آدھی کتاب کم و بیش رشید احمد صدیقی، سید وقار عظیم، رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی تحریروں پر مبنی ہے) کی بات کرتے کرتے زیر نظر مضمون "اقبال پر غالب کا اثر اور ان کی گرفت" کا حوالہ دیا تو انہوں نے پلٹ کر

پوچھا۔ اقبال نے غالب پر کیا کیا اعتراض کیے ہیں: میں نے وضاحت کی کہ اس مضمون میں اقبال کے خطوط اور ملفوظات وغیرہ سے انتیس (29) اقتباس جمع کرنے کے بعد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایک پیرا کے ذریعہ بحث کو سمیٹ کر خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ گرفت کے جس معنی کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ ادھر میری نظر نہیں گئی تھی۔

میں اس مضمون کو''داویئی تحقیق'' کی روشنی میں دیکھتا رہا اور اردو تحقیق کے عمومی معیار کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔ جب ڈاکٹر معین الرحمٰن کے منصب' مرتبے اور عمر کا آدمی اقتباسات کی جمع بندی کو اپنا شاہکار تحقیق قرار دے اور اس پر اظہار تفاخر کرتے ہوئے اسے مکرر چھپوائے تو ایم اے' ایم فل کے طلباء و طالبات بھی وہی کچھ کریں گے جو وہ عام طور پر ان کی زیر نگرانی کرتے رہے ہیں۔ اب باقی دو تحریروں کی اشاعتی کیفیت ملاحظہ فرمائیے:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی

1۔ ''نقوش غالب'':1995ء

2۔ ''تحقیق نامہ'' شمارہ3-4' (1994-1995)

3۔ ''تحقیق نامہ' غالب''1998ء

4۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری' بطور غالب شناس'' (مقالہ ایم اے) مقالہ نگار سیدہ افصح وحید' نگران ڈاکٹر معین الرحمٰن' شائع کردہ' ابلاغ پبلشرز لاہور ۲۰۰۲ء۔

اس کتاب کے آخر میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا محولہ بالا مضمون بطور ضمیمہ دوم شامل کیا گیا ہے۔ نگران موصوف ضمیمہ کی فنی اہمیت اور اصطلاحی مفہوم سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ اپنا مضمون بطور ضمیمہ شامل کرنے کی اجازت نہ دیتے۔

''غالب کے فارسی کلام پر ناقدانہ نظر''

1۔ ''نقوش غالب''1995ء

2۔ ''تحقیق نامہ'' شمارہ3-4' (1994-1995)

زیر تبصرہ کتاب (''نقوشِ غالب'') کا تیسرا حصہ ''نقش محبت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مرتبہ و مؤلفہ پانچ کتابوں' پرتھوی چندر' رشید احمد صدیقی اور غالب کی تین کتابوں پر تحقیق نامہ اور متعلقہ کتابوں میں دہرائی گئی لوگوں کی آراء ایک سیکشن میں مکرر شائع کر دی گئی ہیں۔ اس سیکشن میں ایک قابل توجہ تحریر جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں سے منسوب کی گئی ہے۔ اس تحریر کا عنوان جلی حروف میں ''غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن طبع ہوا ہے۔ اپنے انداز سے یہ ایک تبصرہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے 1972ء میں اس خاکسار کی نگرانی میں غالبیات پر تحقیقی کام کر کے سندھ یونیورسٹی سے ڈگری لی۔ غالب پر اُن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ آٹھ ابواب اور کوئی آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ابواب اور مباحث بڑے اہم ہیں۔''

[اس کے بعد آٹھ ابواب کے عنوانات درج کیے گئے ہیں]

اس تبصرہ نما تحریر سے کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ زیر تبصرہ کتاب [''غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ''] کا ناشر کون ہے۔ اس کا سنہ اشاعت کیا ہے؟ ہماری معلومات کے مطابق اس نام سے کتاب اب تک نہیں چھپی۔ 1972ء کے بعد 1989ء میں چھپنے والی کتاب ''غالب کا علمی سرمایہ'' کو اشارۃً اس مقالہ کا اضافہ اور تخفیف شدہ ایڈیشن کہا جاتا ہے۔ ہم اپنے تجربہ کی روشنی میں قیاس سے کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی یہ تحریر ان کے مقالے پر امتحانی رپورٹ ہو سکتی ہے؟ بہر صورت یہ تحریر اس سیکشن میں شائع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے تعریفی و توصیفی کلمات ضرور ریکارڈ پر لانا چاہتے تھے تو کوئی متعارفہ یا فٹ نوٹ لکھ کر وضاحت کر سکتے تھے۔ معلوم نہیں وہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے سلسلے میں مغالطہ انگیز ابہام کیوں روا رکھتے ہیں۔

اس سیکشن کی آخری شق کا عنوان'' کچھ اپنے اور غالب کے بارے میں'' ایک مکالمہ 1994ء'' ہے۔ اس عنوان کے سامنے ڈاکٹر اجمل نیازی اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے اسماء ہیں۔ مصنف (دراصل مرتب) کتاب نے یہ مکالمہ اس سیکشن کا حصہ کیوں بنایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف ایڈیٹنگ میں کمزور ہیں۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ سب سے پہلے ڈاکٹر اجمل نیازی نے یہ مکالمہ روزنامہ'' پاکستان'' لاہور کے ادبی صفحہ پر شائع کیا تھا۔ ازاں بعد شاید ''تحقیق نامہ'' میں دہرایا گیا۔ زیر نظر کتاب ''نقوش غالب'' (1995ء) کے بعد ''دل کی کتاب'' (2000ء) از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' مرتبہ انبساط امین عباسی' میں اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔

یاد رہے جب یہ مکالمہ/ انٹرویو روزنامہ ''پاکستان'' میں شائع ہوا تھا تو یہ بات بہت مشہور ہوئی تھی کہ یہ انٹرویو مکمل طور پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے خود لکھا ہے یعنی سوال ان کا' جواب ان کا اور قلم بھی ان کا تھا۔ بعض اوقات خون کا ایک دھبہ ناقابل تردید ثبوت بن جاتا ہے۔ اس کا ناقابل شکست داخلی ثبوت اس انٹرویو کے عنوان میں موجود ہے' دیکھیے: '' کچھ اپنے اور غالب کے بارے میں۔'' بتایئے یہاں لفظ'' اپنے'' کس کا قائم مقام ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا یا ڈاکٹر اجمل نیازی کا۔

گزشتہ صفحات میں مختلف مباحث سے یہ بات واضح ہو ہی چکی ہوگی کہ اس کتاب کی تحریریں

''تحقیق نامہ'' (ریسرچ جرنل شعبہ اردو) میں چھپ چکی ہیں۔ ان کی طباعت کا میٹریل زیر نظر کتاب کی تیاری میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اس کتاب (نقوشِ غالب) کا پہلا اور تیسرا حصہ مختلف لوگوں کی تحریروں پر مبنی ہے۔ یہ دونوں حصے 283 صفحات پر مشتمل ہیں۔ پوری کتاب کی ضخامت 389 صفحات ہے۔ ایسی کتاب کو اپنی تصنیف قرار دینے کا ڈاکٹر معین الرحمن کے پاس کیا جواز ہے؟

ڈاکٹر معین الرحمن نے کتاب ''تحقیق نامۂ غالب'' کا بھی اپنے آپ کو مصنف ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی جلد پر چسپاں سرورق اور اندر کے ٹائٹل پر کتاب کے نام کے بعد ڈاکٹر سید معین الرحمن کا اسی طرح نام چھپا ہے جس طرح مصنف کا نام چھپتا ہے یعنی مرتب یا مترجم یا مولف جیسا کوئی وضاحتی لفظ یہاں موجود نہیں ہے۔

یہ کتاب دراصل مجلہ ''تحقیق نامہ'' شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور شمارہ 6-7 (1997-98ء) کے 330 صفحات میں شمارہ 3-4 اور شمارہ 5 کے مجموعی 102 صفحات ملا کر تیار کی گئی ہے۔ گویا اس کی ضخامت 432 صفحات ہے۔ یاد رہے ''تحقیق نامہ'' کا شمارہ 6-7 غالب پر ایک خصوصی شمارہ تھا جو مندرجہ ذیل چھ عنوانات کے تحت مضامین پر مشتمل تھا۔

1۔ تراجم غالب

2۔ مطالعات غالب

3۔ جہان غالب

4۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی

5۔ گیتا رضا اور غالبیات

6۔ نادرات غالب

ساتواں باب متفرقات اور متعارفات کے زیر عنوان 15 کتابوں پر تبصرہ اور ''شعبہ اردو۔ احوال نامہ'' پر مشتمل ہے۔ ساتواں باب کتاب ''تحقیق نامۂ غالب'' میں شامل نہیں کیا گیا۔

بہر حال ہم اس بحث سے صرف نظر کرتے ہیں کہ یہ 330 صفحات کتاب کے لیے دوبارہ طبع ہوئے یا پہلی طباعت ہی کا پسماندہ ہیں۔ ان میں اضافہ کیے گئے 120 صفحات کی تفصیل اور کیفیت یہ ہے:

''تحقیق نامۂ غالب'' کے صفحات 331 تا 432 مندرجہ ذیل تین عنوانات کے تحت منقسم ہیں:

1۔ غالبیاتی نوادر (صفحہ 331 تا 360)

2۔ غالب شناس اور غالب شناسی (361 تا 378)

3۔ ادب غالب (تاثر تعارف) (صفحہ 379 تا 408)

4۔ غالب۔ مقبولیت اور معنویت

1۔ غالبیاتی نوادر کے سیکشن میں شائع ہونے والی تحریریں: اشاعتی کیفیت:

جہانِ غالب۔ کچھ نوادر کی بازیافت'
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
تحقیق نامہ شمارہ 5 صفحہ 18 'تحقیق نامہ غالب' صفحہ 333

2۔ مرقع غالب پر اقبال کا دیباچہ۔ حنا سرور
''تحقیق نامہ'' 3-4 ' (1994-95ء) صفحہ 56
''تحقیق نامہ غالب'' صفحہ نمبر 340

3۔ چغتائی کا ایک معدوم غالبیاتی کارنامہ۔ حنا سرور
تحقیق نامہ 3-4' (1994-95ء) صفحہ 58
تحقیق نامہ غالب' صفحہ نمبر 342

4۔ بسلسلہ غالبیات: ڈاکٹر عبداللہ کے نادر خط
متعارفہ: عاصمہ وقار
تحقیق نامہ 5' صفحہ 25
''تحقیق نامہ غالب'' صفحہ نمبر 355

2۔ غالب شناس اور غالب شناسی:

1۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی غالب شناسی۔ شکیلہ شاہجہاں
تحقیق نامہ 5 (1995-96ء) صفحہ 31
''تحقیق نامہ غالب'' صفحہ نمبر 363

2۔ ڈاکٹر وحید قریشی بطور غالب شناس۔ حنا انیس
تحقیق نامہ 5 (1995-96ء) صفحہ 36
''تحقیق نامۂ غالب'' صفحہ نمبر 368

3۔ ''مستقبل کا غالب شناس'' انٹرویو: فرازیہ بشیر
تحقیق نامہ 5 (1995-96ء) صفحہ 70
''تحقیق نامۂ غالب'' صفحہ نمبر 374

4۔ ادبِ غالب (تاثر' تعارف):

1۔ ''نقدِ غالب'': ڈاکٹر مختار الدین احمد' جمیل الدین عالی

تحقیق نامہ 5(96-1995ء)صفحہ 59

''تحقیق نامۂ غالب''صفحہ نمبر 381

2۔''لطائف غیبی''از مرزا اسداللہ خاں غالب'تبصرہ:جمیل الدین عالی

تحقیق نامہ 5(96-1995ء)صفحہ 46

''تحقیق نامۂ غالب''صفحہ نمبر 382

نیز دیکھیے کتاب''نقوش غالب''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (مصنف دکھایا گیا ہے۔دراصل مرتب) عالی صاحب کا مندرجہ بالا تبصرہ بر صفحہ 371

2۔الف۔''لطائف غیبی''از مرزا اسداللہ خاں غالب' متعارفہ و مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' تبصرہ مشفق خواجہ

تحقیق نامہ 5(96-1995ء)صفحہ 47

تحقیق نامۂ غالب صفحہ نمبر 383

نیز دیکھیے کتاب''نقوش غالب''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (مصنف دکھایا گیا ہے۔دراصل مرتب) مشفق خواجہ کا مندرجہ بالا تبصرہ بر صفحہ 372

3۔''نقوش غالب''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (مرتب ہیں۔ظاہر نہیں کیا)

تبصرہ:جمیل الدین عالی

تحقیق نامہ 5(96-1995ء)صفحہ 54

تحقیق نامۂ غالب صفحہ نمبر 390

فرازیہ بشیر:تحقیق نامہ 5' صفحہ 55

تحقیق نامۂ غالب صفحہ 391

ربیعہ نسرین تحقیق نامہ 5(96-1995ء)صفحہ 56

تحقیق نامۂ غالب صفحہ نمبر 392

غزل غالب اور حسرت:رشید احمد صدیقی

تبصرہ:میرزا ادیب تحقیق نامہ 5(96-1995ء)صفحہ 42

تحقیق نامۂ غالب صفحہ نمبر 395

نقوش غالب صفحہ 360

تبصرہ:ڈاکٹر خورشید احمد رضوی

تحقیق نامہ 5(96-1995ء)صفحہ

تحقیق نامۂ غالب صفحہ نمبر 399

نقوشِ غالب صفحہ 364

تبصرہ: اصغر ندیم سید تحقیق نامہ 3-4 صفحہ 230 'تحقیق نامۂ غالب صفحہ 401

نقوشِ غالب صفحہ 366

''غالب نامہ'' تجزیاتی مطالعہ' مولفہ: عاصمہ وقار

تبصرہ: ڈاکٹر نجم الاسلام

تحقیق نامہ 5: صفحہ 60

تحقیق نامۂ غالب صفحہ 406

تبصرہ ادیب سہیل

تحقیق نامہ 3-4 صفحہ 208

تحقیق نامۂ غالب صفحہ 408

4۔ غالب مقبولیت اور معنویت

1۔ غالب صاحب طرز انشاپرداز۔ رشید احمد صدیقی

تحقیق نامہ 3-4(96-1995ء) صفحہ 71

تحقیق نامۂ غالب صفحہ نمبر 411

2۔ غالب کے خطوط اور ان کی احباب پرستی۔ سید وقار عظیم

تحقیق نامہ 5(96-1995ء) صفحہ 10

تحقیق نامۂ غالب صفحہ نمبر 417

3۔ غالب' آج بھی غالب ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

تحقیق نامہ 5(96-1995ء) صفحہ 62

تحقیق نامۂ غالب صفحہ نمبر 425

''تحقیق نامہ'' شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کا تحقیقی مجلہ ہے جس کا پہلا شمارہ 1991ء میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ادارت (بر بنائے عہدہ) میں شائع ہوا۔ اس کا آخری شمارہ 9 (2000-1999ء) ہے۔ دو دو شمارے 3-4 اور 6-7 اکٹھے شائع ہوئے تھے۔

یونیورسٹیوں یا بڑے کالجز کے شعبہ جاتی تحقیقی مجلے بھی اپنے اپنے متعلقہ مضمون کے ریسرچ جرنل کے طور پر شائع ہوتے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد متعلقہ مضمون کے لٹریچر میں منظم مطالعہ یا اس مضمون اور علم میں تلاش و جستجو سے نئے حقائق یا نئے تجزیہ سے نئے نتائج دریافت کرنے میں شریک ہونا ہوتا ہے۔ اس

سرگرمی اور کارگزاری میں اساتذہ اور طلبا مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ عملی لحاظ سے کسی علمی ادارے کے شعبہ کے ریسرچ جرنل کا مقصد اشاعت اپنے شعبہ کے اساتذہ کے ریسرچ ورک کی اشاعت اور طالب علموں کے اندر ذوق تحقیق کی تربیت ہوتا ہے۔ عموماً طالب علموں کو assignement دے کر آمادہ تحقیق کیا جاتا ہے اور انہیں عملی طور پر تحقیق و تصنیف میں مصروف رکھا جاتا ہے۔

ہر ملک و قوم کے علم و ادب کی ترقی اور فروغ میں ان کے مختلف شعبوں کے ریسرچ جرنلز نے قابل قدر اور یادگار حصہ لیا ہے۔ اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ ریسرچ جرنلز کامیابی و ترقی کے لیے اپنی اشاعتی تاریخ، روایت کے بعد اپنے مدیر و مہتمم کی توجہ، دلچسپی اور لیاقت و صلاحیت اور پالیسی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

تحقیق نامہ کے (نو نمبر) مطبوعہ سات شمارے تقریباً 1700 صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اس تحقیقی مجلہ کا اس وقت تک کوئی ایسا تنقیدی جائزہ نظر سے نہیں گزرا جس میں اس مجلہ کی کارگزاری اور تحقیقی قدر و قیمت متعین کی گئی ہو البتہ اس کے مدیر کی ہمشیرہ محترمہ نے اپنے ''سوانحی خاکہ۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن'' میں ''تصنیفات و تالیفات ڈاکٹر سید معین الرحمٰن'' کے ذیلی عنوان ''دیگر متفرق تالیفات'' کے شمار میں ''تحقیق نامہ'' نمبر 1 تا 8 کا مع سنین اندراج کیا ہے۔

اس مجلہ کا کوئی مقصد اور پالیسی واضح نہیں ہے۔ یہ روایت رہی ہے کہ ہر نیا ریسرچ جرنل (تحقیقی مجلہ) اپنے مقاصد اور حدود کا اعلان کرتا ہے۔ عموماً یہ پالیسی ہر شمارے میں مکرر شائع کی جاتی ہے۔ مثلاً ''اقبال ریویو'' میں اس کا نمونہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ''تحقیق نامہ'' شمارہ اول کے پہلے (حرفے چند) اداریہ میں اس باب میں تعارفی کلمات تک نہیں کہے گئے۔

ہمارا قومی المیہ اور تضاد یہ ہے کہ ہمارے قومی مزاج میں تو ڈکٹیٹرشپ رچی بسی ہوئی ہے مگر ہمارا آئیڈیل ڈیموکریسی ہے۔ اس کا ثبوت زیر نظر ''تحقیق نامہ'' کے نو شمارے ہیں جس کی ادارت بلا شرکت غیرے اور من مانے انداز میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کرتے رہے ہیں۔ ڈکٹیٹرشپ کے سسٹم میں جو نقائص اور عیوب نمایاں ہوئے ہیں ان کی جھلک ''تحقیق نامہ'' کے ایک چھوٹے سے سیناریو میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً انہوں نے اس مجلہ کے لیے رسمی طور پر اور محض خانہ پری کے لیے ایک ڈمی مجلس مشاورت نامزد کر رکھی تھی جس کے دو تین مستقل ارکان کے علاوہ دوسرے ارکان کو اپنی کسی ہنگامی مصلحت کے لیے نامزد کر لیا کرتے تھے۔ عام طور پر غیر موقر جرائد کی مجلس مشاورت میں بڑے نام رعب جتانے کے لیے درج کیے جاتے ہیں جو عموماً ادارے سے باہر کے لوگ ہوتے ہیں ورنہ یہ استحقاق اصولاً ادارے اور خصوصاً متعلقہ شعبہ کے دو تین سینئر لوگوں کا ہوتا ہے کہ مجلس مشاورت ان کے ناموں ہی پر مشتمل نہ ہو۔ بلکہ مدیر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اشاعتی امور میں ان سے مشورہ کرتا رہے اور ہر شمارہ کی اشاعت سے پہلے مجلس مشاورت میں اشاعت

کے لیے جانے والا شمارہ ریویو کے لیے میٹنگ میں رکھا جائے۔ مجلّہ ''تحقیق نامہ'' کے مختلف شماروں میں مندرجہ ذیل اصحاب علم وفضل کا نام مجلس مشاورت کے ارکان کے طور پر چھپتا رہا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (سات بار) (حیدرآباد سندھ)

پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)

پروفیسر خواجہ محمد سعید (لاہور)

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا 93-1992ء بیکنگ یونیورسٹی (جاپان)

ڈاکٹر سلیم اختر 94-1995ء وزٹنگ پروفیسر (لاہور)

پروفیسر نظیر صدیقی (اسلام آباد)

پروفیسر ڈاکٹر اے۔ بی اشرف (انقرہ)

پروفیسر سحر انصاری (کراچی یونیورسٹی)

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل (ٹوکیو)

پروفیسر محمد منور مرزا (لاہور)

پروفیسر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی (شیخوپورہ)

پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان (پشاور)

پروفیسر ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش (اسلام آباد)

پروفیسر عبدالجبار شاکر (لاہور)

اس فہرست میں شامل بزرگ کیسے ہی علمی، ادبی، تعلیمی اور روحانی مرتبہ، مقام اور احترام۔۔۔ کیوں نہ ہوں، اُن کو ''تحقیق نامہ'' کی مجلس مشاورت میں رکھنے کی کوئی سیاسی، ہنگامی یا مدیر کی ذاتی مصلحت کچھ بھی سہی مگر علمی، ادبی اور تعلیمی روایت کے مطابق، ان کی نامزدگی ناجائز اور غلط تھی۔ مثلاً پروفیسر خواجہ محمد سعید اپنی سینیارٹی، مدت ملازمت اور سابق صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج رہنے کے باوجود اس ادبی و تحقیقی مجلہ کی مجلس مشاورت کی رکنیت کا استحقاق نہیں رکھتے تھے کیونکہ ان کی ایک بھی علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی تحریر ریکارڈ پر نہیں۔ اسی لیے ان کا تو بحیثیت صدر شعبہ اردو رسالہ ''راوی'' کے نگران مدیر کے طور پر بھی تقرر نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس مجلہ کا مرکز و محور اپنی ذات اور اپنی تحریروں کو بنائے رکھا۔ ان کے علاوہ ان کے تین چار افراد خانہ کو جگہ ملی ہے۔ ارکانِ سٹاف میں ان کے تین قریبی اساتذہ کی ایک آدھ تحریر نظر آتی ہے۔ ان تحریروں میں بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تعریف و توصیف کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس روایت کا بھی لحاظ نہیں رکھا کہ مدیر اپنے زیر ادارت مجلّہ یا رسالہ میں ٹائٹل پر اپنے نام کے بعد کہیں منظر عام پر نہیں آتا مگر ''تحقیق نامہ'' کے سات شماروں میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا نام تقریباً دو سو سے زیادہ بار لکھا پایا گیا ہے۔

اس مجلّہ کے شمارہ 1 '2 '3-4 '5 میں علامہ اقبال کے خطوط بنام چودھری محمد حسین کی اشاعت اہم ضرور ہے مگر یہ بھی ایک حسن اتفاق کا نتیجہ ہے کہ چودھری محمد حسین مرحوم کے پوتے پروفیسر ثاقف نفیس شعبہ اردو کے سٹاف پر ہیں جو اپنے ایم اے کے تھیسس میں علامہ اقبال کے یہ خطوط شامل کر چکے تھے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن اپنی ایک تحریر کو عنوان یا پیراگراف بدل کر کئی بار چھپوانے کے عادی ہیں۔ انہوں نے ''تحقیق نامہ'' میں بھی اس روش کو ترک نہیں کیا تھا۔

1981ء میں ڈاکٹر معین الرحمٰن ''تحقیق غالب'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کر رہے تھے تو انہیں ایک فقرہ سوجھا (ممکن ہے وہ یہ فقرہ کسی بچے کی آٹوگراف بک پر لکھ چکے ہوں) جو انہوں نے ''تحقیق غالب'' کے پہلے ایڈیشن کے صفحہ 12 پر اپنے دستخط (مع تاریخ 23 مارچ 1981ء) کے ساتھ چھپوایا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے:

''ادب میں ''باقی'' رہنے کی فکر سے زیادہ ''تازہ'' رہنے کے شوق بے مہار کو میں ادب یا ادیب کے لیے نیک فال نہیں جانتا۔''

اس کے بعد سے وہ یہ فقرہ برابر دہرا رہے ہیں۔ خصوصاً آئندہ سطور میں دو مضمونوں کا حوالہ آئے گا۔ جن میں یہ فقرہ ایک پیراگراف کا افتتاحی فقرہ بن کر نمودار ہوا ہے۔

یہ سوال شاید دلچسپی کا باعث بنے کہ شعر و ادب یا دوسرے فنون و علوم میں سرقہ کو ایک قابل نفرت اور قابل مذمت فعل تو گردانا ہی جاتا ہے۔ کیا ایسا شخص جو اپنی تحریر یا تحریروں کے عنوان یا اول و آخر پیراگراف تبدیل کر کے انہیں نئی تحریروں یا تحریر کے طور پر پیش کرتا ہے یا دوسرا ایسا شخص جو اپنی کسی تحریر میں تھوڑا سا فرق پیدا کرنے کے بعد اُسے تازہ تحریر کی حیثیت میں پیش کرتا ہے؛ ویسا ہی قابل گرفت اور قابل مذمت نہیں ہے جیسا ایک سارق ہوتا ہے کیونکہ قاری ایک اوریجنل اور تازہ تحریر کا منتظر اور طالب ہوتا ہے۔ باسی کھانا اور بوسیدہ لباس کوئی آدمی بھی بہ طیب خاطر قبول نہیں کرتا۔ بہر حال اگر ادیب یا شاعر ایسی نوبت کو آپہنچے تو کیا اس پر لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے معاصرین اور قارئین کو خدا حافظ کہتا ہوا شعر و ادب کے میدان سے اخراج کے راستے پر گامزن ہو جائے؟

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ایک تالیف ''اردو تحقیق: یونیورسٹیوں میں''[1] شائع کردہ یونیورسل بکس لاہور 1989ء کے صفحات نمبر 37 تا 41 'ان کے مضمون ''پاکستانی یونیورسٹیوں میں: اردو تحقیق کی روایت اور

1۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تالیف کے ماڈل کے لیے دیکھیے: ''ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق'' مرتب: سید فرحت حسین مشمولہ ''اردو میں اصول تحقیق'' جلد دوم مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش' اسلام آباد' طبع چہارم 2001ء' صفحات 311-353 (سید فرحت حسین کی متذکرہ ببلیوگرافی رسالہ ''کتاب نما'' مکتبہ جامعہ دہلی بابت مئی 1976ء میں شائع ہوئی تھی۔ بحوالہ ''تحقیق کا فن'' از گیان چند لکھنئوی' صفحہ ۶۶)

صورت حال'' مجلہ ''تحقیق نامہ'' کے شمارہ 12 بابت 93-1992ء کے صفحات 137 تا 140 پر موجود ہے۔ یاد رہے' انہوں نے یہ مقالہ عالمی اردو کانفرنس منعقدہ ملتان 23 اپریل 1992ء کی دوسری نشست میں پیش کیا۔ انہوں نے تین برس بعد اس مقالہ کا معتدبہ حصہ ''تحقیق اور موضوع تحقیق'' کے عنوان سے ''تحقیق نامہ'' کے شمارہ 5 '96-1995ء میں چھاپ لیا۔ دونوں میں کئی صفحات پر مشترک تحریر ملتی ہے۔ اس مضمون کے آخر میں نیم دلی کے ساتھ [باضافہ وترمیم 1995ء] لکھا گیا ہے۔ ان دو لفظوں کی وضاحت سے کسی طور بھی یہ بات سامنے نہیں آتی کہ کس تحریر میں اضافہ وترمیم بتائی جا رہی ہے۔ ان دونوں مضمونوں میں بھی 23 مارچ 1981ء کا آٹوگراف نما فقرہ دہرایا گیا ہے۔ نہ صرف یہ فقرہ حرفے چند ''تحقیق غالب'' کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ اسی حرفے چند کے پیرا نمبر 3' 4' 5 متذکرہ مضمونوں میں بار بار نقل کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے وہ نئی بات کہنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ ظاہر ہے نئی بات ہوگی تو اس کے اظہار کے لیے نئی عبارت مرتب کرنی پڑے گی۔

اسی طرح ان شماروں میں کئی معمولی مضمون پرانے رسائل میں سے نکال کر نو اور یادگار کے طور پر شائع کیے گئے ہیں۔ ہر شمارے میں کتابوں پر تبصروں کا حصہ بھی بہت کمزور ہے۔ اول تو کسی تحقیقی مجلہ میں تبصرہ کے لیے صرف وہی کتابیں منتخب کی جانی چاہئیں جن کا کوئی تحقیقی یا علمی حوالہ بنتا ہو۔ دوسرے ایسے تبصرے سرسری نہیں سیر حاصل ہوتے ہیں۔ ابتدائی شماروں کے تبصرہ نگاروں میں بعض بڑے نام نظر آتے ہیں۔ مگر انہوں نے تبصرہ کا حق ادا نہیں کیا۔ پھر ان کی اشاعت کیوں ضروری خیال کی گئی۔

اس مجلہ کی یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے کہ اس میں اساتذہ اور عام طلبا وطالبات کو کم سے کم 'ایسوسی ایٹ' کیا گیا ہے۔ ایک دو شماروں میں جن آٹھ دس طالبات کے نام نظر آتے ہیں' ان کے امتحانی مقالات' بسلسلہ غالب اور غالب شناس' زیر نگرانی ڈاکٹر معین الرحمن کے ابتدائی صفحات شائع کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جن سے کوئی علمی یا تحقیقی تاثر قائم نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر معین الرحمن کو اس مجلہ کی بنیاد پر گورنمنٹ کالج میں ایک تحقیقی فضا پیدا کرنے کا موقع ملا تھا مگر وہ اپنے رفقائے کار کے اندر ٹیم ورک اسپرٹ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم رہے۔

کتاب موسوم بہ ''تحقیق نامہ غالب'' کی اشاعت سے ایک واضح مقصد ڈاکٹر سید معین الرحمن کی تصنیفات کے شمار میں اضافہ ہے۔ یہ بات مختلف جگہ ان کی چھپی ہوئی فہرست تصانیف سے ثابت ہے۔ دوسرا مقصد کاروباری ظاہر ہوتا ہے۔ زیر نظر کتاب اور اس سلسلے کی دوسری کتب (''نقوش غالب'' اور بازیافت غالب وغیرہ) کی الوقار لاہور کے زیر اہتمام پروڈکشن میں مجلہ تحقیق نامہ کا طباعتی واشاعتی مسالہ استعمال ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ''تحقیق نامہ غالب'' کے پہلے 330 صفحات تو عین مین تحقیق نامہ شمارہ 6-7 (98-1997ء) کے ہیں' تحقیق نامہ غالب کے 330 صفحات کے بعد 102 صفحات کی پچھلے صفحات میں وضاحت کردی گئی ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ایک اور کتاب موسوم بہ ''غالب پیائی'' (1998ء) ایک بھرتی کی کتاب ہے۔ اس کا اولیں مقصد بھی موصوف کی تصانیف کی تعداد بڑھانا ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت اور حقیقت خود مصنف کی زبانی سنیے:

''غالب کے بارے میں میری پہلی کتاب ''اشاریۂ غالب'' ۔۔۔اب ۔۔۔ ایک طرح سے ناپید ہے لیکن میں دور و نزدیک سے اس کی فراہمی کی فرمائش کا اکثر مورد رہتا ہوں۔۔۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں (1969ء کے بعد) غالبیات پر بہت کچھ اضافے ہوئے ہیں اس لیے ''اشاریۂ غالب'' کو جنبہ شائع کرنا مجھے گوارا نہ ہوا لیکن اس میں ضروری ترمیم اور اضافے کی ہمت اور فرصت بھی نہ نکال پایا۔ بیچ کا راستہ یہ نکالا کہ ''اشاریۂ غالب'' کے وہ حصے 'جو' جیسے ہیں' جس طرح ہیں'' کی صورت میں میرے نزدیک آج بھی دلچسپی اور افادیت یا اہمیت رکھتے ہیں انہیں الگ سے مختصر کتاب کے طور پر مرتب اور محفوظ کر لیا جائے۔۔۔

''غالب پیائی'' کی ابتدائی دس گیارہ تحریروں کا ماخذ میری کتاب ''اشاریۂ غالب'' (1969ء) ہے۔ آخری نگارشات رسالہ ''نقوش'' کے غالب نمبر (حصہ چہارم) کے لیے (جو ابھی تک چھپا نہیں ہے) 1972ء کے پس و پیش محمد طفیل مرحوم کی فرمائش پر ضبط تحریر میں آئی تھیں۔ ان کے کچھ اجزا میرے تھیسس ''غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' (1972ء) [ڈاکٹر صاحب واضح طور پر کیوں نہیں بتاتے کہ ان کا تھیسس نئے عنوان ''غالب کا علمی سرمایہ'' سے 1989ء میں تخفیف و اضافہ کے ساتھ چھپ چکا ہے] میں بھی کام آئے۔ زیر نظر کتاب کو گویا بنیادی طور پر 1972ء کے لگ بھگ کی حد زمانی تک ''غالب پیائی'' کی ایک کوشش خیال کرنا چاہیے۔'' (صفحہ 9-10)

ڈاکٹر صاحب بھی جانتے ہیں کہ ''اشاریۂ غالب'' ناپید نہیں ہے۔ میں انہی بک سٹورز پر پچھلے آٹھ نو برس سے یہ کتاب دیکھ رہا ہوں جہاں ڈاکٹر صاحب اور وقار معین جاتے ہیں۔ میں نے اوائل جولائی میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر انور محمود خالد کی معیت میں بازار سے یہ کتاب خریدی تھی۔ مجلس یادگار غالب جامعہ پنجاب لاہور نے 1969ء میں یہ کتاب شائع کی تھی۔ اس کی قیمت آٹھ دس روپے تھی۔ اس کتاب کو جلد اور ڈسٹ کور لگا کر اب 275 روپے میں فروخت کیا جا رہا ہے۔ سرکاری اداروں' اکادمیوں اور یونیورسٹیوں وغیرہ کی متعدد مطبوعات برسوں سے اسی طرح فروخت ہو رہی ہیں۔ وقت بھی کیا کیا ستم کرتا ہے جو کتاب آٹھ روپے میں فروخت نہ ہوئی تھی وہ اسٹاکسٹوں کے تہہ خانوں سے استراحت فرما کر نکلی تو تلاش کرنے والوں نے ڈھونڈ کر 275 روپے میں خریدنا شروع کر دی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ''اشاریۂ غالب'' کا دوسرا ایڈیشن شائع نہ کرنے کی جو توجیہہ کی ہے' وہ قرین قیاس نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے دو اسباب ہیں:

1۔ دوسرے ایڈیشن کی صورت میں ایک نئی کتاب کے ٹائٹل پر ان کا نام دوبارہ نہ چھپ سکتا تھا۔

2۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن کی بازار میں پہلے سے موجودگی میں کاروباری نقطۂ نظر سے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت غلط فیصلہ ہوتا۔

کتاب ''غالب پیمائی'' میں ''اشاریۂ غالب'' کے پہلے 194 صفحات نظر انداز کرتے ہوئے 195 سے لے کر 295 تک صفحات کو شامل کرنا کسی پراسرار تحقیقی شعور کا نتیجہ ہوتو ہو مگر ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ معلوم نہیں ''اشاریۂ غالب'' کی آخری ''دس گیارہ تحریروں'' کو ''غالب پیمائی'' کی ابتدائی دس گیارہ تحریریں'' کیوں بنایا گیا ہے۔ بہرحال اشاریہ غالب کا یہ حصہ فوٹو کاپی پر اس سے ''غالب پیمائی'' میں منتقل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ''اشاریۂ غالب'' میں جس ضروری ترمیم اور اضافے کی ہمت اور فرصت نہ نکال پائے اُس کا نمونہ ''غالب پیمائی'' میں بار پانے والی دس گیارہ تحریروں میں موجود ہے۔

''اشاریۂ غالب'' کے تیسرے باب جز الف کا عنوان کلام غالب ہے۔ اس عنوان کو ''غالب پیمائی'' میں کمپیوٹر کمپوزنگ میں

غالب کا غیر مرتب اور منتشر کلام

(کچھ حوالے)

میں بدل دیا گیا ہے

مضمون کے آخر میں: (کاوش: فروری 1969ء) کا اضافہ ہے۔

''اشاریۂ غالب'' میں:

ج۔ مکاتیب غالب' صفحہ 223 پر نسخ ٹائپ میں عنوان کو ''غالب پیمائی'' میں ''متفرق مکاتیب غالب (کچھ حوالے)'' کمپوز ٹائپ نستعلیق میں بدل دیا گیا ہے۔ آخر میں (کاوش: فروری 1969ء) کا اضافہ کردیا گیا ہے۔

''اشاریۂ غالب'' میں

ج۔ غالب کی دیگر تحریریں

[خودنوشت حالات' لطائف' اصلاحیں۔۔۔] صفحہ 245

کی جگہ ''غالب پیمائی'' میں:

غالب کی چند غیر مدون تحریریں:

[چند حوالے]

کے عنوان سے کمپیوٹر کمپوزنگ نستعلیق میں چھاپ دیا گیا ہے۔ آخر میں (جمع و ترتیب: فروری 1969ء) کا اضافہ ہے۔

''اشاریۂ غالب'' میں:

د۔ ''معاصر خطی نسخے' اہم ایڈیشن'' صفحہ 257 پر نسخ ٹائپ میں عنوان کو'' کمپیوٹر نستعلیق'' میں بدل کر

''دیوانِ غالب کے معاصر خطی نسخے

(اور اہم ایڈیشن)

کر دیا گیا ہے۔ (صفحہ 25)

یہاں آخر میں تحریر کی تاریخ درج نہیں کی گئی۔

کتاب'' غالب پیمائی'' میں'' اشاریہ غالب'' کے نقل شدہ حصہ میں اس انداز میں عنوانات کا ٹائپ بدلا گیا ہے۔

''اشاریہ غالب'' کے'' غالب پیمائی'' میں استعمال کیے گئے آخری باب کا نسخ ٹائپ میں عنوان ''پاک و ہند سے باہر غالب کا مطالعہ'' (ص 345) نستعلیق کمپیوٹر سے بدل دیا گیا ہے۔ ('' غالب پیمائی'' صفحہ 161)

غالب پر 1999ء میں شائع ہونے والی ایک اور کتاب'' بازیافتِ غالب'' پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا نام بطور مصنف چھپا ہوا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب ان کتابوں پر اپنے آپ کو مصنف لکھ کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں جو انہیں مرتب لکھنے سے حاصل نہ ہوگا۔ وہ خود پی ایچ ڈی کی سند فضیلت پا چکے ہیں۔ وہ ریسرچ Methodology کے پروفیسر رہے ہیں اور متعدد بار حوالے میں آنے والے ان کے سوانحی خاکہ کے مطابق ''انہوں نے ستر ریسرچ اسکالرز کے کام کی نگرانی کی خدمت انجام دی'' ['' دل کی کتاب'' صفحہ 394]

اس سوانحی خاکہ کے مطابق انہوں نے پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے ''اعلیٰ مدارج میں تحقیقی اور امتحانی کام'' کی نگرانی کر رکھی ہے اور کم و بیش وہ اردو کے مضمون میں' پاکستان کی ہر یونیورسٹی کے ایم اے' ایم فل' ایم فل (اقبالیات) اور پی ایچ ڈی کے امتحانات کے ممتحن رہے ہیں ['' دل کی کتاب'' 393' 394] وہ دیکھتے رہے ہوں گے کہ ان امتحانات کے امیدواران نے اپنے تحقیقی مقالات میں مصنف' مؤلف' مرتب اور تدوین کار وغیرہ کا فرق روا رکھا ہے یا نہیں؟ انہوں نے امتحانی مقالات کی Evaluation کرتے ہوئے یہ امر ہمیشہ پیش نظر رکھا ہوگا کہ مقالہ نگاروں نے ضروری مقامات پر اپنے ماٰخذ کا واضح اور غیر مبہم انداز میں اعلان کیا ہے یا نہیں؟ یہ بات واقعی سمجھ نہیں آتی کہ وہ خود اپنی تحریروں میں ان تحقیقی تقاضوں کا خیال کیوں نہیں رکھتے بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعوری طور پر ایسے حقائق کو مخفی اور پوشیدہ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ مثلاً زیر نظر کتاب'' بازیافتِ غالب'' کی فہرست اور دیباچہ (حرفے چند) سے واضح نہیں ہونے دیتے کہ اس کتاب کے مندرجات کی کیا کیفیت ہے۔ وہ اس کتاب کے دیباچہ یا پیش لفظ بعنوان ''حرفے چند'' میں لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب'' بازیافتِ غالب'' چند اشاریاتی مطالعات' اور غالب پر کچھ معدوم تحریروں کی

بازیافت سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ کتاب کے پہلے حصے کی نوتحریریں قدیم رسائل یا دوسرے نادر ماخذ سے لی گئی ہیں۔ اس حصے کی اولین تحریر 1878ء کی ہے اور آخری نگارش کوئی تیس برس پہلے کے ایک روزنامے سے تلاش کی گئی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے کے چھوٹے بڑے گیارہ مطالعات' چند رسائل کے اشاریاتِ غالب' یا بعض غالب شناسوں کی غالب سے متعلق تحریروں وغیرہ کے اشاریوں اور غالب کے بارے میں کتابوں کی دو نمائشوں کے تعارفات پرمبنی ہیں''

پہلی بات تو یہ ہے کہ معدوم تحریریں وجود میں کیسے آگئیں؟ کتاب کے پہلے حصہ کی نوتحریروں کا ان کے بالاستعیابِ مطالعہ کے بعد ہی پتہ چل سکے گا کہ یہ ''مصنف'' کی تحریریں نہیں بلکہ ''آثار عتیقہ'' ہیں۔ کیا یہ نو کی نو تحریریں واقعتاً تحقیقی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں؟ ہمیں تخلیقی محرکات کے مطالعہ میں دلچسپی ہے۔ اس کے ساتھ ''تحقیقی و تنقیدی محرکات'' کی طرف بھی کبھی نگاہ پلٹ جاتی ہے۔ خصوصاً جن احباب سے شخصی و ذاتی تعلق ہو' ان کی باتیں اور ''رمزیں'' کچھ کچھ سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم محترم معین الرحمٰن صاحب کو بھی تھوڑا بہت سمجھنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ بہر حال متذکرہ بالا نو تحریروں[1] میں سے مندرجہ ذیل چار ایسی تحریریں ہیں جن کی اشاعت کا اولین محرک پبلک ریلشنگ ہے:

1۔ غالب سے متعلق ن۔م راشد کی دو یادگاریں
2۔ بیگم مرزا غالب کی کہانی حمید احمد خاں کی زبانی
3۔ غالب کے بارے میں آفتاب احمد خاں کی پہلی تحریر
4۔ غالب کا ایک دور بینی مطالعہ از جمیل الدین عالی

پہلی شق میں ن۔م راشد کے زمانہ طالب علمی کی دو تحریریں شامل ہیں۔ ن۔م راشد مجلّہ ''راوی'' کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے ''اداریہ' راوی' لاہور' فروری 1932ء'' میں بتایا: اس نمبر سے مسٹر نسیم حسن میرے شریک کار ہیں۔'' اس پر تعارف کنندہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے یہ نوٹ لکھا:

''یہاں اس امر کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ 1932ء کے یہ مسٹر نسیم حسن'' 1998ء کے ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر نسیم حسن شاہ ہیں! جو مئی جون 1934ء تک ''راوی'' کے مدیر رہے۔'' (''تحقیق نامہ'': شمارہ 6-7' 98-1997ء' صفحہ 313 نیز دیکھیے ''تحقیق نامۂ غالب'' الوقار لاہور 1998ء' صفحہ 313) نوٹ: بعد میں زیر نظر ''تحقیق نامہ'' (پس ماندہ کاپیوں کے) صفحہ 313 کے اس مقام ''1998ء کے ریٹائرڈ چیف۔۔۔ شاہ ہیں!'' جو پر چیپی لگا دی گئی ہے۔ مندرجہ بالا ''تحقیق نامۂ غالب'' میں نشان زد مقام (جسے اوپر نمایاں فونٹ سے ظاہر کیا گیا ہے) پر اس لیے چیپی چسپاں نہ ہو سکی کہ کاپیوں کی ایک معقول تعداد جلد ہونے کے بعد مارکیٹ میں جا چکی ہوگی۔

---

[1] ''بازیافت غالب'' کے دونوں حصوں کی تحریریں ''تحقیق نامہ'' کے مختلف شماروں سے نقل کی گئی ہیں مگر اصول تدوین و ترتیب کے برخلاف متعلقہ شماروں کی نشاندہی نہیں کی گئی۔

اسی طرح ''غالب پر ن۔م راشد کی دو تحریریں'' متعارفہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے آخر پر ''حواشی اور حوالے'' کے ذیل میں حاشیہ نمبر 4 کی پہلی سطر ''راوی کے پرانے پرچوں میں نسیم حسن شاہ کی کئی تحریریں ملتی ہیں۔۔۔'' یہ حاشیہ اگلے صفحہ 322 پر جاری ہے۔اس کی دوسری اور تیسری سطر میں ''۔۔۔نسیم حسن شاہ کا ایک ''اداریہ''۔۔۔'' اس کے بعد اسی صفحہ پر حاشیہ نمبر 12 حسب ذیل ہے:

''ن۔م راشد کے ایک ممتاز معاصر سپریم کورٹ آف پاکستان کے ریٹائرڈ چیف جسٹس عزت مآب نسیم حسن شاہ۔''

''تحقیق نامہ'' چھپی چھپائی شدہ کے صفحہ 321-322 پر حاشیہ 4 میں نسیم حسن کے آگے ''شاہ'' کا لفظ اور حاشیہ 12 میں لفظ ''معاصر'' کے بعد آنے والے تیرہ الفاظ ''بلیک بال پوائنٹ'' سے مسخ کر دیے گئے ہیں۔ڈاکٹر وحید قریشی کو اس ''تحقیق نامہ'' کی تقسیم کے شروع میں چھپی وغیرہ کے بغیر ''تحقیق نامہ'' کی ایک کاپی مل گئی۔انہوں نے اس مغالطے کی فوری طور پر ڈاکٹر معین الرحمٰن اور راقم کو خبر دی۔ میں نے پروفیسر حق نواز مرحوم سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کو مطلع کر دیں۔

شیخ نسیم حسن مرحوم پاکستان میں علوم وفنون کے سرپرست اور مربی جناب ممتاز حسن مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ پنجاب میں میاں عبدالباری مرحوم صوبائی صدر مسلم لیگ کے انتہائی معتمد ساتھیوں میں تھے۔میاں صاحب کی سفارش پر سردار عبدالرب نشتر گورنر پنجاب کی جوایڈوائزری کونسل تشکیل پائی تھی' اس میں شیخ نسیم حسن مرحوم کو صحت 'تعلیم اور دوسرے دو محکمے تفویض ہوئے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی تحریک پاکستان اور آزادی کے بعد کی سیاسی صورتحال سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔خصوصاً پنجاب کے علمی' ادبی' تعلیمی اور سیاسی اداروں' واقعات اور ان کے حوالے سے چھوٹی بڑی شخصیات سے ذاتی وشخصی تعلق اور واقفیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً شیخ نسیم حسن مرحوم سے ان کا دور ونزدیک کی رشتہ داری کے علاوہ قریبی رابطہ بھی رہتا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول عزت مآب جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ گورنمنٹ کالج میں ان سے دو سال جونیئر ہوا کرتے تھے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ''غالب سے متعلق ن۔م راشد کی دو یادگاریں'' نامی تحریر مکرر تیسری بار ''بازیافت غالب'' میں شائع کی ہے۔اس میں شیخ نسیم حسن مرحوم کے حوالے سے ترمیم یہ کی ہے کہ راشد کے ''اداریہ' راوی' لاہور' فروری 1932ء' ص 1'' کے بعد اپنی وضاحت کا ابتدائی حصہ ''یہاں اس امر کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ 1932ء کے مسٹر نسیم حسن'' 1998ء کے ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر نسیم حسن شاہ ہیں جو'' اڑا دیا ہے۔اب ''مئی جون 1934ء تک راوی کے مدیر رہے'' سے قبل ''نسیم حسن'' جوڑ دیا ہے۔اسی طرح حاشیہ نمبر 4 میں دو جگہ نسیم حسن کا لاحقہ شاہ اڑا دیا ہے اور حاشیہ 12 کو ''ن۔م راشد کے ایک ممتاز معاصر نسیم حسن: نامور ایڈووکیٹ' تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا۔گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر

کے مشیر رہے'' میں بدل دیا ہے۔

اس کتاب کے پہلے حصہ ''چند غالبیاتی متعارفات'' کی فہرست میں پانچویں نمبر پر ''غالب پر رفیق خاور کی گم گشتہ نگارشات'' کا نام آتا ہے۔ یہ ''دو تحریریں'' غالب پر رفیق خاور کی دو قدیم تحریریں۔65 برس پرانی نگارشات کی بازیافت۔متعارفہ انبساط امین عباسی کی سرخیوں کے ساتھ زیر نظر کتاب کے صفحہ 65 پر چھپی ہیں۔

ان تحریروں کا تین سطری تعارف یا تمہید ''ان گھڑ'' اور بے جوڑ انداز میں شروع ہوتی ہے۔ تعارف کا خاتمہ بھی کم و بیش انہی لفظوں میں ہوتا ہے۔ قابل ذکر اور ضروری فراموش تحریروں کی بازیافت اچھی بات ضرور ہے' کوئی انوکھی بات نہیں رہی۔ اب تو دنیا بھر میں مشہور اخبارات و رسائل کے پچاس/سو سال کے فائل ری پرنٹ ہو رہے ہیں۔ محض اسی بنا پر کسی تحریر کو قابل اعتنا سمجھ لینا کہ ستر برس پرانی ہے' بے معنی سی بات ہے۔

محترمہ انبساط امین عباسی کے اس متعارفہ میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا کیا حصہ ہے؟ اس بحث سے ہمیں کوئی سروکار نہیں البتہ اس متعارفہ کی کوتاہیوں اور غلطیوں کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب پر ہی عائد ہوگی۔ اس کا مواد اور معلومات ان کی فراہم کردہ ہیں۔ اگر تحریر ان کی نہیں بھی تو ان کا قلم ضرور لگا ہوا ہے۔ تحریر کی تکمیل پر انہوں نے نظر ثانی کی ہوئی ہے اور ''ماہ نو'' مارچ 1998ء میں اشاعت کا انہوں نے اہتمام کیا۔ ''بازیافت غالب'' ان کی (مصنفہ نہیں) مرتبہ ہے۔ اس حوالے سے بھی غلطی کی اصلاح ان کا فرض تھا۔

رفیق خاور مرحوم کے تعارف کا آغاز اس فقرہ سے ہوتا ہے:

''میاں محمد رفیق حسین خاور'''' باغبانپورہ'' لاہور کی معروف میاں فیملی کے چشم و چراغ تھے۔ وہ ڈاکٹر تصدق حسین خالد اور ڈاکٹر محمد صادق کے چھوٹے بھائی تھے۔ رفیق خاور 15 فروری 1908ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔۔۔'' (''بازیافت غالب'' صفحہ 65)

یاد رہے رفیق خاور کا آبائی شہر بٹالہ مشرقی پنجاب تھا۔ ان کا باغبانپورہ لاہور یا وہاں کی میاں (ارائیں برادری) فیملی سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا کیونکہ وہ بٹالہ کی راجپوت برادری کے فرزند تھے۔ ان کی جائے پیدائش بھی غلط بتائی گئی ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا اس کتاب میں ایک بیان متنازعہ ہے۔ ہماری یادداشت اور اطلاعات کے مطابق ان کا یہ بیان قابل قبول نہیں ہے۔ انہوں نے ''بازیافت غالب'' میں پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کا ایک مشہور مضمون بیگم مرزا غالب کی کہانی (نشریہ' لاہور ریڈیو' 23 اپریل 1942ء) شامل کیا ہے۔ وہ اس کی ڈیڑھ صفحے کی تمہید میں لکھتے ہیں:

''پروفیسر حمید احمد خاں (ولادت لاہور 1903ء۔ وفات لاہور 1973ء) کی پہلی برسی کے

موقع پر 1974ء میں مجلس یادگار حمید احمد خاں کی فرمائش پر میں نے ''غالب ۔۔۔ شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے حمید احمد خاں کی تحریروں پر مبنی ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں ان کی 1929ء سے 1970ء تک کی نگارشات شامل ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے جناب احمد ندیم قاسمی نے قبول کی'' صفحہ 89

''مجلس یادگار حمید احمد خاں کے ایک اجلاس میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کتاب پر دیباچہ لکھنے کی پیش کش کی جو میرے لیے اعزاز کی بات تھی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا دیباچہ/ مضامین کا تجزیہ ان کی کتاب ''اطرافِ غالب'' (طبع دوم لاہور 1979ء) میں شامل ہے۔ غالب کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خاں کے مضامین کے مجموعے کا مسودہ مرحوم کے بیٹے سعید احمد خاں نے مجھ سے دیکھنے کے لیے لیا' یہ پچھلے چوبیس برس سے ان کی تحویل میں ہے۔ وہ اسے دیکھ لینے کے لیے وقت نہیں نکال پا رہے۔ وہ اسے دیکھ چکیں تو کتاب کی طباعت و اشاعت کا مرحلہ آئے! یہ ایک الگ سوختن کا باب ہے۔'' صفحہ 90

جناب سعید احمد خاں نے اپنے مرحوم والد گرامی کی غالب پر تحریروں کا مجموعہ ''مرقع غالب'' کے نام سے فروری 2003ء میں بہت خوبصورت انداز میں مجلس ترقی ادب کے توسط سے شائع کروایا اور اس کے شایانِ شان تعارفی تقریب کا 28 فروری 2003ء کو پرل کونٹی نینٹل ہوٹل لاہور میں انتظام و اہتمام کیا جس میں نیاز مندانِ حمید احمد خاں نے بھرپور شرکت کی مگر اس میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن تشریف نہ لائے جبکہ مجلس یادگار حمید احمد خاں کی طرف سے مدعو کنندہ سید انور وقار عظیم تھے۔ فطری طور پر اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کا بہت ذکر رہا۔ مختلف لوگوں سے بار بار سنا کہ ڈاکٹر صاحب پروفیسر حمید احمد خاں کا غالب پر مبنی مضامین کا مسودہ واپس نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے خاص انداز میں جا و بے جا اور جگہ جگہ اپنے نام سے یوں حواشی چڑھا رکھے تھے کہ حمید احمد خاں مرحوم کی حیثیت ثانوی ہو گئی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے پچیس برسوں (1974ء تا اشاعت ''بازیافتِ غالب'' 1999ء) میں حمید احمد خاں جیسے اپنے محسنِ عظیم کے لیے ''تحقیق نامہ'' کا کوئی گوشہ مختص نہ کیا جس طرح کالی داس گپتا رضا وغیرہ کے نمبر نکالے۔ رشید احمد صدیقی مرحوم اور پروفیسر سید وقار عظیم کا جس طرح ذکر اذکار کیا ان سب کے ساتھ خاں صاحب مرحوم نظر نہیں آتے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے پروفیسر خاں صاحب مرحوم کو تو ''جہانِ اقبال'' جیسی کتاب مرتب اور شائع کرنے پر یاد نہ رکھا۔ اچانک ''بازیافتِ غالب (1999ء)'' میں خاں صاحب کا مضمون امراؤ بیگم اور ان کے اس مضمون کے خطی مسودہ کی فوٹو شائع کی۔ یہ پروفیسر حمید احمد خاں کے مسودہ کی بازیابی کے لیے سعید احمد خان کے تقاضا کا نتیجہ اور حاصل معلوم ہوتا ہے۔ راقم نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مسودہ واپس کرنے پر غیر آمادگی کا بیان بلا تامل قبول کر لیا۔ کیوں؟ اس کا ایک پس منظر ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی طبیعت اور فطرت کی ایک خصوصیت بہت نمایاں ہے جسے معاشرتی اور

اخلاقی حوالے سے ایک سلبی خصوصیت کہنا پڑتا ہے۔ وہ Maniac Possesive ہیں۔ اُن کا بس چلے تو کسی کے پاس کوئی کتاب نہ رہے اور کوئی کتاب ان کے نام کے بغیر نہ چھپے۔ وہ Compulsive book graber ہیں۔ کتاب کو جھپٹ کر اپنے مخزونہ میں ڈال لینا ان کا شیوۂ خاص ہے۔ اپنے ذاتی تجربات میں سے صرف تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔

1۔ 75-1974ء کے ایک دن لائل پور میں میں اور ڈاکٹر صاحب' گھر کی طرف رواں تھے۔ میں نے باتوں میں ذکر کر دیا کہ میرے پاس ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کا پی ایچ ڈی کا مطبوعہ مقالہ ''حالی بحیثیت شاعر'' ہے۔ اسی وقت میرے ساتھ میرے مکان پر پہنچے اور کتاب لے گئے۔ مجھے چھ برس بعد اس کتاب کی ضرورت پڑی۔ میں نے ان سے کتاب کا مطالبہ کیا تو فرمایا۔ میری ایک طالبہ نے اپنے تھیسس اسائنمنٹ کے لیے لی تھی اور گم کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ ان کا ارشاد درست نہیں مگر میں ایک کتاب کے لیے کیا بے مروتی کرتا' خاموش ہو رہا۔ 1981ء میں موصوف نے لاہور تبادلہ کے ڈیڑھ دو سال بعد شعبہ کے دو چار رفقا کو شاید پہلی اور آخری بار اپنے مکان کی تکمیل پر چائے پر بلایا۔ کچھ رسائل' تھیسس اور کتابیں وغیرہ بھی برآمدے میں نمائش کے لیے ترتیب دیں۔ میں نے حالی پر تھیسس اٹھا کر اس کی جلد پلٹی۔ اندر حالی بحیثیت شاعر کے ٹائٹل کی فوٹو سٹیٹ کاپی لگی تھی۔ اس صفحہ کے اوپر بائیں کارنر میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ملکیتی دستخط تھے۔ یہ بھی کیسی بات ہے۔ مستعار کتاب پر کوئی ملکیتی دستخط کرے۔ میں اس صورت حال سے بے حد آزردہ ہوا' ایک ساتھی کو دکھا کر کچھ وضاحت کی مگر جو آدمی Involve نہ ہو وہ معاملے کی شدت اور گہرائی کو محسوس نہیں کر سکتا۔ میں اس رنج گراں سے برسوں دل کو بوجھل کرتا رہا اگر موصوف مجھے اشارۃً بھی کہہ دیتے تو میں کئی دوسرے رسالوں اور کتابوں کی طرح انہیں پیشکش کے الفاظ لکھ کر یہ کتاب پیش کر دیتا۔ اس واقعہ سے دو تین برس قبل ایسا ہی ایک واقعہ ہو چکا تھا۔ پہلے وہ سن لیجیے اس کے بعد ''حالی بہ حیثیت شاعر'' کے قصہ کا انجام لکھوں گا۔

راقم ڈاکٹر معین الرحمٰن کے لائل پور میں بحیثیت پروفیسر آنے سے پہلے ہی وہاں ایم اے کو داستان' ناول اور اقبال پڑھا رہا تھا۔ اُس زمانے میں صرف ایک داستان ''باغ و بہار'' نصاب میں شامل تھی۔ میں نے اس کے پس منظر اور تقابلی مطالعہ کے لیے ''نوطرز مرصع'' کی تلاش شروع کی جو مجھے اپنے ایک دوست (محمد اکرام چغتائی) سے مل گئی۔ میں 1975ء میں تبادلہ کروا کر گورنمنٹ کالج لاہور چلا آیا۔ 75 اور 78 کے درمیان کسی ایک سال پنجاب یونیورسٹی کے اردو بورڈ آف اسٹڈیز نے ایم اے کے نصاب میں کچھ تبدیلیاں منظور کیں۔ ''فسانہ عجائب'' کا پہلے ہی اضافہ ہو چکا تھا۔ اب ''نوطرز مرصع'' بھی پہلے پرچہ (داستان' ناول' افسانہ) میں شامل تو کر دی گئی مگر ٹیکسٹ (کتاب) کہیں دیکھنے تک کے لیے موجود نہ تھی۔ ڈاکٹر انور محمود خالد کو اس کا میرے پاس ہونا معلوم تھا۔ وہ مجھ سے لے گئے کیونکہ اب وہ گورنمنٹ کالج لائل پور میں یہ پرچہ پڑھا رہے تھے۔ ہمارے ہاں لاہور میں ابھی ایم اے کلاسز کا اجرا نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر انور محمود خالد

سے ڈاکٹر عبیداللہ خان صاحب نے یہ کتاب مستعار لی۔ خان صاحب سے ڈاکٹر معین مانگ کر لے گئے۔ ان لوگوں کے درمیان کتاب کا ایک اور راؤنڈ ہوا۔ آخری بار کتاب ڈاکٹر معین الرحمٰن کے قبضہ میں تھی' اتنے میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا لاہور تبادلہ ہوگیا۔ ڈاکٹر انور محمود خالد نے کتاب کا چند ماہ انتظار کرنے کے بعد واپسی کا تقاضا کیا تو سید صاحب نے فرمایا میں نے اورینٹل کالج کے ٹائپسٹ شبیر بٹ کو رجسٹری کرنے کے لیے دی تھی۔ خالد صاحب نے کہا چلیے میں ڈاک خانہ میں انکوائری کروالیتا ہوں' رسید دیجیے۔ اب رسید ہو تو وہ دیں۔
ڈاکٹر انور محمود خالد ان کے پبلشنگ ہاؤس (الوقار) کی ان کے آغاز کار سے ہی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ وہ میٹنگوں اور شادیوں میں ان سے ملتے ہیں مگر خطوں اور فون پر گزشتہ بائیس برس سے ''نوطرز مرصع'' کی واپسی کا مطالبہ دہرائے چلے جا رہے ہیں کیوں کہ ہم دونوں کو یقین ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کتاب دبا رکھی ہے۔ کیوں؟ ہم ان کے لیے یہ کتاب اپنے عزیز دوست سے ان کے لیے مستقلاً مانگ سکتے تھے تاہم مجھے بھی انتظار ہے کہ کتاب آئے تو میں اپنے اس مہربان دوست کو پہنچاؤں جس نے تیس برس میں ایک بار بھی کتاب نہیں مانگی۔ میں کسی بھی قیمت پر کتاب خرید کر انہیں لوٹانا چاہتا ہوں۔ یہ میرے ضمیر کا معاملہ ہے۔ مجھے مر کر بھی کتاب واپس کرنے کا خیال ستاتا رہے گا۔ بہرحال ہم دو چار دوستوں [ڈاکٹر تبسم کاشمیری' ڈاکٹر انور محمود خالد' پروفیسر محمد جہانگیر عالم' راجا فاروق حسن (مانٹریال)] کی کتابیں بیس پچیس برسوں سے ایک دوسرے کے ہاں پڑی ہیں۔ معلوم ہے جس دن اشارہ کریں گے کتاب واپس آجائے گی۔ اسی طرح ہم ایک دوسرے کی جتنی کتابیں چاہیں لے جاتے ہیں' جب جی چاہتا ہے واپس کر دیتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بدنیت نہیں ہوتا۔

مجھے پھر ایک دن ذرا سی دیر کے لیے ''حالی بہ حیثیت شاعر'' دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اپنی مجبوری اور سید معین الرحمٰن کی سینہ زوری پر کسمسا کر رہ گیا۔ اس غاصبانہ رویے پر غصہ بھی آنا شروع ہوگیا۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ کیا ایک بڑے رتبہ و منصب کے مالک آدمی کو اپنی ''بے معنی ہوس'' پر بھی اختیار نہیں' وہ اس سے زیر ہو کر اپنے ایک قریبی معتمد سے دغا کرتا ہے۔ اُس کا اپنے مکرنے اور جھوٹ بولنے سے اعتماد کھوتا ہے۔ ہم جو اپنے دوستوں' عزیزوں کی سینہ ٹھونک کر قسم کھاتے ہیں' ایسے ناقابل اعتماد شخص کی تو گردن جھکا کر بھی قسم نہیں کھائی جاسکتی۔ اس کتاب کی کیا حقیقت اور کیا حیثیت' سید معین الرحمٰن خوب جانتے ہیں ان کے ممدوح پروفیسر افتخار احمد چشتی کے برادران میرے ایف اے کے زمانہ طالب علمی میں اپنا سکول منظور کروانے کے لیے میری ساڑھے چھ سو کتابیں لے گئے جو کبھی واپس نہ آئیں۔

بیسیوں لوگ سی ایس ایس' پی ایچ ڈی' ایم فل' ایم اے وغیرہ کے امتحانات دینے یا مقالات وغیرہ لکھنے کے لیے سینکڑوں کتابیں مجھ سے لے گئے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ لڑکی کی طرح کتاب گھر سے نکل جائے' اول تو واپس نہیں آتی' آ ہی جائے تو داغ دار اور بدن دریدہ آیا کرتی ہے۔ صاحب موصوف کی بدعہدی' بدنیتی' خیانت اور غصب شدہ کتاب کی یاد نے ناسور کی شکل اختیار کر لی۔ بے وجہ قرار آنے کی کوئی صورت نہ

نکلی۔ جب نیس الحتی میں انہیں یاد کرا دیتا کہ مجھے کتاب واپس کر دیں۔ میری ریٹائرمنٹ کے چار پانچ برس بعد ڈاکٹر سلیم اختر سے سنگ میل پر ملاقات ہوئی۔ وہ رخصت ہونے لگے تو پتہ چلا کہ کالج جا رہے ہیں۔ میں نے کہا اپنے صاحب سے کہنا میری کتاب لوٹا دیں۔ انہوں نے کہا یہی بات مجھے لکھ کر دے دو۔ میں نے ایک ردی کاغذ کے پرزے پر دو فقروں میں پیغام تحریر کر دیا۔ اگلے دن ڈاکٹر سلیم اختر نے فون پر بتایا کل تمہاری کتاب آ جائے گی۔ تین چار دن بعد انہوں نے کہا میں کتاب گھر پر لے آیا ہوں۔ کسی دن آؤ' کتاب لے جاؤ! میں نے کہا اُس پنجہ آہنی سے نکل آئی' تمہارے پاس ہے سمجھو مجھے مل گئی ہے۔ میں تین چار ماہ بعد فرصت سے ایک دن ڈاکٹر سلیم اختر کے ہاں گیا اور کتاب لے آیا' ڈسٹ کور غائب تھا اور اندر ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ملکیتی دستخط قینچی سے کاٹ لیے گئے تھے۔ خدا کرے ''نوطرز مرصع'' جو میرے پاس ایک دوست کی امانت تھی' میری اس جہاں سے رخصتی کے بعد انہیں لوٹا دیں۔ کتاب پر اُس مہربان دوست کے دستخط موجود ہیں اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔

1990ء کے گرد و پیش کے سالوں میں متذکرہ دونوں کتابوں کا اندر ہی اندر قصہ چل رہا تھا کہ مجھے ایک شام انار کلی میں رانا جاوید کے باہر والے سٹال سے ایک کتاب غالباً ''حیات غالب'' از شیخ محمد اکرام ملی۔ جس کو انٹر لیف کروا کر جلد کروائی گئی تھی۔ کہیں کہیں پنسل سے فقروں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ شاید کچھ فقروں پر خط تنسیخ بھی کھینچا گیا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ شیخ محمد اکرام صاحب کا ذاتی نسخہ ہے اور انہی کا سواد خط ہے۔ میں اپنے گھر رات نو بجے کے قریب پہنچا۔ اس یافت سے مسحور تھا' اس کتاب کے غصب ہونے کے اندیشے اور امکان کو اپنے دل سے پرے رکھتے ہوئے میں نے فون پر ڈاکٹر معین الرحمٰن سے کتاب کے کوائف کہہ دیے۔ ان دنوں میری رہائش گاہ راج گڑھ چونگی سے چند گز آگے مین سانده روڈ پر واقع تھی اور ان کا مکان ایم اے او کالج کے پہلو میں واقع ہے۔ وہ آٹھ نو منٹ میں میرے مکان پر پہنچ گئے۔ وہ میرے پاس پندرہ منٹ ٹھہرے' کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی' کتاب ہاتھ میں لے کر رخصت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے میں اور آگے لان عبور کر کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ باہر قدم رکھتے ہی کتاب ہوا میں لہرا کر کہا: ''تو ٹھیک ہے' اس کا انتساب آپ کے نام رہے گا۔'' میں حیران اور ششدر سڑک پر کھڑا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو کوستا ہوا گھر کے اندر آیا۔ اُس دن کے بعد میں نے آج تک اس کتاب کی شکل نہیں دیکھی اور موصوف نے بھی اشارۃً بھی اس کا نام نہیں لیا۔ میں جب کہیں سید صاحب کی مدحت بیان کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جاؤں تو یہ واقعہ بھی بیان کر دیا کرتا ہوں۔

''سوانحی خاکہ۔۔۔'' میں ''تصنیفات و تالیفات' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن'' کے ذیلی عنوانات بسلسلۂ غالب کا شمار 16: منتخب کلام غالب (انگریزی ترجمہ مطلوب الحسن سید) 1999ء۔ 2000ء درج ہے۔ (دیکھیے ''دل کی کتاب'' صفحہ 397)

حقیقت یہ ہے کہ زیرِ حوالہ کتاب سید معین الرحمٰن کی تصنیف ہے اور نہ تالیف۔ راقم یہ دعویٰ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج کے تحقیقی مجلہ ''تحقیق نامہ'' شمارہ 8 بابت 99-1998ء کے مطالعہ کی روشنی میں کر رہا ہے۔ یہ شمارہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ سب سے پہلے متذکرہ کتاب اس مجلہ (شمارہ 8) کے غالب جزو (دوسرا حصہ) کے طور پر شائع ہوئی تھی۔ اس شمارہ کا پہلا حصہ صفحہ 96 پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا حصہ از سرِ نو صفحہ نمبر ا سے شروع ہوتا ہے۔ یہ صفحہ ایک کتاب کے ٹائٹل کے طور پر ڈیزائن کیا گیا ہے۔ دیکھیے:

منتخب کلامِ غالب

(نسخۂ طارق زیدی)

انگریزی ترجمہ اور توضیحی اشارے:

مطلوب الحسن سید

متعارفہ:

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

1999ء

اس دوسرے حصے کا خاتمہ صفحہ 186 پر ہوتا ہے۔ ان 186 صفحوں کے ڈیزائن اور سیٹنگ سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ صفحات بعد میں ''تحقیق نامہ'' سے الگ کر کے ایک قائم بالذات کتاب بنانے کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ ''دل کی کتاب'' کی شہادت کے پیشِ نظر اس ''منتخب کلامِ غالب (انگریزی)'' کی 2000ء تک تین بار اشاعت ہو چکی ہے۔ پہلی بار 1998ء میں مجلہ ''تحقیق نامہ'' شمارہ 8 کے دوسرے حصہ کے طور پر، دوسری اور تیسری بار 1999ء اور 2000ء میں کتابی شکل میں الوقار پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اس کتاب کے دیباچہ بعنوان ''حرفے چند'' میں لکھا ہے:

''میرے عزیز رفیقِ کار سید طارق حسین زیدی کا مطلوب الحسن سید (سوانح نگار قائدِ اعظم محمد علی جناح) اور ان کے گھرانے سے قریبی رشتہ اور ربط ہے۔ کسی سعد گھڑی اُن کی زبانی سنا تھا کہ مطلوب الحسن سید صاحب نے غالب کے اردو دیوان کا منظوم انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ شاید اُن کے ذخیرے میں نکل آئے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی جب بالآخر ایک روز یہ مخفی دولت انہوں نے میرے حوالے کی۔''

(''تحقیق نامہ'' شمارہ 8 (حصہ دوم) صفحہ 9)

دیباچہ نگار اور منتخب کلامِ غالب (انگریزی) کے متعارف کنندہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے پروفیسر طارق زیدی کا اس سے زیادہ کہیں ذکر نہیں کیا ہے کہ انہوں نے ''یہ مخفی دولت'' پروفیسر زیدی سے کن شرائط پر وصول کی۔ خود زیدی صاحب نے اس ضمن میں کچھ نہیں کہا۔ مطلوب الحسن سید پر افسوسناک حد تک مختصر نوٹ

بعنوان ''کچھ مطلوب الحسن کے بارے میں'' قلمبند کیا ہے اور یہ بھی کہیں نہیں لکھا کہ انہوں نے مطلوب مرحوم کے قانونی مختار سے اس ترجمہ کی اشاعت کی اجازت لی تھی یا نہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے حسب عادت غالب کا یہ ترجمہ زیدی صاحب کے ہاتھوں سے اچک لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے مخزونہ اور تصنیفات و تالیفات میں کس طرح اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمن کی بحیثیت صدر شعبہ 'سرپرتی' بزرگی' سیناری اور سیر چشمی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے نوجوان ماتحت کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں ترجمہ پر ایک سیر حاصل تعارف اور مقدمہ قلم بند کرنے کے لیے کہتے اور اس کتاب کو ان کی پہلی کیشن کے طور پر چھپواتے۔ شاید کبھی ان کے CV میں بھی کام آجاتا۔

ایک کتاب بعنوان ''بازیافت غالب'' بھی ایک ایسی ہی مثال ہے۔ یہ کتاب بھی ان کی دوسری کتابوں خصوصاً ''تحقیق نامہ'' اور ''تحقیق نامہ غالب'' میں مطبوعہ تحریروں سے مرتب کی گئی ہے۔ تفصیل دیکھیے:

1۔ حیات غالب کا ایک حساس باب نادر انگریزی مآخذ: 1878ء ''بازیافت غالب'' 1999ء' صفحہ 13

2۔ غالب پر انیسویں صدی کی اہم تحریر 1۔ ''بازیافتِ غالب'' 2۔ ''تحقیق نامہ'' شمارہ 6-7 ص 291'
3۔ ''تحقیق نامہ' غالب'' ص 291

3۔ میر مہدی مجروح پر ایک نایاب مضمون 1۔ ''بازیافتِ غالب''

4۔ غالب کی غزل پر ایک قدیم خمسہ متعارفہ: انبساط عباسی 1۔ ''بازیافتِ غالب'' 2۔ ''تحقیق نامہ'' 6-7 ص 309' 3۔ تحقیق نامہ' غالب ص 309

5۔ غالب' رفیق خاور کی گم گشتہ نگارشات 1۔ ''بازیافتِ غالب'' 2۔ ''ماہِ نو'' خصوصی اشاعت غالب' مارچ 1998ء ص 66' (بحوالہ 'بازیافت غالب'' ص 164)

6۔ غالب سے متعلق ن۔ م راشد کی دو یادگاریں متعارفہ: معین الرحمن 1۔ ''بازیافتِ غالب'' 2۔ ''تحقیق نامہ'' 6-7 ص 312' 3۔ تحقیق نامہ' غالب ص 312

7۔ بیگم مرزا غالب کی کہانی حمید احمد خاں کی زبانی 1۔ ''بازیافتِ غالب'' 2۔ ''علی گڑھ میگزین'' غالب نمبر 1948-49ء' 3۔ ''احوال غالب'' مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد 1953ء

8۔ غالب کے بارے میں آفتاب احمد خاں کی پہلی تحریر 1۔ ''بازیافتِ غالب''

9۔ غالب کا ایک دور بینی مطالعہ از جمیل الدین عالی 1۔ ''بازیافتِ غالب'' [ڈاکٹر معین الرحمن اسے 30 سال پرانی تحریر قرار دیتے ہیں مگر ماخذ نہیں بتایا۔ اخباری کالم معلوم ہوتا ہے]

حصہ دوم: کچھ اشاریاتی مطالعات غالب

10۔ رسالہ ''ماہِ نو'' کا جزوی اشاریہ غالب 1948-1997ء) 1۔ ''بازیافتِ غالب'' ص 139' 2۔ ''ماہِ نو''

مارچ 1998ء [بحوالہ ''بازیافت غالب'' ص 163' 164' ''ماہ نو'' دو صد سالہ جشن ولادت (غالب)]

11۔ غالب پر ''ماہ نو'' کا انتخاب (1997ء تک) 1۔ ''بازیافت غالب'' ص 159' 2۔ ''تحقیق نامہ'' 6-7 ص 166' 3۔ ''تحقیق نامۂ غالب'' ص 166

12۔ ''ماہ نو'' کی تازہ اشاعت غالب مارچ 1998ء (صفحہ 137 پر فہرست کے مطابق عنوان)

1۔ ''بازیافت غالب'' ص 163 (ضخامت دو صفحے) (یہاں عنوان: ''ماہ نو'': خصوصی اشاعت غالب' مارچ 1998ء) ہے)

13۔ رسالہ ''راوی'' لاہور ''غالب نما'' 1948ء تا 1977ء 1۔ ''بازیافت غالب'' ص 165' 2۔ ''تحقیق نامہ'' 6-7 ص 158' 3۔ ''تحقیق نامہ غالب'' ص 158

14۔ ''راوی'' کا تازہ شمارہ غالب مئی 1998ء [بمطابق فہرست ص 137۔ صفحہ 173 پر عنوان: رسالہ ''راوی'': ''غالب نما'' (شمارہ غالب 1998ء)

15۔ غالبیات فرمان فتح پوری' ایک اشاریہ 1997ء (بمطابق فہرست صفحہ 137۔ 177 عنوان: غالبیات فرمان کا اشاریہ مرتبہ: عاصمہ وقار' 1۔ ''بازیافت غالب'' ص 177' 2۔ ''تحقیق نامہ'' ص 176' 3۔ ''تحقیق نامہ غالب'' ص 176

16۔ تالیفات گیتا رضا۔ اشاریہ نما: 1997ء (مرتبہ: ندرت سجاد) 1۔ ''بازیافت غالب'' ص 189' 2۔ ''تحقیق نامہ'' ص 244' 3۔ ''تحقیق نامہ غالب'' ص 244

17۔ گیتا رضا کی دو غیر مطبوعہ تالیفات (ڈاکٹر معین الرحمٰن) 1۔ ''بازیافت غالب'' ص 195' 2۔ ''تحقیق نامہ'' ص 271' 3۔ ''تحقیق نامہ غالب'' ص 271

18۔ گیتا رضا کا ذخیرہ غالبیات اور غالب شناسی (عظمت رباب) 1۔ ''بازیافت غالب'' ص 203' 2۔ ''تحقیق نامہ'' 6-7 ص 279' 3۔ ''تحقیق نامہ غالب'' ص 279

19۔ غالب پر 1969ء سے 1928ء تک کی مطبوعہ کتابیں (بمطابق فہرست ص 137۔ ''بازیافت غالب'')

20۔ ایک غالب سیمینار اور نمائش کتب دسمبر 1977ء متعارفہ: انبساط امین عباسی ''بازیافت غالب'' صفحہ 236

سوانحی خاکہ۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن مرتبہ: انبساط امین عباسی' کے اندراج بسلسلۂ غالب میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی دو تصنیفات ''غالب آشنائی'' اور ''غالب: جہات و جستجو'' زیر طبع بتائی گئی ہیں۔ انھیں بازار میں بھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ گزشتہ صفحات میں موصوف کے انداز تحقیق اور معیار تحقیق کے پیش نظر ان زیر طبع کتابوں میں بھی قابل ذکر کام کی توقع نہیں ہو سکتی۔

سوانحی خاکہ میں بسلسلۂ غالب کے بعد بسلسلۂ بابائے اردو کے ذیل میں چھ کتابوں کے نام

سنین اشاعت درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصنیف نہیں ہے۔ ساری کتابیں دوسروں کے مضامین یا مولوی عبدالحق کے اقتباسات پر مبنی ہیں۔ ان میں اعادہ اور تکرار بھی ہے۔ مثلاً ''بابائے اردو۔ احوال وافکار'' اور ''فرمودات عبدالحق'' مرتبہ کتابیں ہیں جواب تیسری کتاب بعنوان ''بابائے اردو۔ خدمات اور فرمودات'' میں جمع کردی گئی ہیں۔ ''فرمودات عبدالحق'' کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب آمنہ صدیقی (بیگم مشفق خواجہ) کی کتاب ''افکار عبدالحق'' (1962ء) کا چربہ ہے۔ اسی طرح ''ذکر عبدالحق'' ایک مغالطہ انگیز کتاب ہے۔ سوانح نگاری ایک ایسا نازک اور حساس فن ہے جو مختلف علوم کے گہرے مطالعہ' مشاہدے' تجربہ' انتخابی صلاحیت' تجزیہ وتحلیل' تحقیق وتنقید کے امتزاج وادغام سے وجود میں آتا ہے۔ سوانح عمری اور آپ بیتی محض واقعہ نگاری نہیں ہے۔ یہ ایک شخص کے داخلی اور خارجی مشاہدات' تجربات' احساسات' جذبات اور تعلقات ومطالعات کا کسی زمانی سیاق وسباق میں تجزیہ وتحلیل کا بصیرت افروز اور فرحت بخش خلاصہ اور بیان ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ''ذکر عبدالحق'' اور ''آپ بیتی رشید احمد صدیقی'' ان خصائص اور شرائط سے عاری ہیں۔ رشید احمد صدیقی اور مولوی عبدالحق سے محبت اور عقیدت سوانح عمری اور آپ بیتی کے فنی لوازم کے جائزے میں حارج ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں راقم ''ذکر عبدالحق'' پر اپنے مضمون کو بطور مثال پیش کرتا ہے جو محض مصنف کے ساتھ پرتکلف تعلقات' مروت اور موضوع شخصیت کے سامنے اپنے حاسۂ انتقاد کو معطل کرتے ہوئے جوش وجذبہ' زور بیان' تازگی' زبان اور اظہار کے خلوص کو بروئے کار لانے کا حاصل ہے۔ ایسے مضامین پڑھ کر مبتدی اور نوآموز یقیناً گمراہ ہوں گے۔ ان دونوں کتابوں کی غیر مشروط تعریف وتوصیف بہت ہو چکی اب ان کی Critical Evaluation کی ضرورت ہے۔

''یادگار عبدالحق'' کے پہلے دو مضمون اعادہ وتکرار ہیں۔ دوسرے حصہ میں عبدالحق کے بارے میں پانچ انٹرویو ہیں اور آخری حصہ کا عنوان ہے ''تبرکات حق (بابائے اردو کی نادر تحریریں) یہ تحریریں بھی کئی بار چھپ چکی ہیں۔

ایک کتاب ''مجموعہ مطالعات عبدالحق'' 1008 صفحات پر مشتمل ہے۔ جو باستثنا ''یادگار عبدالحق'' متذکرہ کتابوں پر محیط ہے۔ اس میں مشمولہ کتابیں سراسر مرتبہ ہیں۔ اُن مرتبہ کتابوں کا مجموعہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تصنیف کیسے ہوسکتا ہے مگر کتاب کی جلد پر اور اندرونی ٹائٹل پر موصوف کا اسم گرامی بحیثیت مصنف ہی درج ہے۔ ''تصنیفات وتالیفات' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن'' کے عنوان کے ساتھ بسلسلۂ اقبال اور سید وقار عظیم' بسلسلۂ رشید احمد صدیقی اور یلدرم' دیگر متفرق تالیفات اور تصنیفات' بسلسلہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے ذیل میں درج 33 کتابیں واضح طور پر متعلقہ اصحاب کی تصانیف ہیں۔ انہیں ''سوانحی خاکہ۔۔۔'' کی مرتبہ نے بلاجواز بلکہ ناجائز طور پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے نام سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن اور عزیزہ انبساط امین عباسی کو ''بسلسلۂ'' کی معنوی دلالت پر غور کر لینا چاہیے۔ یہاں بسلسلۂ کے تحت اُن

کتابوں کی فہرستیں ہونی چاہیے تھیں جو سید وقار عظیم' رشید احمد صدیقی اور یلدرم وغیرہ پر لکھی گئی ہیں۔

ادبی تخلیق کی طرح ادبی تحقیق و تنقید ایک خود مکتفی اور آزاد عمل نہیں ہے۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے کام عام طور پر تعلیمی اداروں کے شعبہ ہائے ادب کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ ادب کے ان دونوں ذیلی شعبوں کی ترقی اور فروغ مختلف اسباب کی بنا پر تعلیمی اداروں کے شعبہ ہائے ادب سے وابستہ ہو گیا ہے۔

پاکستان میں اردو ادب اور اقبالیات کے حوالے سے یونیورسٹیوں' کالجوں' تعلیمی اور علمی اداروں میں فنِ تحقیق' تحقیقی مسائل' تحقیق کے نظری اور عملی پہلوؤں پر کتب و رسائل کی اشاعت کا بہت چرچا ہے۔ جب سے گورنمنٹ نے ایم فل اور پی ایچ ڈی اساتذہ کے لیے خصوصی الاؤنس شروع کیا ہے اور صوبائی اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے علاوہ پرائیویٹ اداروں نے مختلف گریڈ کے اُن امیدوار اساتذہ کو ترجیح دینا شروع کیا ہے جو پوسٹ ماسٹر ڈگری کے حامل ہوتے ہیں' اس وقت سے ایم فل اور پی ایچ ڈی ڈگریوں کے حصول کے لیے ہر ورکنگ ٹیچر نے سر توڑ کوششیں شروع کر رکھی ہیں۔ 1987ء سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبوں خصوصاً شعبہ ادبیات اور شعبہ اقبالیات نے درجنوں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا کی ہیں۔ بہت سی دوسری یونیورسٹیوں سے بھی خاصی تعداد میں یہ ڈگریاں ارزانی ہوئی ہیں۔ گزشتہ تین چار برس سے پنجاب یونیورسٹی' جی سی یونیورسٹی لاہور اور پنجاب کی دوسری یونیورسٹیوں کے کم و بیش ہر مضمون میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی باقاعدہ کلاسز کا بھی اجراء ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں سے اردو ادب کے حوالے سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر مقالات کی تکمیل اور ڈگریاں عطا کیے جانے کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں سے متذکرہ ڈگریوں کے لیے منظور ہونے والے بعض تحقیقی مقالے چھپ کر بازار میں بھی آ جاتے ہیں۔ اردو کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ امتحانی تحقیقی مقالات کے معیار کے بارے میں عمومی طور پر علمی حلقوں میں عدم اطمینان پایا جاتا ہے۔ ان مقالات کی تحقیق کے ناقص اور غیر معیاری پہلوؤں پر تبصرہ میں تعلیم کے عمومی انحطاط' طالب علموں کی تعلیمی حالت' نگران مقالہ کی نااہلی و بے توجہی اور ممتحنین کی عدم دلچسپی اور ان کی رسمی امتحانی رپورٹ کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ خصوصاً ان تحقیقی مقالات کے گائیڈز اور ممتحنین کے بارے میں دلچسپ باتیں سننے میں آتی ہیں۔

ادبی تحقیق کے بارے میں ہمارا رویہ کس قدر سرسری ہے اور ہم اس وقیع علمی کام کو کتنا غیر سنجیدگی سے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور شعبہ ہائے ادب کے اربابِ بست و کشاد کا طرزِ عمل امیدوارانِ تحقیق کے ساتھ کتنا غیر ذمہ دارانہ ہے' اس ملی جلی صورت حال کی جھلک ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مندرجہ ذیل بیان میں ملاحظہ کیجیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو میں ایم اے کرنے کے بعد' اُن کے لیے جو تحقیق کا ذوق رکھتے ہیں اور اُن بہت سوں کے لیے بھی جو خلافِ امید یا استعداد' ایم اے کر گزرتے ہیں' پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرانا کچھ ایسی معمول

کی سی سرگرمی بن گیا ہے جیسے انٹر کے بعد بی اے کرنا۔ ادھر جب سے تحقیقی اسناد رکھنے والوں کے لیے مناصب یا مشاہرے نسبتاً پرکشش بنا دیے گئے ہیں' ایسے بہت سے استادوں کو بھی تحقیق کے لیے موضوع کی تلاش میں سرگرداں دیکھا جا رہا ہے جنہیں لکھنے پڑھنے سے تائب ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں۔۔۔۔ یہ ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ بہت سے متعلمین' قطع نظر اس سے کہ اُن کا مزاج تحقیقی ہے یا نہیں' تحقیقی کام میں ہاتھ ڈال لیتے ہیں محض اس لیے کہ ایم اے کرنے کے بعد انہیں اپنے سینئر اساتذہ کی خوشنودی یا سرپرستی حاصل ہوتی ہے اور وقت گزارنے کے لیے انہیں یونیورسٹی یا شعبے میں عادتاً چلے آنے کے علاوہ کوئی اور حسب حال شغل میسر نہیں ہوتا ــــ خالصتاً شوق' مزاجی مناسبت اور استعداد یا اہلیت کے اعتبار سے ریسرچ کرنے والے کم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے ٹھیک کہا ہے کہ جہاں طالبانِ صادق کی ہمت افزائی ضروری ہے۔ وہاں (خوش شغلوں یا) بوالہوسوں کو اس وادی سے دور رکھا جا سکے تو نامناسب نہ ہوگا جس شخص نے کبھی (ڈھنگ کا) ایک مضمون نہ لکھا ہو وہ (سلیقے کی) ایک کتاب کیوں کر لکھ سکتا ہے۔ اس لیے نوآموز ریسرچ سکالر کو ابتداً کچھ تحقیقی نوعیت کے مضامین لکھنے چاہیں تاکہ اس کی استعداد یا صلاحیت کا اندازہ ہو سکے۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمٰن "اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں" یونیورسل بکس لاہور' 1989ء (صفحہ 124 تا125)]

نوٹ: مندرجہ بالا اقتباس کی آخری چھ سات سطریں گیان چند جین کی تحریر معلوم ہوتی ہیں' جن پر اصول کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے واوین نہیں لگائے۔ ہمارے قیاس کی بنیاد ان سطروں میں تین قوسین میں (خوش شغلوں یا)' (ڈھنگ کا) اور (سلیقے کی) درج الفاظ ناقل کی طرف سے عبارت میں Improvement کی کوشش کا نتیجہ لگتے ہیں۔ اس شہادت کی بناء پر ہم نے یہ سطریں گیان چند سے منسوب کی ہیں۔

یونیورسٹیوں میں موجودہ اردو تحقیق کا تشویشناک اور پریشان کن پہلو یہ ہے کہ اس میں تحقیقی مقالات کے گائیڈ اساتذہ اور ممتحنین کا کردار کافی حد تک منفی ہے۔ اس کی بہت سی امثال اور اس کے اسباب پیش کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم چھ نمایاں ترین اسباب یہ ہیں: (1) سینئر' مستند اور تجربہ کار اساتذہ کی کمیابی (2) اپنے مضمون کی تاریخ' روایت اور حالیہ (جدید ترین) ادبی تصورات' رجحانات اور کتابیات سے ناواقفیت (3) زیرِ نگرانی مقالہ نگار کے کام کی جزئیات کی حد تک نگرانی سے پہلوتہی (مقالہ نگار کے ڈرافٹ کا مکمل مطالعہ اور اصلاح) (4) ممتحن کا مقالہ سے سرسری گزرنا اور صحیح قدر و قیمت کے تعین کے لیے وقت اور محنت سے گریز اور رسمی رپورٹ / ڈگری عطا کرنے کی سفارش (5) وقت کی قلت (بیک وقت متعدد یونیورسٹیوں کے پرچہ جات' تحقیقی مقالات' میٹنگ بسلسلہ امتحانی اور نصابی امور اور سیمیناروں میں شرکت وغیرہ) (6) رسائل و جرائد کے لیے مقالہ نگاری (7) تالیف و تصنیف' ترتیب و تدوین میں مصروفیت وغیرہ۔

یاد رہے ان تمام مصروفیتوں سے کسی نہ کسی طرح کی یافت وابستہ ہے۔ ان حقائق سے یہ با

کھلتی ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے برسرکار اساتذہ اور اسکالرز کو علمی یکسوئی، تحقیقی فرصت اور تدریسی ارتکاز میسر نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اطمینان بخش تدریس اور تحقیق میں معیاری نگرانی کا فریضہ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس صورتحال کو اگر کسی ایک مثال سے سمجھنا چاہیں تو شاید ڈاکٹر معین الرحمن اس کی ایک موزوں مثال کہے جا سکتے ہیں۔ وہ کم و بیش بیالیس برس سے ادبی تالیف و ترتیب کے کام میں مشغول چلے آرہے ہیں اور امتحانی تحقیقی مقالات سے ان کی وابستگی کو چالیس برس ہو رہے ہیں۔ وہ 1965ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں اپنی ششماہی ملازمت کے زمانے میں ایم اے کے امتحانی تحقیقی مقالہ کی نگرانی سے وابستہ ہوئے۔ محترمہ خورشید زہرا کا مقالہ "باغ و بہار اور اس کے کردار" 1967ء ان کی نگرانی میں پہلا امتحانی تحقیقی مقالے کا کام ہے۔ 1969ء تا 1972ء وہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں مصروف رہے۔ وہ 1974ء تا 1981ء گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت میں ایم اے کے طلباء و طالبات کو تحقیقی مقالات کے موضوعات الاٹ کرنے، یونیورسٹی سے ان کے لیے منظوری حاصل کرنے، طالب علموں کے تحقیقی کام کی نگرانی، ان کی ٹائپ، پروف ریڈنگ، جلد بندی، یونیورسٹی میں پیش کرنے کے بعد امتحان کے نتیجہ تک مصروف رہتے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں 1987ء سے 2004ء میں ریٹائرمنٹ تک یہاں بھی وہ مندرجہ بالا ذمہ داریاں نبھاتے رہے، کالج میں تدریسی و انتظامی ذمہ داریاں اس پر مستزاد ہیں۔ ہم یہاں ان کے سوانحی خاکہ (CV) مطبوعہ "دل کی کتاب" میں صرف امتحانی تحقیق سے متعلق درج ان کی مصروفیات کی تفصیل نقل کرتے ہیں: ملاحظہ فرمائیے:

اعلیٰ مدارج میں تحقیقی اور امتحانی کام سے وابستگی

نگران کار

پی ایچ ڈی (اردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور

ایم فل (اردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ایم فل (اقبالیات) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

ایم اے (اردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور

ایم اے (اردو) گورنمنٹ کالج لاہور

[ستر ریسرچ اسکالرز کے کام کی نگرانی کی خدمت انجام دی] یہ 2000ء تک کا شمار ہے 2004ء تک شمار 90 ہو سکتا ہے۔

ممتحن، ڈ ایچ ڈی (اردو)؛

پنجاب یونیورسٹی لاہور

کراچی یونیورسٹی کراچی

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

ممتحن ایم فل (اردو)

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اسلام آباد

زکریا یونیورسٹی' ملتان

ممتحن ایم فل (اقبالیات)

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اسلام آباد

ممتحن ایم اے (اردو)

پنجاب یونیورسٹی لاہور

اسلامیہ یونیورسٹی' بہاول پور

کراچی یونیورسٹی' کراچی

پشاور یونیورسٹی' پشاور

زکریا یونیورسٹی' ملتان

بلوچستان یونیورسٹی' کوئٹہ

گورنمنٹ کالج لاہور

ممتحن تھیسس ایم اے (فلاسفی)

پنجاب یونیورسٹی' لاہور

ممتحن (اردو)

فیڈرل پبلک سروس کمیشن' اسلام آباد

پنجاب پبلک سروس کمیشن' لاہور

اعلیٰ ملازمتوں کے لیے ایڈوائزر:

برائے پروفیسرز [بی ایس۔20]

پنجاب پبلک سروس کمیشن لاہور

پنجاب یونیورسٹی' لاہور

کراچی یونیورسٹی کراچی

سندھ یونیورسٹی' جامشورو

زکریا یونیورسٹی، ملتان

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

گورنمنٹ کالج لاہور

برائے ایسوسی ایٹ پروفیسر [بی۔ایس 19]

[اداروں کی تفصیل بمطابق مندرجہ بالا دہرائی گئی ہے]

برائے اسسٹنٹ پروفیسرز [بی ایس۔18]

[اداروں کی تفصیل بمطابق مندرجہ بالا مکرر درج کی گئی ہے]

برائے لیکچرارز [بی ایس۔17]

[اداروں کی تفصیل بہ استثنیٰ کراچی یونیورسٹی مکرر درج ہے]

کچھ اہم حالیہ اور سابقہ علمی وتہذیبی ذمہ داریاں:

اس عنوان کے تحت 15 کمیٹیوں اور مجلسوں کی ممبر شپ بتائی گئی مثلاً

ممبر بورڈ آف اسٹڈیز (اردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور

کنوینر بورڈ آف اسٹڈیز، گورنمنٹ کالج لاہور

مندرجہ بالا ذمہ داریوں اور ایڈوائزری خدمات کے سلسلے میں بھی موصوف کو تحقیقی مقالات کی جانچ اور تحقیقی موضوعات کی منظوری سے واسطہ رہا۔

گزشتہ صفحات میں آنے والی تفصیلات کے مطابق ڈاکٹر معین الرحمن بظاہر ایک تجربہ کار اور سند یافتہ محقق ہونے کے علاوہ چار دہائیوں سے تحقیق کی تدریس اور ترتیب میں مصروف ہیں۔ان کی سوانحی خاکہ نگار کے مطابق وہ 2000ء تک ستر ریسرچ اسکالرز کے کام کی نگرانی کر چکے تھے اور اب تک یہ تعداد نوے کے قریب پہنچ گئی ہوگی۔وہ کم وبیش اتنی ہی تعداد میں مختلف مدارج کے امتحانات کے لیے تحقیقی مقالات کے ممتحن رہے ہوں گے۔انہوں نے ایسے ہی کافی تعداد میں امتحانی مقالہ نگاروں کے Vivas کیے ہوں گے۔بحیثیت صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے رفقاء کی نگرانی میں لکھے گئے مقالات کے معیار کی تائید وتصدیق کے لیے سرٹیفکیٹ جاری کیے ہوں گے۔ہمیں امتحانی تحقیقی مقالات کے باب میں ان کی شخصی نگرانی اور راہنمائی کے علاوہ ان کے شعبہ میں لکھے گئے بعض دیگر امتحانی تحقیقی مقالات دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ہم ان اصحاب کے لیے ایک پرانے رفیق کار کے طور پر احترام دوستی اور محبت کے تعلقات اور جذبات رکھتے ہوئے بصد معذرت اس حقیقت کے اظہار کی اجازت چاہتے ہیں کہ ہم اپنے شعبہ کے تحقیقی مجلہ اور اس میں لکھے گئے تحقیقی مقالات کے لیے حرف تحسین نہیں کہہ سکتے۔ممکن ہے ''تحقیق نامہ'' میں چھپنے والی تحریروں میں بعض

استثنائی صورتیں بھی موجود ہوں۔ اگر چہ ہم نے اپنی رائے چند فراہم مقالات کو دیکھتے ہوئے قائم کی ہے مگر ہمیں مقالات کا عمومی معیار طمینان بخش نظر نہیں آتا۔ اس لیے بھی کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے بطور صدر شعبہ اردو ونگران (گائیڈ) مقالات بہت ہی محدود موضوعات تجویز کیے ہیں۔ ان کا بڑا ترجیحی موضوع غالب اور فلاں بطور غالب شناس رہا ہے۔ ان کا دوسرا ترجیحی موضوع بعض ایسے افراد تھے جن کی کسی حیثیت سے موصوف متاثر تھے اور ان سے شخصی رابطہ استوار کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بعض ایسے اشخاص کو بھی موضوع بنوایا جو ایک تحقیقی موضوع بننے کے امکانات نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے بعض اشخاص یا ان کے متعلقین کی خوشنودی کے لیے موضوع تشکیل دیے۔ انہوں نے شعبہ انچارج کے تحقیقی امور کی حیثیت میں اپنے رفقا کی نگرانی میں کیے گئے کام کی نگہداشت نہ کی۔ گویا ان مقالات کی وہ کوتاہیاں یا خامیاں جو نگران حضرات کی عدم دلچسپی کا نتیجہ ہیں بالواسطہ طور پر ان کی ذمہ داری صدر شعبہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔

انہی دنوں ہمیں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ذاتی نگرانی کے علاوہ ان کی ''سوپر نگرانی'' میں لکھے گئے ایم اے کے امتحانی مقالات دیکھنے کا اتفاق ہوا تو خاصی حیرت ہوئی کہ وہ مقالہ نگار جو ''تحقیق کا فن اور تحقیقی اصول'' کے حوالے سے ایک لازمی پرچہ کا امتحان پاس کر چکے ہیں' جب وہ عملی طور پر مقالہ لکھتے ہیں اور اپنے نگران سے مقالہ منظور کروا کر امتحان کے لیے پیش بھی کر دیتے ہیں تو اس وقت بھی ان کے مقالے میں تحقیقی Methodology کے استعمال سے اغماض واضح اور نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے ڈی فل کے لیے اپنی امتحانی تحقیق کے آغاز میں ''فن تحقیق'' کی ''مبادیات منہاج'' Fundamantals of Methodology کے استعمال سے بے خبری اور ''بے رواجی'' کا ذکر کرنے کے لیے اپنے نگران کار (گائیڈ) کو مورد الزام ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے یہ بتا کر نہ دیا تھا کہ فٹ نوٹ درج کرنے کے اصول اور تقاضے کیا ہوتے ہیں۔ اُن کی زبانی سنیے:

''جب میں نے پہلی بار الہ آباد یونیورسٹی میں ڈی فل کے لیے ریسرچ کی تو مجھے میرے نگران نے فٹ نوٹ لکھنے کے بارے میں ہدایت نہیں کی۔ میں نے اپنا مقالہ ''اردو کی نثری داستانیں'' جیسے کا تیسا انجمن ترقی اردو پاکستان کو اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ 1984ء میں یہ شائع ہوا تو فٹ نوٹوں سے معرا تھا۔ جنوری 1987ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اردو کے تحقیقی مقالوں پر ایک سیمینار ہوا۔ شرکا میں جموں یونیورسٹی کے ریڈر ڈاکٹر ظہور الدین بھی تھے۔ انہوں نے ایک زمانے میں میری نگرانی میں جموں میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ سنا ہے کہ کسی اعتراض کے جواب میں انہوں نے سیمینار میں کہا کہ میں نے ان کی ریسرچ کے دوران انہیں تحقیق کے طریقے نہیں بتائے تھے۔ ان کا یہ کہنا درست تھا۔ میں اس زمانے میں اصولِ تحقیق سے بہت کچھ واقفیت حاصل کر چکا تھا لیکن وہ میرے ذہن میں ترتیب شدہ شکل میں نہیں تھے۔ چنانچہ میں اپنے زیر نگرانی اسکالروں کو صریحاً اس کا درس نہیں دیتا تھا۔۔۔ میں نے 1980ء میں مرکزی یونیورسٹی حیدر آباد کے

لیے ایم فل کا نصاب بنایا تو ایک پرچہ طریق تحقیق کا رکھا۔۔۔"

[ڈاکٹر گیان چند' تحقیق کا فن' اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ' پہلا ایڈیشن 1990ء' صفحہ ی']

واقعہ یہ معلوم ہے کہ برصغیر میں اردو ادب کے حوالے سے فن تحقیق کے نظری مباحث کا آغاز بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ہوا۔ اس زمانے میں تحقیق کے نظری اور عملی مسائل اور رموز و نکات پر رسائل میں مضمون نظر آنے لگے تھے مگر اس موضوع پر عبدالرزاق قریشی کی کتاب "مبادیات تحقیق" بمبئی 1968ء اور رسالہ آج کل دہلی اگست 1967ء کا اردو تحقیق نمبر' شاید تحقیق کے موضوع پر اولیں مجموعے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے 1970ء کے بعد سے پاکستان اور ہندوستان سے (1) ایم فل اور پی ایچ ڈی کے بیسیوں مطبوعہ مقالات منظر عام پر آ چکے ہیں۔ (2) متعدد علمی' ادبی تنقید اور تحقیق کی کتابیں چھپ چکی ہیں (3) علمی و تحقیقی مجلات اور رسائل میں پچاسوں مقالات شائع ہو چکے ہیں' ان سب میں مصنفین اور مولفین نے پوری ہوش مندی' ذمہ داری اور کامیابی سے فن تحقیق کے اصولوں اور تحقیقی طریق کار کو استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تحقیق کے متذکرہ عملی کام نو وارد ریسرچ اسکالرز کے سامنے بطور ماڈل موجود ہیں۔ پندرہ بیس برس سے ایم اے' ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالہ نگاروں کو لازمی نصاب کے طور پر فن تحقیق کا ایک کورس بھی پاس کرنا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود جب امتحانی مقالات مکمل ہونے کے بعد گائیڈ سے اطمینان بخش کام کا سرٹیفکیٹ پا کر وہ جمع کرا دیے جاتے ہیں تو Evaluation اور Viva کے لیے ایک آدھ استثنیٰ کو چھوڑ کر عمومی فنی کوتاہیوں اور تکنیکی غلطیوں اور زبان و بیان کی لغزشوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

اگر ڈاکٹر معین الرحمن کے سوانحی خاکہ (جس کا بار بار ذکر آ چکا ہے) کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھیں تو یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تحقیق میں دلچسپی اور اردو میں فن تحقیق کے رواج اور ترقی پانے کا زمانہ ایک ہی ہے اور یہ کہ وہ کاغذی سطح پر ایک تجربہ کار اور عامل Practising محقق ہونے کے علاوہ فن تحقیق کے مدرس 80 کے قریب امتحانی مقالات کے نگران' تصحیح کنندہ اور درجنوں امتحانی مقالات کے خارجی ممتحن اور ایک تحقیقی مجلہ کے مدیر رہ چکے ہیں۔ بطور محقق غالب انہوں نے مختلف حربوں سے خود اپنا اتنا چرچا کر لیا ہے کہ خیال ہوتا ہے وہ نظری سطح پر فن تحقیق کے رموز و نکات سے آگاہ' تحقیق کے اصولوں سے واقف' تحقیق کے طریق کار سے گہرے طور پر شناسا ہوں گے۔ فن تحقیق سے متعلق یہ ساری باتیں بہت ہی سادہ اور معمولی ہیں مگر حیرانی کی بات ہے جب فن تحقیق کے ان اصولوں کو عملی طور پر استعمال کرنے کی نوبت آتی ہے تو وہ Invariably ایسے اسقام کے مرتکب ہوتے ہیں کہ تحقیقی میدان میں ان کا عمر بھر کا تجربہ مشکوک ہو جاتا ہے خصوصاً جب تحقیق کی یہی فنی کوتاہیاں اور فروگذاشتیں ان کی نگرانی میں تکمیل پانے والے امتحانی تحقیقی مقالات میں نمایاں طور پر موجود ملتی ہیں جنہیں اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ "امتحانی غلطیاں" ہوتی ہیں بہر حال فن تحقیق کے آخری ترتیبی مرحلہ یعنی کسی تحقیقی مقالہ کی تسوید اور تکمیل کے بعد رسمی قیود کی برخلاف

ورزی کا ذمہ دار اس کا نگران کار ہی ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ موضوع کی پیش کش کے بعد ایک زیر تربیت ریسرچ اسکالر کے فنی اسقام اور تحقیقی اغلاط کی نشاندہی اور ان کا ازالہ نگران کار کا اولین فرض اور دردسر ہے۔ اس طرح مسودہ کی زبان و بیان میں اصلاح اور ترمیم تجویز کرنا بھی نگران کے دائرہ کار میں شامل ہے۔

تحقیق کے عملی مسائل میں سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ فٹ نوٹ میں کسی ماخذ کے حوالے سے متعلقہ معلومات کی فراہمی کو مرتب انداز میں لکھنے کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ فنی شرائط کے مطابق اپنی پوری جزئیات کے ساتھ فنی لحاظ سے مرتب فٹ نوٹ، ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اپنے پی ایچ ڈی کے'16 برس کی نظرثانی کے بعد' مطبوعہ مقالہ (1989ء) میں بھی متعدد مقامات پر مفقود ہیں۔ اس مقالہ کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات' تالیفات اور مرتبات تک میں فٹ نوٹ کی ناتمامی کے شواہد ملتے ہیں۔ اس طرح ان کے تربیت یافتہ ریسرچ اسکالرز کے اصلاح شدہ اور اجازت دادہ مقالات' حتیٰ کہ ان مقالات کے ''مجلہ تحقیق نامہ'' میں طبع ہونے والے ابواب میں بھی خام اور ناتمام فٹ نوٹ موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں فٹ نوٹ کے دو ذیلی عناصر یعنی ''ایضاً'' (ibid) اور ''محولہ بالا'' (Op.cit) کے درست استعمال سے ان کی بے خبری قابل ذکر ہے۔ مثلاً ان کی کتاب ''غالب کا علمی سرمایہ'' مطبوعہ 1989ء میں فٹ نوٹس (حواشی) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاشیہ نگاری کا واضح تصور نہیں رکھتے۔ ان کی کتاب ''تحقیق غالب' (مطبوعہ 1981ء بار دوم 1998ء) میں حواشی کا غلط اندراج ہے۔ یہی صورت حال ان کی دوسری مرتبہ اور مولفہ کتب میں نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے نام سے چھپنے والی تحقیقی و تنقیدی تحریروں کے بارے میں ایک عام اور مروج رائے یہ ہے کہ ان میں ان کی اپنی فکر اور کاوش کی بجائے نہ صرف دوسروں کے نتائج فکر اور آرا شامل ہوتی ہیں بلکہ الفاظ' مرکبات اور فقرات ہی نہیں پیراگراف تک دوسروں کے ہوتے ہیں۔ دوسروں کے ان فقروں اور عبارتوں کے حوالوں کے لیے وہ کئی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کئی جگہ جہاں اعتراف اور تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے تو وہاں وہ براہ راست حوالہ دے دیتے ہیں۔ کسی جگہ حوالہ کو مخفی رہنے دیتے ہیں۔ کسی جگہ وہ حوالہ کو یوں کنفیوژ کرتے ہیں کہ اور بجنل حوالہ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے وغیرہ۔

مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا حوالہ دینے کا انداز ضمناً موضوع بحث بن گیا۔ اصل موضوع یہ تھا کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تحریر دوسروں کے پیراگراف اور فقرات کی بیساکھیوں کے بغیر پہلے دن سے ایک قدم نہیں اٹھاتی رہی۔ ان کے نام سے پہلی کتاب' بابائے اردو۔ احوال و افکار 1964ء میں چھپی جو اول تا آخر دوسروں کے فقرات اور پیراگراف پر مشتمل ہے۔ انہوں نے سات برس بعد ساتویں کتاب ''مطالعۂ یلدرم'' کے نام سے مرتب کی۔ اس کتاب کی ترتیب و تشکیل سے مغالطہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس کتاب میں یلدرم کا منضبط تنقیدی مطالعہ کیا ہوگا مگر ذرا سی توجہ اور بنظر غائر مطالعہ سے یہ تاثر نقش بر آب ثابت ہوتا ہے۔ عام طور پر کتابوں میں دوسرے مصنفین کے فقرات اور پیراگراف تو بصورت کوٹیشن مل

جاتے ہیں مگر یہ پہلی کتاب دیکھنے میں آئی ہے جس میں کئی مقامات پر کوٹیشن تین چار صفحے کو محیط ہیں۔

دیکھیے اس کتاب کے پہلے سوا دو صفحے ہی واوین میں درج عبارت پر مشتمل ہیں (''مطالعہ یلدرم'' شائع کردہ نذر سنز لاہور طبع اول مارچ 1971ء صفحہ 27 تا 29)

اسی طرح باب: افسانہ نگار یلدرم کا سیکشن 5 اڑھائی صفحوں کی کوٹیشن پر مشتمل ہے۔ اس باب میں یہ کیفیت کئی مقامات پر نظر آتی ہے۔ غرض ایک محتاط اندازے کے مطابق 49 صفحات پر محیط اس باب کے تقریباً 37 صفحات کی عبارت واوین میں بند ملے گی۔ اٹھاون صفحات پر مبنی دوسرے باب بعنوان ''انشاء پرداز یلدرم'' کی بھی کم وبیش یہی کیفیت ہے۔ ان اٹھاون صفحات میں سے تقریباً پینتالیس صفحات تو اعلانیہ دوسروں کی تحریروں سے لے کر واوین میں درج کر دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کو دوسروں کی ان تحریروں کے لیے تردد نہیں کرنا پڑا۔ انہوں نے یہ سب فقرے، پیراگراف اور صفحات رسالہ ''پگڈنڈی'' امرتسر کے مشہور ''یلدرم نمبر'' سے اٹھائے ہیں اور ہر جگہ اس رسالہ کا حوالہ دینے کی بجائے اس میں درج اور مجمل حوالوں کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اس تالیفی طریق کار اور انداز ترتیب وتصنیف پر سید وقار عظیم کی رائے بلا تبصرہ پیش خدمت ہے۔ وہ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''سید معین الرحمٰن صاحب نے پہلی مرتبہ تحقیق کی گہرائیوں میں جا کر اصل یلدرم کا سراغ لگایا ہے اور اس تحقیق کی بدولت جو بیش بہا معلومات فراہم ہوئی ہیں، انہیں بڑے معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں دلیل اور منطق کی موثر صورت دی ہے۔۔۔ (سید معین الرحمٰن: مطالعۂ یلدرم' نذر سنز لاہور' 1971ء' صفحہ 21)

کاش ہمارے استاد گرامی مروت اور سرپرستی کے جذبہ سے سرشار ہو کر مندرجہ بالا الفاظ میں موصوف کی بے جا حوصلہ افزائی نہ فرماتے اور انہیں اپنی تحریر اور مستعار تحریر کا فرق سمجھا دیتے۔ واوین کے استعمال کے کچھ اپنے تقاضے اور شرائط ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا بہر طور ضروری ہوتا ہے۔ واوین کے اندر پیش کی جانے والی عبارت کی طوالت کی حد کیا ہونی چاہیے؟ اس کا کوئی بندھا ٹکا قاعدہ قانون نہیں ہے۔ اس کا انحصار اپنے اپنے علم' خوش ذوقی' حسن تناسب اور مناسبت وموزونیت کے احساس پر ہے۔ ایسا مضمون یا کتاب کا باب جس میں کوئی تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہو یا کوئی مدلل اور نتیجہ خیز بحث کی گئی ہو' اس میں لکھنے والا اپنے موقف کی تائید میں یا پہلے سے موجود کسی کی دلیل کو ایک قول یا رائے کے طور پر پانچ سات یا دس بارہ سطروں کی موزوں کوٹیشن میں بھی پیش کرے تو نامناسب معلوم نہیں ہوتا مگر ایک دو تین صفحے یا متعدد پیراگرافس کو آخر تک کوٹیشن کی بھرتی کے طور پر ڈھیر کرتے چلے جانا کوٹیشن کی بنیادی خصوصیت' اس کے مزاج اور اس کے اصول سے تجاوز کے مترادف ہے۔

کتابوں کے ابواب یا مضامین کے تخفیف شدہ طویل اقتباسات یا ٹکڑوں کی مکرر اشاعت کی ایک صورت کو درست اور جائز مانا گیا ہے۔ وہ ہے کسی مصنف' تاریخی دور' ادبی' سیاسی' سماجی تحریک کسی علم کے مہتم

الشان موضوع یا کسی نظریہ پر وسیع لٹریچر کی Readings کی ترتیب و تدوین، مفصل حواشی کے ساتھ۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ایک اور کتاب ''غالب اور انقلاب ستاون'' ہے جس کا بہت بینڈ باجا بجایا گیا ہے مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ اس کے دو بنیادی ابواب یعنی نمبر 3 (انقلاب ستاون اور خطوط غالب) اور نمبر 4 (انقلاب ستاون اور غالب کا شعری رویہ) میں اقتباسات (جیسا کہ پچھلے صفحات میں بھی کہا گیا) روڑوں کا ایک بے جان ڈھیر ہیں۔ ان اقتباسات کو متعلقہ ابواب کے مباحث کی رگوں میں خون بنا کر دوڑایا نہیں گیا۔ باب نمبر 3 کا متنی حصہ 220 مجرد اقتباسات پر مبنی ہے۔ چونکہ اس باب میں سرے سے کوئی موضوع بحث یا مسئلہ نہیں ہے اس لیے کسی ایک اقتباس کا بھی کوئی کردار نہیں ہے۔ ایک لطف کی بات یہ ہے کہ ان 220 اقتباسات کے نیچے تقریباً جو 24 حواشی درج کیے گئے ہیں وہ بھی اقتباسات پر مشتمل ہیں اور حواشی کے حوالے سے ہی مرتب/مولف کسی تبصرہ کی گنجائش، وضاحت یا بحث کا موقع پیدا کر سکتا تھا مگر انہوں نے ان اقتباسات کے حجاب کا احترام ہی مقدم اور محترم جانا۔ باب نمبر 4 کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس باب میں متن کے مقام پر ساتھ اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ ان کے تینتالیس (43) حواشی کتابی حوالوں اور اقتباسات پر مبنی ہیں۔ گویا حواشی کے وضاحتی جملے بھی مولف موصوف کے اپنے نہیں ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ہاں اس صورت حال کا سبب یہ ہے کہ وہ کوٹیشن کی اصلیت، ماہیت اور غایت کے بارے میں واضح تصور نہیں رکھتے۔ کیونکہ اس حوالے سے ان کی لغت' لفظ' اقتباس اور کوٹیشن تک محدود ہے۔ وہ شاید نہیں جانتے کہ کوٹیشن، passage، Extract اور Excerpt تقریباً ایک ہی قبیل کے لفظ ہوتے ہوئے بھی معنوی فرق اور امتیاز رکھتے ہیں مگر اردو میں ان سب کے لیے عموماً اور ترجیحاً ایک ہی لفظ اقتباس استعمال ہوتا ہے مگر لفظ کوٹیشن جب اصطلاحی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس میں ایک معنوی زاویہ بھی ظہور میں آتا ہے۔ اس کے حوالے سے کوٹیشن کسی (نابغہ، دانشور، مصنف اور سیاستدان وغیرہ) کے کہے ہوئے الفاظ کا وہ مجموعہ (یعنی تحریر و تقریر کا ٹکڑا) ہوتا ہے جس میں کوئی دانائی، حکمت اور بصیرت کی بات ہوتی ہے۔ اس معنوی دلالت کے مطابق دو چار جملوں میں بیان ہونے والا وہ مرکزی نکتہ مراد ہوتا ہے جو بصیرت افروز اور حکمت آموز ہو۔ اس کے لیے ہمارے پاس دو بہت اچھے، مقبول اور مروج الفاظ موجود ہیں۔ ہماری مراد قول اور مقولہ سے ہے مگر تنقیدی و ادبی مضمون کی نگارش اور تحقیقی مقالہ نویسی میں جب لفظ کوٹیشن ایک اصطلاح کی سی شان کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو وہ مخصوص معنی کا حامل ہوتا ہے۔ ان معانی کی وضاحت ہم دو انگریزی ڈکشنریوں سے مستعار لیتے ہیں

Longman, Dictionary of English Language and Culture کے مطابق کوٹیشن کی ایک تعریف مندرجہ ذیل ہے:

"A sentence or phrase taken from a work of literature or other piece of writing and repeated, esp. in order to prove a point or support argument."

[Longman, Dictionary of English Language and Culture, England,1992. p.1079]

ایک دوسری ڈکشنری کے مطابق اس لفظ کے ایک معنی یہ ہیں:

Quotation: a phrase or passage from a book, poem, play, etc. remembered and spoken, esp. to illustrate succinctly or support a point or an argument.

[Collins, Dictionary of the English Language. London & Glasgow.(Reprinted and updated) 1981. p.1201]

ڈاکٹر معین الرحمن نے صرف اپنی ابتدائی دو کتابوں ''مطالعۂ یلدرم'' اور ''غالب اور انقلاب ستاون'' ہی میں بیکار اور مجرد اقتباسات جمع کرنے کو اپنی تصنیف و تالیف قرار نہیں دے لیا ان کی تقریباً ہر کتاب اور مضمون کا یہی انداز اور یہی حال ہے۔ اسی طرح اشاریہ سازی یا فہرست سازی طالب علموں کا کام ہے یا لائبریری کلرکوں کا مگر تیسرے درجہ کے محققوں کا کام بھی نہیں ہے لیکن ڈاکٹر سید معین الرحمن اشاریہ سازی کو بھی کار تحقیق سمجھ کر نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ انجام دیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی دانست میں اقتباس نویسی کو ایک ''فن'' یا ''دبستان'' بنا دیا ہے اور وہ اپنے زعم میں اس کے بانی بنے بیٹھے ہیں۔ انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ انہوں نے Abuse of quotation سے کیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ انہوں نے کوٹیشن کا ''ناروا'' استعمال اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کی اشاعت اور فروغ کے لیے اپنے منصب کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے زیر نگرانی ''طالب علم محققین'' کو اقتباسات کی جمع آوری کے راستے پر چلایا۔ ان کی نگرانی میں لکھے گئے امتحانی تحقیقی مقالے اس کا ایک ثبوت ہیں۔ ظاہر ہے ان مقالات تک ہر دیکھنے کے خواہش مند کی رسائی آسان نہیں مگر ان کی بعض مثالیں ان مضامین میں دیکھی جا سکتی ہیں جو ان مقالات کے ابواب کو مضمون کی شکل دے کر مجلّہ ''تحقیق نامہ'' (خصوصاً شمارہ 3-4 اور شمارہ 6-7) میں شائع بھی کیے گئے تھے یا اس مجلّہ کے متعلقہ شماروں کی کتابی شکل موسوم بہ ''تحقیق نامۂ غالب'' اور ''نقوشِ غالب'' وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے چند تحقیقی مقالے کتابی صورت میں بھی چھپ چکے ہیں۔

راقم ڈاکٹر معین الرحمن کی نگرانی میں مکمل کیے گئے ان امتحانی تحقیقی مقالات کا بالتخصیص ذکر کرتا اور ان میں سے مثالیں بھی پیش کرتا جن میں موصوف کے وسائل میں اور انہی کی ہدایت پر اقتباسات کی محض بھرتی کی گئی ہے مگر وہ طالب علموں کو اس ''کنٹروورسی'' یعنی تنازع میں ملوث نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی ان کی تضحیک مقصود ہے' ان کا قصور بھی کیا ہے؟ انہیں بہ حیثیت طالب علم جو کچھ سکھایا پڑھایا گیا ہے' انہوں نے نہایت سعادت مندی سے وہ سیکھا اور پڑھا۔ اس لیے نہ تو ان کے اسماء یہاں درج کیے گئے ہیں اور نہ ہی ان کے امتحانی تحقیقی مقالات سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

معین الرحمن کی ''واوینی تحقیق'' دراصل ان کے اقتباسات کی جمع آوری کے شوق ہی کی زائیدہ ہے۔ جب اور جہاں ان کی ''واوینی تحقیق'' کا ذکر آتا ہے اسی وقت اور وہیں ان کے اقتباسات کی بھرتی کے

عمل پر کبھی حیرت کا اور کبھی تمسخرانہ اور استہزائیہ اظہار دیکھنے میں آتا ہے۔ جن لوگوں کا ڈاکٹر معین الرحمٰن کے Abuse of quotation کے بارے میں تنقیدی و تنقیصی رویہ تو نہیں مگر وہ ان کے اس طریق کار کی غرابت کو ضرور محسوس کرتے ہیں مثلاً ان کے ایک ہمدرد پروفیسر منور علی ملک شعبہ انگریزی گورنمنٹ ڈگری کالج میانوالی نے ان سے (غالباً تحریری) متعدد استفسارات کیے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے جوابات ''دل کی کتاب'' کے 38 صفحات (119 تا 157) کو محیط ہیں۔ انہوں نے ایک سوال کوٹیشن کے حوالے سے بھی کیا ہے۔ انٹرویو میں کوٹیشن کے بارے میں استفسار کا محرک ڈاکٹر معین الرحمٰن کا کوٹیشن کا بے محابا اور بے جا استعمال معلوم ہوتا ہے کیونکہ مستفسر کے سینے میں یہ استفسار اس وقت تک کھٹک بن کر وجود میں نہیں آسکتا جب تک ڈاکٹر معین الرحمٰن کے زیر بحث طریق استعمال کے بارے میں ان کی کوئی ریزرویشن نہ ہو۔

منور علی ملک نے ڈاکٹر معین سے پوچھا: ''ترتیب و تدوین کے کام میں quotation کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟''

معین الرحمٰن نے جواب دیا: ''ترتیب نو یا تشکیل جدید کے عمل میں ''اقتباس'' کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ ''کوٹ کرنا'' میرے نزدیک ایک فن ہے' اس کی اپنی ایک شریعت ہے۔۔۔ میں اسے ''تخلیقی سرگرمی'' کے مماثل جانتا ہوں اور ایمرسن کا ہم خیال ہوں کہ:

"Next to the writer of a good sentence is the first quoter of it.'

[دل کی کتاب' صفحہ 143]

ہمارا خیال ہے استفسار کنندہ کے سوال میں اظہار کا عجز پایا جاتا ہے۔ غالباً وہ یہ پوچھ رہے تھے کہ تصنیف و تالیف یا تحقیقی مقالہ نویسی میں کوٹیشن کا کیا وظیفہ (function) ہوتا ہے؟ اور تحقیقی مقالہ میں کوٹیشن کے استعمال کے کیا اصول اور شرائط ہیں اور اس کے کیا محدودات ہیں؟

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے مستفسر کے سوال کے نہ صرف الفاظ نظر انداز کر دیے بلکہ سوال کے الفاظ کو تراکیب میں بدل کر کنفیوژن پیدا کر دی۔ سوال پیدا ہوتا ہے ''فسانہ عجائب'' کی ترتیب نو اور ''نوطرز مرصع'' کی تشکیل جدید کیسے عمل میں آئے گی؟ اس میں کون سی کوٹیشن کون سا اہم کردار ادا کریں گی۔ ڈاکٹر صاحب کے باقی ماندہ جملے محض خطابت ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ''کوٹ کرنا'' یعنی کوٹیشن کا استعمال ایک فن ہے تو انہوں نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس فن کی بنیادیں کیا ہیں؟ اس فن کے خصائص اور اس کی شرائط کیا ہیں اور اس فن کی تکنیک کیا ہے؟ اگر آپ نے فن سے یہ مراد لیا ہے (جس کی طرف آپ کے محذوف جملوں میں اشارہ ہے) کہ کوٹیشن کا استعمال ذہانت' ذکاوت اور مہارت کا مطالبہ کرتا ہے تو اس سے کون انکار کرتا ہے۔ آپ کے معترض یہی تو کہتے ہیں کہ آپ کے اور آپ کے تربیت یافتہ ریسرچ اسکالرز کے جمع کردہ اقتباسات کو ذہانت اور مہارت سے بروئے کار لاتے ہوئے ایک منضبط و مربوط تحقیقی یا تنقیدی مقالے میں نہیں ڈھالا ہوتا۔ یعنی

وہ ایک Organized entity منظم وجود نہیں بن پاتا۔ آپ کے جمع کردہ اقتباسات منتشر، بے جوڑ، مہمل اور غیر منظم رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ موضوع کی متابعت کرتے ہوئے اپنی Entity کو قربان کر کے باہم مدغم ہو کر کسی نتیجہ یا تھیسز کو جنم نہیں دیتے یہ ڈاکٹر معین الرحمن کی بہ حیثیت مؤلف، مصنف اور مرتب سخت ناکامی ہے اور 1974ء سے 2004ء تک کے سیشنز کے زیر تربیت ریسرچ اسکالرز کی بدنصیبی ہے کہ انہیں ذہنی، علمی، تحقیقی اور تنقیدی تربیت نصیب نہ ہوئی اور وہ اپنی آئندہ زندگی میں کسی وقیع علمی کام کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ 1974ء سے نومبر 2002ء تک ڈاکٹر صاحب کے دامن تربیت سے وابستہ ''امتحانی مقالہ نگار'' تحقیق کی بجائے عملی طور پر ''خفی سرقہ'' میں مستغرق رہے۔ ہم تحقیقی مقالہ میں کوٹیشن کے تصرف کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے مختلف رموز و نکات کا بیان کرنا چاہتے تھے مگر پہلے ہی متعدد فروعی مباحث نے بہت جگہ گھیر لی ہے لہٰذا ہم ریسرچ کی تدریس پر ایک کتاب میں کوٹیشن کی بحث سے چند فقرے نقل کریں گے۔ امید ہے ان سے تحقیقی مقالہ کی بُنت میں کوٹیشن کی کارگزاری کا تصور کسی حد تک واضح ہو جائے گا۔

پروفیسر Lymn Quitman Troyka نے نوآموز اور مبتدی مؤلفین کی راہنمائی کے لیے اپنی کتاب Simon & Shuster Hand Book for Writers میں کوٹیشن پر اپنے باب میں لکھا ہے:

When you use quotations in your writing, however, you confront two conflicting demands. You want the effect and support of quotations, but you also want your writing to be fluent, coherent and readable. You gain authority by quoting experts on the topic, but if you use too many quotations, you lose coherence, as well as control of your own paper. Rather than a single piece of carefully woven fabric, you get a patchwork quilt. As a general rule, if more than a quarter of your paper consists of quotations, your instructor and other readers will assume that you have done little thinking on your own. A paper over loaded withquotations becomes what some people call a "scotch tape special". Your words and thinking about subject are paramount. Use quotations sparingly, therefore. when you want to draw on support from an authority, rely mostly on paraphraseand summary.

[Published by: Prentice Hall, Inc., Englewood Cliffs, New Jersy, 1987. p.524-525.]

ڈاکٹر معین الرحمن کے مضامین اور مقالات کا گہری نظر کے بغیر مطالعہ بھی یہ حقیقت منکشف اور بے حجاب کر دیتا ہے کہ ان سے منسوب تحریریں اقتباسات کی بھرتی ہیں یا کوٹیشنز کی پیوند کاری۔ اس سلسلے کی اگر ایک نمائندہ تحریر کو بطور مثال پیش کرنا ہو تو اس کے لیے شاید وہ خود بھی اپنے مضمون ''اقبال پر غالب کا اثر اور ان کی گرفت'' کا ہی انتخاب کر لیں جو وہ اپنی مرتبہ (مصنفہ نہیں) کتاب ''جہانِ اقبال'' کے علاوہ بھی دو تین جگہ شائع کر چکے ہیں۔ (غالباً اس کی پہلی اشاعت مجلہ ''تحقیق نامہ'' شمارہ 3-4 (1994-95ء) صفحہ 81

تا 102 ہے۔ دوسری بار کتاب نقوش غالب 1995ء تیسری بار جہان اقبال 1995ء میں شائع ہوا) اس مضمون کے عنوان ہی میں سلاست 'روانی' قطعیت اور ابلاغ کی کمی ہے۔ البتہ اس اٹھارہ صفحے کے مضمون کے تیرہ سطری تعارف میں ایک جملہ اس کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ ان کے مطابق ''واقعہ یہ ہے کہ طالب علمی کے دور سے آخر عمر تک اقبال' غالب کے اثر اور ان کی گرفت سے نہیں نکلے۔''(1) (دیکھیے جہان اقبال صفحہ 167) حوالہ کے اس نشاں (1) سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جملہ بھی ان کا اپنا نہیں ہے۔ اس نشان/نمبر حوالہ کے مطابق حاشیہ میں تین مآخذ درج کیے گئے ہیں یعنی ''افکار غالب'' (خلیفہ عبدالحکیم) 2۔ ''اقبال کے حضور'' (سید نذیر نیازی) '3۔ ''جاوید نامہ'' (طبع اول) ڈاکٹر صاحب کا محولہ فقرہ کس سے منسوب سمجھا جائے؟ اگر موصوف نے ان تینوں مآخذ کا مجموعی تاثر بیان کیا ہے تو اس کے لیے بیسیوں دوسرے حوالے کیوں چھوڑ دیے گئے؟

اس سلسلے میں خبر یہ ہے کہ تیس اقتباسات پر مشتمل اس ''مضمون'' کا اختتامی (Concluding) پیرا بھی ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے پچاس برس قبل تحریر کیے گئے مضمون کا ایک اقتباس ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا یہ ''محررہ مضمون'' کس زمرے میں رکھا جائے گا؟ کیا یہ مضمون ایک ''ریسرچ پیپر'' ہے۔ کیا یہ مضمون ایک تجربہ کار پروفیسر (انہیں 1974ء میں یہ منصب ملا تھا) محقق 'مصنف' مؤلف 'مرتب' مدیر اور ممتحن کے شایان شان ہے؟ کس بنیاد پر اسے ایک معیاری تحقیقی مضمون قرار دیا جائے گا؟ اس مضمون کا غالب شناسی کی تاریخ میں کیا مقام ہے؟ وقار عظیم مرحوم کی ترکیب ''منطقی خوش استدلالی'' تو دور کی بات ہے' کیا اس مضمون میں کوئی تحقیقی یا تنقیدی منطق ہے؟ اگر کسی کو اس مضمون کے اقتباسات میں منطقی ربط نظر آئے تو بتائے۔ کیا ایک مضمون کی عبارت میں ربط' تسلسل اور خیال کا آغاز یا ارتقا اور انجام اس کا بنیادی تقاضا نہیں ہے؟

کیا یہ مضمون ہمارے تعلیمی و تدریسی 'علمی' ادبی اور تحقیقی زوال اور معیار کی پستی کا منہ بولتا ثبوت نہیں ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا یہ مقالہ/مضمون مجلہ ''تحقیق نامہ'' شمارہ 3-4 (1994-95ء) میں صفحہ 81 سے شروع ہو کر 102 پر ختم ہوا۔ اس سے اگلے صفحے یعنی 103 سے ان کا دوسرا مضمون بعنوان ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی'' شروع ہو کر صفحہ 107 کی آخری سطر پر ختم ہوتا ہے۔ دوسری بار یہ دوسرا مضمون کتاب ''نقوش غالب'' (1995ء) 'تیسری بار ''تحقیق نامہ'' شمارہ 6-7 (98۔1997ء) میں 'چوتھی بار کتاب ''تحقیق نامہ غالب'' (1998ء) میں اور پانچویں بار سیدہ افصح وحید نے اپنے ایم اے اردو کے امتحانی تحقیقی مقالہ (1996ء) کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کیا۔ یہ امتحانی مقالہ 2002ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

راقم اپنی کوتاہی 'علمی بے توجہی' ادبی محرومی اور بدنصیبی کا اعتراف کرتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے متذکرہ مضمون کی پانچ بار مکرر اشاعت کے باوجود وہ اس کے مطالعہ کی طرف راغب نہ ہو سکا۔ پروفیسر سیدہ افصح وحید کا امتحانی تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری' بطور غالب شناس'' طبع ہونے پر خرید کیا۔ متذکرہ بالا

مضمون کو بطور ضمیمہ کتاب میں شامل دیکھ کر ٹھٹکا۔ گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ اس کتاب کے دونوں ضمیمے اصطلاحی اور تکنیکی لحاظ سے ضمیموں کی جگہ چھاپنے درست نہیں۔ اگر اس طرح کے مضمون ضمیمے قرار پا سکتے ہیں تو ان سے پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب پر سب تحریریں ضمیمہ یا ضمیموں کی جگہ چھاپنی چاہییں تھیں۔ بہر حال زیادہ مناسب اور مفید ہوگا اگر ہم یہاں ضمیمہ (Appendix) کی ایک فنی اور اصطلاحی وضاحت ایک نظر دیکھ لیں۔ Kate L. Turabian نے لکھا ہے:

The appendix stands in somewhat the same relation to the paper as content footnotes in that it provides a place for material that is not absolutely necessary to the text. In it may be placed tables too detailed for text presentation; technical notes on method, and schedules and forms used in collecting materials; copies of documents not generally available to the reader; case studies too long to be put into text; and sometimes illustrative materials.

[Turabian, Kate L. , A Manual for Writers; Chicago & London, the University of Chicago Press, 1967, p. 126]

اس بحث کی روشنی میں یہ بات سمجھی جانی چاہیے کہ امتحانی مقالہ نگار سیدہ افصح وحید کو غلط مشورہ دیا گیا ہے۔ اس مشورہ پر مقالہ نگار نے عمل کرتے ہوئے پروفیسر وقار عظیم کے 'کتاب'' غالب' شاعر امروز وفردا'' از ڈاکٹر فرمان فتح پوری پر رسالہ ''نقوش'' 1971ء میں تبصرہ اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مضمون'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی'' کو ضمیمہ کے مقام پر شامل کیا۔ البتہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے زیر بحث پسندیدہ مضمون کو جسے وہ مکرر شائع کیے جا رہے ہیں' ایک معیاری علمی مضمون کے طور پر قبول کرنا ممکن نہیں۔ ہم اس سلسلے میں خود احتسابی کے عمل سے بھی گزرے اور سوچا کہیں ہماری یہ رائے ہمارے تعصب کی پیداوار تو نہیں مگر ہم اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہماری رائے درست اور صائب ہے۔ ہم اس انسانی کمزوری سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ انسان عام طور پر اپنے خلاف فیصلہ نہیں کرتا۔ اس لیے ہم قارئین سے اس مضمون کے مطالعہ کی درخواست کرتے ہیں تاہم اس پر اپنے حواشی لکھنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں جن سے کلی طور پر یا جزواً کسی قاری کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی: ایک جائزہ

(مضمون از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

زیر بحث مضمون کے مطالعہ سے پہلے اس کے تصنیفی پس منظر اور محرک سے آگاہی کار آمد اور مفید ثابت ہوگی۔

ہمارے تین زعما غالب' قائد اعظم اور اقبال کی صد سالہ تقریبات نے جس طرح ناشران اور تاجران کتب کی قسمت بدل دی' اسی طرح بہت سے مصنفین کی تصنیفات کے بیشتر اور غالب حصہ میں ان

تقریبات کی کارفرمائی شامل ہے۔ بہت معیاری کتب اور رسائل تو اکا دکا ہی ہوں گے مگر جیسی جیسی غیر معیاری کتب، رسائل وجرائد یعنی مطبوعات ان تینوں زعما کے حوالے سے مرتب یا تالیف وترجمہ ہوئی ہیں، وہ بھی ایک مثال ہی ہے۔ انہی تقریبات کے زمانے میں چار نئے اسمائے صفات کا چلن ہوا۔ یعنی اختصاص اور متخصص، شناس اور شناسی جس نے بھی کونے کھدروں سے غیر معتبر ضمنی طور پر لکھے ہوئے مضمون جمع کر کے اپنے نام کے ساتھ مرتب کا سابقہ لکھ کر مجموعہ چھپوالیا وہ اس شخصیت کا اسپیشلسٹ قرار پایا۔ چونکہ ان تقریبات کے انعقاد اور اس موقع پر اشاعت کتب و رسائل کے لیے گورنمنٹ، نیم سرکاری اداروں اور انشورنس کمپنیوں وغیرہ نے خطیر رقوم مخصوص کی تھیں اور ان کا زیادہ حصہ لائبریریوں خصوصاً سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو ملا، ان حلقوں سے کتابوں کے آرڈر ناشرین کے لیے بھگتانے مشکل ہو گئے۔ پھر طلب اور رسد کی اس بھاگ دوڑ میں مختلف شعبوں کے لوگوں نے اپنے اپنے انعامات اور ثمرات وصول کیے۔ اس ہمہ ہمی اور گہما گہمی سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ کہیں کہیں کسی جینوئن سکالر کو بھی اپنی کارکردگی کے مظاہرے کا موقع مل گیا۔

پاکستان اور ہندوستان میں 1969ء غالب صدی کی تقریبات کا سال ہے۔ مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس موسم کی پیداوار نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غالب پر ان کا پہلا فکری مطالعہ بعنوان ''غالب کے کلام میں استفہام'' 1952ء میں شائع ہوتے ہی مقبول ومشہور ہو گیا تھا۔ ان کا غالب پر پندرہ مضامین پر مشتمل پہلا مجموعہ ''غالب شاعر امروز فردا'' ستمبر 1970ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اب معلوم نہیں یہ مجموعہ خود مصنف نے ترتیب دے کر ناشر کو اشاعت کے لیے پیش کیا یا پبلشر کی فرمائش پر مصنف نے مرتب کر کے دیا۔ اس کی اشاعت کے بعد ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر نیشنل بک کونسل کے ماہنامہ کتاب لاہور کے زیر اہتمام بزم کتاب لاہور نے 31 اکتوبر 1970ء کو مولانا حامد علی خاں کے زیر صدارت تعارفی تقریب منعقد کی جس میں مولانا غلام رسول مہر، پروفیسر سید وقار عظیم، میرزا ادیب اور سجاد باقر رضوی نے مختلف تعارفی مضمون پڑھے۔ اس تقریب کی رپورٹ روزنامہ امروز کے احسان بی اے نے اپنے 2 نومبر 1970ء کے اخبار میں شائع کی۔ سید وقار عظیم کا یہ تبصرہ ''نقوش'' لاہور 1971ء میں شائع ہوا۔ ایک تبصرہ ستار طاہر مرحوم نے ماہنامہ ''کتاب'' لاہور 5 شمارہ جنوری 1971ء میں اپنے اختلاف کے ساتھ شائع کیا۔ [دیکھیے اس تبصرہ اور روزنامہ ''امروز'' کی رپورٹ کے لیے مجلہ ''تحقیق نامہ'' شمارہ 6-7 (98-1997ء) یا اسی مجلہ کی کتابی شکل موسوم بہ ''تحقیق نامہ غالب، لاہور''، ''تحقیق نامہ غالب'' 1998ء] قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک سامع کی حیثیت سے ڈاکٹر معین الرحمن بزم کتاب کے اس اجلاس میں شریک تھے۔

اسی طرح مجلہ ''تحقیق نامہ'' شمارہ 3-4 میں ڈاکٹر معین الرحمن کے مضمون ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی'' سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے متذکرہ بالا روزنامہ امروز کی رپورٹ، مجلس میں پڑھے گئے مضامین، سید وقار عظیم اور ستار طاہر کے تبصرے محفوظ رکھے تھے جن کی بنیاد پر انہوں نے 1994ء

میں اپنا زیرِ حوالہ مضمون لکھ کر محولہ بالا شمارہ میں شائع کر دیا۔ نگران کا اصل ہدف کالی داس گپتا رضا تھے۔ اسی زمانے میں انہیں کالی داس گپتا رضا سے بوجوہ انس پیدا ہوا۔ انہیں وہ اپنے زیرِ احسان کرنا چاہتے تھے لہٰذا اُن کے اعتراف عظمت کے لیے وہ ''تحقیق نامہ'' کے گوشہ کالی داس کی تیاری میں مصروف ہو گئے اور ساتھ ساتھ 96-1995ء میں دو طالبات کو کالی داس گپتا رضا پر امتحانی مقالات کی تکمیل پر مامور کر دیا۔ غالباً ان کے VIVA کسی قدر تاخیر سے ممکن ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صرف کالی داس گپتا رضا پر ''تحقیق نامہ'' کے خصوصی گوشہ کی اشاعت میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا داخلی حجاب مانع تھا' چنانچہ انہوں نے گوشہ فرمان فتح پوری کو شیلڈ بنا کر کالی داس گپتا رضا پر ایک گوشہ شائع کرنے کی رسم پوری کر دی۔ ہماری ناقص رائے میں دونوں گوشے وقیع قرار نہیں دیے جا سکتے۔ محض خانہ پری کی کوشش نظر آتے ہیں۔ مثلاً فرمان فتح پوری پر روز نامہ ''امروز'' سے منقول رپورٹ میں کوئی جان نہیں ہے۔ دو مضمون سیدہ افصح وحید کے امتحانی تحقیقی مقالہ کے دو باب ہیں۔ ان پر ہم طالبہ کی دل شکنی سے اجتناب کرتے ہوئے کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ عزیزہ عاصمہ وقار کا اشاریہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی نگرانی میں مرتب کیا گیا ہے مگر اس میں انہیں معلوم اندراجات مثلاً رسالہ ''کتاب'' اور رسالہ ''نقوش'' میں طبع ہونے والے تبصروں کا ہی اندراج نہیں ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ کئی حوالے اشاریہ میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔

اب پہلے ڈاکٹر معین الرحمٰن کا متذکرہ بالا مضمون ملاحظہ فرمائیے:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے پندرہ مقالات پر مشتمل ایک مجموعہ ''غالب: شاعرِ امروز و فردا'' ستمبر 1970ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم کے لفظوں میں' کسی شاعر کو بیک وقت شاعرِ امروز اور شاعرِ فردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیان فصل و بعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانونِ فطرت نے ہر عہد کے انسان کو منسلک کیا ہے۔ فرمان صاحب نے غالب کو اسی مفہوم میں شاعرِ امروز و فردا کہا ہے اور اُن کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کے احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی صورت دی ہے۔

(نقوش' لاہور' غالب نمبر: 3' 1971ء' ص: 604)

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جس تواتر اور انہماک کے ساتھ تنقید اور تحقیق کو اپنا شغل

اور شعار بنایا ہے اُس کی کوئی دوسری مثال ہماری کسی یونیورسٹی کے کسی اُردو شعبے سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ غالب سے فرمان صاحب کو ایک گونہ شغف ہے۔ ''غالب: شاعر امروز و فردا'' اُن کے اسی مدۃ العمر کے عشق کا مظہر ہے۔ پندرہ مقالات پر مشتمل اس کتاب کے بعض خالصتاً تحقیقی مضامین، غالب کی زندگی کے بارے میں نئی معلومات کے حامل ہیں، بعض ایک نئے تنقیدی زاویے سے غالب کے فکر و فن کے مخفی گوشوں کو سامنے لاتے ہیں اور بعض مضامین میں تحقیق و تنقید، دونوں کے خوشگوار امتزاج سے قابلِ قدر نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

غالب صدی پر بلا مبالغہ کئی سو کتابیں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے، خود میرے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں صرف غالب صدی کے موقع پر شائع ہونے والی دو سو سے زیادہ کتابیں (یا کتابی اہمیت کی چیزیں) موجود ہیں لیکن بقا صرف اُن چیزوں کے لیے ہے جو عالم انسانیت کے لیے نفع بخش ہوں۔ غالب پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کتاب اُن کے کم و بیش ایک چوتھائی صدی کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ فرمان صاحب کے نقطۂ نظر میں تازگی اور اسلوب میں توانائی ہے اور اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اہم کتاب، غالب صدی پر شائع ہونے والی ان سینکڑوں کتابوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ یہ کتاب پاکستان اور پاکستان سے باہر دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں اضافی مطالعے کے لیے تجویز کی گئی ہے اور بہت شوق سے برابر پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔

غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پہلا معلوم مقالہ ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے موضوع پر ہے۔ ''غالب: شاعرِ امروز و فردا'' میں شامل ان کا یہ مقالہ چالیس بیالیس برس پہلے رسالہ ''نگار'' لکھنؤ شمارہ مئی 1952ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ نہ صرف اپنے موضوع پر غالبیات میں پہلا مقالہ اور مطالعہ ہے بلکہ اب چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی معنوی دلپذیری اور اس کی شادابی اور تازگی میں سر مو فرق نہیں آیا۔

کلامِ غالب کے استفہامیہ لب و لہجے کے بارے میں اس خیال افروز اور خیال انگیز مقالے نے غور و فکر کی راہیں سجھائیں اور بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے رسالہ ''غالب نامہ'' دہلی (شمارہ جولائی 1987ء) میں فرمان صاحب کا حوالہ دیے بغیر ''اندازِ گفتگو کیا ہے'' کے عنوان سے غالب کے طرزِ استفہام کا مطالعہ کیا ہے۔ عاصمہ اعجاز نے بالکل درست کہا ہے کہ ''شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک بہت معروف مقالے ''غالب کے کلام میں استفہام'' (مطبوعہ ''نگار'' لکھنؤ مئی 1952ء) کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ ان کی ایک کتاب تحقیق و تنقید (کراچی 1963ء) نیز ان کی ایک دوسری بہت اہم کتاب ''غالب: شاعرِ امروز و فردا'' (لاہور 1970ء) میں بھی شامل ہے۔ یہ مقالہ ''تنقیدِ غالب کے سو سال'' نامی کتاب (مرتبہ فیاض محمود پنجاب

یونیورسٹی لاہور 1969ء) میں بھی منتخب ہوا۔"

(غالب نامہ 'تجزیاتی مطالعہ' عاصمہ اعجاز 1994ء)

میں فرمان صاحب کے اس مقالے کو غالبیات میں بیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین مطالعات میں شامل اور شمار کرتا ہوں۔

مئی 1952ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ "نگار" (لکھنؤ) کے صفحات پر اوّل اوّل سامنے آیا اور ہند تا سندھ لہر درلہر تحسینی مباحث کا باعث ہوا۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی رسالہ "نگار" لکھنؤ کی ذہنی زندگی کے عجائبات میں سے تھا۔ اونچے طبقے میں صاحبِ علم اور صاحبِ ذوق ہونے کی پہچان یہ تھی کہ "نگار" کا خریدار ہو اور اس کی رایوں پر بحث کر سکتا ہو۔ "نگار" محض ادبی جریدہ نہیں بلکہ ایک ادارہ 'ایک رجحان' ایک قدر تھا۔ "نگار" کا نام ندوۃ العلماء' سلطان المدارس اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ لیا جاتا تھا اور "نگار" میں مضمون چھپ جانا ویسا ہی تھا جیسا کہ ان علمی اداروں سے سند مل جائے۔

(نگار پاکستان کراچی۔ نیاز نمبر حصہ اوّل سالنامہ 1963ء ص: 122)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اسی "نگار" سے مئی 1952ء میں ان کے مقالے "غالب کے کلام میں استفہام" کی اشاعت پر ادبی تنقید کی سند ملی۔ یہ چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے۔ جبکہ "آج" کے بہت سے "نامور" غالب شناسوں نے غالب پر لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ یا غالب سے متعلق ان کی کوئی قابلِ ذکر تنقیدی تحریر اس وقت (1952ء کے نصف اوّل) تک سامنے نہیں آئی تھی۔ مجھے نہیں خیال کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' ڈاکٹر یوسف حسین خاں' کالی داس گپتا رضا' ڈاکٹر وحید قریشی' مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی' ڈاکٹر گیان چند' اسلوب احمد انصاری' ڈاکٹر نثار احمد فاروقی' ڈاکٹر خلیق انجم' اکبر علی خاں عرشی زادہ اور قدرت نقوی ایسے ممتاز غالب شناسوں کی غالب سے متعلق کوئی قابلِ لحاظ تنقیدی تحریر 1952ء سے پہلے شائع ہو کر توجہ کا مرکز بنی ہو۔

"غالب: شاعرِ امروز و فردا" میں فرمان صاحب کے پندرہ مقالے شامل ہیں جو 1952ء سے 1969ء تک کا حاصل ہیں لیکن یہ اس عرصے کا کل حاصل نہیں --- غالب کے بارے میں بہت سی تحریریں اس کتاب میں شامل نہیں۔ مثلاً اس جگہ فرمان صاحب کی ان تحریروں کے چند حوالے بے محل نہ ہوں گے:

1۔ غالب کا ایک غیر معروف قطعہ' افکار نو' لاہور' فروری 1961ء
2۔ غالب و انیس کا زمانہ۔ رباعی کا ایک اہم دور' مشمولہ: اردو رباعی 1962ء
3۔ جدید اردو غزل' غالب سے حالی تک' سالنامہ نگار' کراچی 1965ء
4۔ "غالب اور دوسرے مضامین" (تبصرہ) نگار' کراچی' جنوری 1966ء
5۔ "جہانِ غالب" (تبصرہ) نگار' کراچی' اکتوبر 1966ء
6۔ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی' سیپ' کراچی شمارہ: 8

7۔ ''روح المطالب فی شرح دیوانِ غالب'' (تبصرہ) نگار' کراچی' مارچ 1968ء

8۔ ''احوال ونقدِ غالب'' (مقدمہ / تبصرہ) نگار کراچی' ستمبر 1967ء

9۔ غالب وسرسید' ہماری زبان' علی گڑھ' 15 نومبر 1968ء

''پھر 1969ء کے بعد اب (1994ء) تک غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مختلف مواقع اور حوالوں سے اتنا کچھ مزید لکھا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو ایک مستقل مجموعے کو کفایت کرے لیکن یہاں میں ان کے صرف ایک مقالے کا ذکر کروں گا۔'' کیا دیوان غالب نسخۂ امروہہ واقعی جعلی ہے؟'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان کا یہ معرکہ آرا تحقیقی مطالعہ رسالہ'' غالب'' کراچی (شمارہ 9،8 سال 77-1976ء) میں شائع ہوا۔ اس مقالے کے مشمولات سے جزوی یا کلی اختلاف یا اتفاق ہونا نہ ہونا ایک الگ بحث ہے جس کا یہ محل نہیں لیکن یہ مقالہ فرمان صاحب کی جرأت اظہار کی بہت اچھی مثال ضرور ہے اور اس موضوع پر بلا قید مقام اور وقت جہاں اور جب بھی بحث ہوگی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اس مقالے سے صرف نظر نہیں کیا جا سکے گا۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ غالب کے بارے فرمان صاحب ہنوز برابر سوچ رہے ہیں لکھ رہے ہیں اور ان کا قلم آج بھی غالب کی کھوج میں رواں دواں ہے چنانچہ پچھلے دو برسوں میں تنقید غالب کے سلسلے میں ان کے بعض بہت اہم مقالات شائع ہوئے ہیں مثلاً:

1۔ ہم عصر سماجی مسائل کا ادراک اور غالب
(غالب نامہ (دہلی) جولائی 1992ء سالنامہ صریر کراچی 1991ء)

2۔ غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر
(سہ ماہی تمثال (کراچی) شمارہ 4/9 جلد 1' 1993ء)

3۔ غالب کی شاعری اور مسائل تصوف
(سالنامہ ''صریر'' کراچی بابت جون' جولائی 1993ء)

4۔ کلام غالب میں لفظ ''تمنا'' کی تکرار
(قلمی زیر طبع ماہنامہ اوراق لاہور)

کہنا یہ ہے کہ فرمان صاحب نے ''غالب: شاعر امروز و فردا'' کی اشاعت کے بعد پچھلے 25-24 برس میں بھی غالب سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا' اگرچہ وہ صرف غالب ہی کے ہو کر کبھی بھی نہیں رہے! انہوں نے ایک موقع پر کہا ہے کہ:

''غالب کی شخصیت یک پہلو نہیں' ہشت پہلو ہے' ان کا فن یک رنگ نہیں صد رنگ ہے' ان کی ادبیت یک شیوہ نہیں ہزار شیوہ ہے' ان کی ذات یک صفت نہیں جامع الصفات ہے' اردو میں ان کی اولیات ایک دو نہیں متعدد ہیں اور شعر و ادب پر ان کے احسانات دو چار نہیں بے شمار ہیں۔''

میں یہی بات خود فرمان صاحب کے بارے میں کہتا ہوں محض کہتا ہی نہیں اس پر ایمان بھی رکھتا ہوں۔ (1994ء)

A-1: اس مضمون کے پہلے دو فقرے ہی ''عنوان اور مضمون'' میں تناقض ظاہر کر دیتے ہیں۔ کسی مضمون کے Opening یعنی سر آغاز کے فقروں کو موضوع کی ایک جھلک دکھانے کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔ مگر یہاں دونوں فقرے اپنا وظیفہ ادا نہیں کرتے۔ اس مضمون کے ابتدائی دو فقرے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب پر تبصرہ کا آغاز معلوم ہوتے ہیں۔ گویا یہ مضمون اپنے عنوان پر اظہار خیال کی بجائے متذکرہ کتاب پر تبصرہ ہے۔

B-1: دوسرے فقرے کے آخری الفاظ ''شائع ہوا'' جامد نہیں ہو جانے چاہیں انہیں آگے نئے لفظوں میں بتانا چاہیے تھا۔ ''تو پھر کیا ہوا'' یا پھر ان دو فقروں کو ایک پیرا قرار دیا جاتا۔ پروفیسر وقار عظیم کی کوٹیشن استعمال کرنے سے پہلے ایک دو جملے اس کوٹیشن کی پیشکش کے لیے لکھے جاتے۔

C-1: پروفیسر وقار عظیم کی کوٹیشن اس مضمون کی پانچوں اشاعتوں [1۔ ''تحقیق نامہ'' 3-4، 2۔ ''تحقیق نامہ'' 6-7، 3۔ تحقیق نامہ غالب، 4۔ ضمیمہ کتاب ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس، 5۔ ''نقوش غالب''] میں بغیر واوین (Quotation Marks) درج کی گئی ہے۔ اس رواں انداز سے کوٹیشن کی عبارت ڈاکٹر معین الرحمٰن کے الفاظ پر مشتمل معلوم ہوتی ہے اور یہ فعل اس کو ''سرقہ خفی'' کے ذیل میں لے آتا ہے۔ مادام ہیکر کے مطابق:

Two different acts are considered plagiarism;

(1) Borrowing someone's ideas, information, or language without documenting the source and (2) Documenting the source but parapharsing the source's language too closely, without using quotation marks to indicate that words and phrases have been borrowed."

[Hacker, Diana, The Bedford Hand Book for Writers, Boston,Bedford Books of St. Martin's Press, U.S.A, 1991, 3rd Edition p.507.]

D-1: ڈاکٹر معین الرحمٰن نے یہاں کوٹیشن کے فنی استعمال میں ایک اور کوتاہی کی ہے۔ انہوں نے ''۔۔۔منسلک کیا ہے'' پر ختم ہونے والے چار فقروں کے بعد سات فقرے حذف کرتے ہوئے ''منسلک کیا ہے'' کو ''فرمان صاحب نے غالب۔۔۔صورت دی ہے'' کے ساتھ جوڑ دیا مگر محذوف سطور کی جگہ نقطے (The ellipsis mark) استعمال نہیں کیے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے ماخذ (نقوش 1971ء) کا Causual حوالہ دیا ہے جو سید وقار عظیم کے مضمون کے عنوان کے حوالہ کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے کوٹیشن دینے کے اس طریق کار نے کوٹیشن کا احساس اور تاثر کافی حد تک تحلیل کر دیا ہے۔

E-1: کسی مضمون کے پہلے ہی پیرا میں اپنے خیالات کا سارا بوجھ کو نیشن پر ڈال کر خود اس تحریر سے الگ ہو جانے کو مضمون نگاری / مقالہ نگاری کے فنی مباحث میں مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ اصول و قواعد کی بحث الگ' یوں یہ طریق کار بھی حسن ذوق کے لیے ناگوار ہوتا ہے۔

A-2: اس مضمون کا دوسرا پیرا گراف بھی ایک مضمون میں پیرا گراف کے فنی تقاضے کو پورا نہیں کرتا۔ جس طرح کسی پیرا گراف کے اجزا یعنی جملوں میں باہمی ربط اور گہرا تعلق ضروری ہوتا ہے' اسی طرح مضمون کے مقدم پیرا گراف اور اس کے بعد کے پیرا گراف میں بھی پیوستگی ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً زیر بحث مضمون کے دوسرے پیرا گراف کے پہلے تین فقرے' پہلے اور دوسرے پیرا گراف میں حارج ہوتے ہیں۔ [علاوہ ازیں قطعی بے بنیاد اور غلط دعویٰ کے حامل بھی ہیں۔ یہ کہنا کہ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جس تواتر اور انہماک کے ساتھ تنقید اور تحقیق کو اپنا شغل اور شعار بنایا ہے' اس کی کوئی دوسری مثال ہماری کسی یونیورسٹی کے کسی اردو شعبے سے پیش نہیں کی جا سکتی'' معذرت کے ساتھ عرض ہے' بے علمی کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے]

B-2: زیر بحث تینوں فقرے قطعی طور پر بے تعلق irrelevent بلا مقصد اور بلا ضرورت ہیں اسے Sweeping statement کہنا چاہیے۔ قارئین کرام اس مضمون کے یہ فقرے خارج یا قلم زد کرنے کے بعد یہ پیرا مطالعہ فرمائیں۔

C-2: تنقیدی' تحقیقی' معلوماتی یا تعارفی نوعیت کا مضمون / مقالہ ہر فقرے کی حد تک وضاحت اور صراحت کا متقاضی ہوتا ہے۔ ابہام یا ایہام بنیادی طور پر تنقیدی یا تحقیقی زبان کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہاں زبان و بیان میں سلاست' وضاحت اور قطعیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیان کے casual اور اشاراتی انداز سے قاری (تنقیدی تحقیقی تحریروں کا قاری عموماً طالب علم ہوتا ہے) کو اگر خود ہی سوچنا اور نتائج پر پہنچنا ہے تو وہ کسی نقاد یا محقق کا منت پذیر کیوں ہو۔ مثلاً زیر نظر مضمون کے دوسرے پیرا میں یہ طرز بیان کہ۔۔۔ اس کتاب کے بعض تحقیقی مضامین۔۔۔ نئی معلومات کے حامل ہیں' بعض۔۔۔ نئے تنقیدی زاویے۔۔۔ مخفی گوشوں۔۔۔ بعض مضامین تحقیق و تنقید کے خوشگوار امتزاج۔۔۔ قابل قدر نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔'' مصنف کے عجز اظہار کا ثبوت ہے یا نہیں مگر یہ بتانا اس کا فرض ہے کہ کون سے مضمون تحقیقی' کون سی تحقیق و تنقید کا امتزاج ہیں اور ان میں کونسی نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں اور نئے تنقیدی زاویے ابھار کر'' قابل قدر نتائج'' حاصل کیے گئے ہیں؟

A-3: تیسرا پیرا بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ژولیدہ بیانی اور کوتاہ قلمی کا نمونہ ہے۔ پہلے جملے ہی میں ''غالب صدی پر'' کے ٹکڑے کو دیکھیے۔ شاید انہیں ''غالب صدی کے موقع پر'' کہنا تھا۔ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے یہ ایک قاری کیوں بتائے؟

B-3: تنقید' تحقیق یا تعارف کے معروضی بیان میں مصنف کو اپنی ذات سے الگ ہو کر کھڑے ہونا

پڑتا ہے۔ خودنمائی کی باتیں معروضی اظہار و بیان کے تاثر کو ہی نقصان نہیں پہنچاتیں اُس کے ارتکاز کو بھی خراب کرتی ہیں۔ یہاں ''ذاتی ذخیرۂ غالبیات'' کا بیان داخل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

C-3: ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ہاں لفظ ''لیکن'' کا موزوں استعمال بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اگر وہ یہ کہتے ''لیکن ان میں تحقیق و تنقید کے اعتبار سے معیاری کتابیں معدودے چند ہیں۔'' بہتر اظہار ہوتا۔

''لیکن بقا صرف اُن چیزوں کے لیے ہے جو عالم انسانیت کے لیے نفع بخش ہوں۔'' ذوق خطابت یا فلسفہ اخلاقیات سے دلچسپی کا کیسا ہی مظہر کیوں نہ ہو مگر مضمون کے اس مقام پر بے جا طور پر داخل کیا گیا ہے۔

D-3: ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی (زیر تبصرہ) کتاب کی بقائے دوام کے بارے میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کی پیش گوئی اور نوید ہمارے لیے بھی اطمینان قلب کا باعث بنی ہے' فرمان صاحب ہمارے مہربان بزرگ دوست اور خیر خواہ ہیں۔ ہم بھی ان کے لیے نیک خواہشات کے جذبات رکھتے ہیں۔ کاش ڈاکٹر معین الرحمٰن سینکڑوں کتابوں کی ہمیشہ زندگی کا فیصلہ سناتے ہوئے ان میں سے سات آٹھ کتابوں کا نام لے دیتے تاکہ ان سے محترم فرمان صاحب کی کتاب کا تقابل کرتے ہوئے ہمارے یقین میں کسی قدر استقلال اور استحکام تو پیدا ہوتا۔

A-4: چوتھے پیرا میں فرمان صاحب کے غالب پر پہلے مضمون ''غالب کے کلام میں استفہام'' کی اول اشاعت کی چھ فقروں میں تاریخ بیان کرتے ہوئے چالیس برس بعد تک اس کی برقرار تازگی کا ذکر کیا گیا ہے۔

1-5: دو فقروں میں فرمان صاحب کے متذکرہ مقالہ کی تحسین اس کی خیال انگیزی کے وصف کی بنا پر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر معین کے مطابق ''بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا'' یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

a) کیا فرمان صاحب کے اس خیال میں قطعی طور پر کسی پیشرو کا فیضان شامل نہیں ہے؟

b) ''نامور نقادوں'' میں کتنے اور کون کون لوگ ہیں؟

c) اگر فرمان صاحب کا عطا کردہ 'نور بصیرت' عام ہوا ہے تو یہ ان کی خوش نصیبی ہے۔

d) ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے چراغ سے چراغ روشن کرنے کے سطحی' منفی اور بدنام معنی مراد لیے ہیں۔ انہوں نے اس محاورے کی لفظی' معنوی' منطقی اور تاریخی دلالتوں پر غور نہیں کیا۔

تحقیق کے فن اور Research Methodology پر مستند ترین اور آخری حوالہ کی کتاب The Chicago Manual of Style کے شذرہ نگار نے تصنیف و تالیف کی ہر نوع کا عمومی مآخذ اور مصدر بیان کرتے ہوئے جو فقرہ لکھا ہے۔ یوں جانیے ''چراغ سے چراغ جلانا'' کے محاورہ کو "Translate"

کر دیا ہے اُس کے مطابق:

"Almost every serious study depends in part on works that have preceeded it."
(The Chicago Manual of Style; New Delhi: Prentice Hall, 14th ed. p.356)

A-6: پیرا نمبر چھ کا ڈاکٹر معین الرحمٰن کے زیر بحث مضمون سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ سارا پیرا کم و بیش ایک کوٹیشن پر مشتمل ہے جو شمس الرحمٰن فاروقی کے خلاف بغض و عناد کے اظہار کے لیے منسلک کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا بہ حیثیت مضمون نگار یہ فرض تھا کہ وہ شمس الرحمٰن فاروقی پر الزام عائد کرتے ہوئے اُن نکات اور مقامات کی نشاندہی کرتے جہاں جہاں شمس الرحمٰن فاروقی پر سرقہ کا شائبہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کسی کے قول میں ملفوف الزام کی حیثیت سند اور ثبوت کی ہوتی ہے یا نہیں؟ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے الزام کی پرزور تائید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''۔۔۔عاصمہ اعجاز نے بالکل درست کہا ہے کہ ''شمس الرحمٰن فاروقی کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک بہت معروف مقالے 'غالب کے کلام میں استفہام' (مطبوعہ نگار لکھنؤ' مئی 1952ء) کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔'' [ڈاکٹر معین الرحمٰن کے امتحانی تحقیقی مقالات پر ان کی اصلاح کے انداز سے واقف لوگ قیاس کر سکتے ہیں کہ ''لطف اور بصیرت کا سامان'' ڈاکٹر معین الرحمٰن کا اضافہ ہے] ڈاکٹر معین الرحمٰن کو افادۂ عام کے لیے کسی قرینہ سے یہ بتانا ضروری تھا کہ عاصمہ اعجاز کی یہ کوٹیشن ان کے امتحانی مقالہ میں درج ہے اور موصوف خود اس مقالہ کے نگران کار تھے۔ معترضہ عزیزہ عاصمہ اعجاز کا فرض تو تھا ہی کہ وہ Sweeping Statement کے انداز میں الزام عائد نہ کرتیں۔ الزام کے لیے بالتخصیص نشاندہی تو لازمی شرط ہے۔ اسی طرح اس امتحانی مقالہ کے نگران کار کی بہ حیثیت گائیڈ ناقابلِ تلافی کوتاہی ہے کہ انہوں نے اپنے زیر نگرانی ریسرچ سکالر کو اس مقام پر وضاحت کرنے کی طرف متوجہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے شمس الرحمٰن فاروقی پر الزام کے حامل اس پیراگراف کو کسی ضرورت اور جواز کے بغیر اتنی بار شائع کیا ہے کہ اس میں اچھالنے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عمل سے خدا معلوم وہ عزیزہ عاصمہ اعجاز کو ناقد کی حیثیت سے establish کرنا چاہتے ہیں یا اپنے ایک معاصر کو سارق ثابت کر کے نیچا دکھانا چاہتے ہیں یا بیک وقت دونوں مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

2-6- اوپر کہا جا چکا ہے کہ موصوف کے زیر بحث مضمون میں ایک کوٹیشن پر مبنی یہ پیراگراف موضوع سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں اُنہیں پروفیسر ''ریسرچ میتھڈولوجی'' ہوتے ہوئے یہ بھی شعور نہیں کہ کسی اقتباس کا کتنا حصہ quote کرنا موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً زیر بحث پیرا میں ''۔۔۔سامان فراہم کرتا ہے۔'' پر کوٹیشن کا خاتمہ الزام کی صراحت نہیں کرتا۔

1-7- ساتواں پیرا ڈیڑھ سطر کے ایک فقرہ پر مشتمل ہے۔ کوئی ایسا فقرہ یا پیرا جو کسی قسم کے مضمون کی روانی اور تسلسل میں رخنہ اندازی کا باعث ہو' مضمون نگاری کے عیب میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اس سے زیر

بحث موضوع کی وضاحت یا توسیع میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ سنجیدہ بحث مضمون نگار کا محض اپنی خود نمائی کے لیے بحث سے غیر متعلق عبارت کا ایک لفظ برداشت نہیں کر سکتی۔

متذکرہ ڈیڑھ سطری پیرا دیکھیے:

''میں فرمان صاحب کے اس مقالے کو غالبیات میں بیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین مطالعات میں شامل اور شمار کرتا ہوں۔ خود ساختہ علامے' پروفیسر' حکیم اور ماہر نفسیات وغیرہ تو بہت پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ادب میں خود ساختہ اتھارٹی عام طور پر پنپتی دیکھی نہیں گئی۔

8۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کی کوٹیشن کے استعمال میں احتیاط کی شاید کوئی مثال نہ مل سکے۔ اس پیرا کے ایک ٹکڑے ''بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی رسالہ نگار لکھنؤ۔۔۔'' سے ''صاحب قول'' کا پتہ تو چل گیا مگر اس قول کے الفاظ اور سطور کے دونوں سروں پر واوین کا کوئی نشان نہیں ہے۔ اس پیرا سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کی طبیعت میں ''حسن ترتیب'' کا احساس اور ذوق نہیں ہے ورنہ وہ اس پیراگراف کو آٹھواں پیرا بنانے کی بجائے چوتھے پیراگراف میں مدغم کرتے۔

A-9۔ یہ پیرا پچھلے پیرا کی توسیع ہے۔ اس میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مقالہ ''غالب کے کلام میں استفہام'' ادبی تاریخ کا ایک کارنامہ ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں سمیت گیارہ لوگوں کے نام لکھنے کے بعد کہا ہے ''ایسے ممتاز غالب شناسوں کی غالب سے متعلق کوئی قابل لحاظ تنقیدی تحریر 1952ء سے پہلے شائع ہو کر توجہ کا مرکز بنی ہو۔''

اب یہ معاملہ ایک طرف ڈاکٹر معین الرحمٰن اور دوسری طرف ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے درمیان آ گیا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اپنے کسی اشاریہ ساز شاگرد کو اور ڈاکٹر تحسین فراقی اپنے کسی محقق شاگرد کو اسائنمنٹ دیں اور وہ 1952ء سے پہلے غالبیات کی صورت حال واضح کریں۔

B-9۔ یاد رہے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مضمون ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی'' کی ضخامت پانچ صفحات ہے۔ ان میں سے دو صفحات مقالہ ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے سرسری تعارف پر مبنی ہیں۔

10۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے زیر بحث مضمون کے پہلے فقرہ اور پیرا نمبر دس کے پہلے فقرہ کا مضمون کم و بیش الفاظ میں ایک ہے۔ اس کے بعد غالب پر فرمان صاحب کی ''نو تحریروں'' کی فہرست (گویا اقتباس) ہے جن میں سے چار کتابوں پر تبصرے ہیں۔

A-11۔ اس پیرا کے مطابق فرمان صاحب نے 1969ء تا 1994ء غالب پر جتنے مقالے لکھے ہیں۔ ان سے وہ دوسرا مجموعہ مرتب کر سکتے تھے۔ مضمون نگار نے ایک مقالہ ''کیا دیوان غالب نسخہ امروہہ واقعی جعلی ہے؟'' کو فرمان صاحب کی جرأت اظہار کی اچھی مثال قرار دیا ہے مگر اس کا نمونہ کوئی نہیں دیا۔

B-11۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ'' (جعلی) کا کون جابر پشت پناہ تھا جس کے سامنے دوسرے مبصروں کو اپنی رائے کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی۔ غالباً مضمون نگار نے ''جرأت اظہار'' کا توصیفی کلمہ دادِ تحقیق کی جگہ استعمال کیا ہے۔

12۔تین سطری بارہویں پیرا کا ایک فقرہ ''ان (فرمان صاحب) کا قلم آج بھی غالب کی کھوج میں رواں دواں ہے'' اس کے ثبوت میں دو سال (94-1992ء) کے دوران شائع ہونے والے فرمان صاحب کے تین مقالات اور ایک زیر طبع (بعد ازاں شائع ہوا بھی) مضمون کے عنوانات حوالوں سمیت ایک فہرست کی شکل میں درج کیے گئے ہیں۔

A-13۔آخری پیرے کی ابتدائی تین سطروں میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس سے پہلے پیرا ہی کا مضمون دہرایا ہے کہ فرمان صاحب کا غالب سے تعلق منقطع نہیں ہوا۔ آخر میں غالب کی عظمت کے اعتراف میں فرمان فتح پوری کے چھ چھوٹے چھوٹے پرجوش خطیبانہ جملوں کی کوٹیشن نقل کی گئی ہے جن کا آخری جملہ یہ ہے: ''۔۔۔شعر و ادب پر ان (غالب) کے احسانات دو چار نہیں بے شمار ہیں۔''

ڈاکٹر معین الرحمٰن غالب کے بارے میں اس کوٹیشن کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری پر منطبق کرتے ہوئے اپنا مضمون ختم کر دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں یہی بات خود فرمان فتح پوری صاحب کے بارے میں کہتا ہوں، محض کہتا ہی نہیں اس پر ایمان بھی رکھتا ہوں۔''

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا یہ ایک فلاپ مضمون ہے۔

اس مضمون کے عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ ایک معمولی اور عام نوعیت کا موضوع ہے۔ اس قسم کے عنوانات پر طالب علموں کو اسائنمنٹ کر کے لانے کو کہا جاتا ہے۔ گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ متذکرہ عنوان پر مکرر شائع ہونے والے اس مضمون کے مصنف و مؤلف بقول جمیل الدین عالی:

''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ملک کے پہلے ریسرچ اسکالر ہیں جنھوں نے غالب پر ڈاکٹریٹ کا اعزاز اور امتیاز حاصل کیا۔ غالب کے ایک سو پچھترویں جشن ولادت (1972ء) پر سندھ یونیورسٹی نے سید معین الرحمٰن صاحب کو اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی سند فضیلت عطا کی تھی۔'' (''غالب کا علمی سرمایہ'' صفحہ 19) ان کے دوسرے تدریسی اور علمی امتیازات کا ذکر ہی کیا۔ ایسے بلند پایہ سکالر اور اعلیٰ مناصب پر فائز استاد کے ایک پیش پا افتادہ عنوان پر لکھے گئے مضمون کو فلاپ قرار دینا جرأت رندانہ کی دلیل ہے یا کم علمی اور بے بضاعتی کا ثبوت ہے یا اس کی درست قدر و قیمت کا تعین ہے۔ قارئین کرام مندرجہ ذیل معروضات مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ کر سکتے ہیں۔

1۔ مضمون/مقالہ نگاری کے فن کے مطابق کسی مضمون کے عنوان یعنی موضوع اور اس پر اظہار خیال یا نفس

مضمون میں لازماً مکمل مطابقت، ہم آہنگی، معنوی اور لفظی و منطقی ربط ہونا چاہیے مگر زیر بحث پورے مضمون میں موضوع پر ضمناً بھی بحث کو نہیں چھیڑا گیا۔ نفس مضمون سے عنوان کا تعلق کیوں کر استوار ہوتا؟

2۔ زیر بحث مضمون کا آغاز ہی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے غالب پر مجموعہ مقالات ''غالب: شاعر امروز و فردا'' کے ذکر سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں مضمون میں کتاب ''غالب: شاعر امروز و فردا'' کا چھ بار نام دہرایا گیا ہے۔ اس سے گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ مضمون مذکورہ کتاب کا تعارف یا تبصرہ ہے مگر اس مجموعے کے پندرہ مقالات میں سے تیرہ مقالات کا نام تک نہیں لیا گیا۔ حتیٰ کہ جس مضمون کے عنوان پر مجموعہ کا نام رکھا گیا ہے اُس پر بھی کوئی بحث نہیں ہے۔ مضمون ''کلام غالب میں استفہام'' کا ذکر تو دو صفحوں میں ہے مگر اس کا کوئی تجزیہ و تحلیل، توجیح، توضیح یا تاویل کرتے ہوئے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر روایتی انداز ہی میں زیر نظر کتاب کے پندرہ مقالات کا آٹھ آٹھ دس دس فقروں میں ''توضیحی مطالعہ'' کر لیا جاتا تو کسی حد تک بات بن جاتی اور مضمون نگار کا بھرم رہ جاتا۔

3۔ پانچ صفحوں پر مشتمل اس مضمون میں چار کوٹیشنز اور تیرہ مضامین مع حوالہ جات کی فہرست نے تقریباً اڑھائی صفحے گھیر رکھے ہیں۔

4۔ لطف یہ ہے کہ سارے مضمون میں ایک بار بھی غالب شناسی کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی۔ البتہ دو مقامات پر ''نامور غالب شناسوں'' اور ''ممتاز غالب شناسوں'' کے الفاظ دیکھنے کو ضرور ملتے ہیں۔

مضمون نگار ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے مضمون کا عنوان ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی'' قرار دینے کے بعد اپنا مقصد اور مدعا یکسر فراموش کر دیا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں غالب شناسی کی روایت کے حوالے سے ایک لفظ تک نہیں لکھا، لہٰذا وہ غالب شناسی میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مقام و مرتبہ کا تعین کیسے کر سکتے تھے؟

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مضمون کی ناکامی اور نا تمامی کا انہیں احساس اور شعور بھی نہیں معلوم ہوتا۔ وہ ایک احساس تفاخر کے ساتھ اس مضمون کی مکرر اشاعت کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے اس مضمون کی پانچ معلوم اشاعتیں ذیل میں ایک بار پھر درج کی جا رہی ہیں:

1۔ مجلہ تحقیق نامہ 3-4 شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور (95-1994ء)

2۔ مجلہ تحقیق نامہ 6-7 (98-1997ء)

3۔ کتاب ''نقوش غالب'' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، الوقار 1995ء

4۔ کتاب ''تحقیق نامہ غالب'' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 1998ء

5۔ سیدہ افصح وحید، ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس، لاہور، ابلاغ پبلشرز، اردو بازار، 2002ء، صفحہ 202

ماہنامہ
الحمراء
لاہور
نومبر
چیف ایڈیٹر
شاہد علی خاں
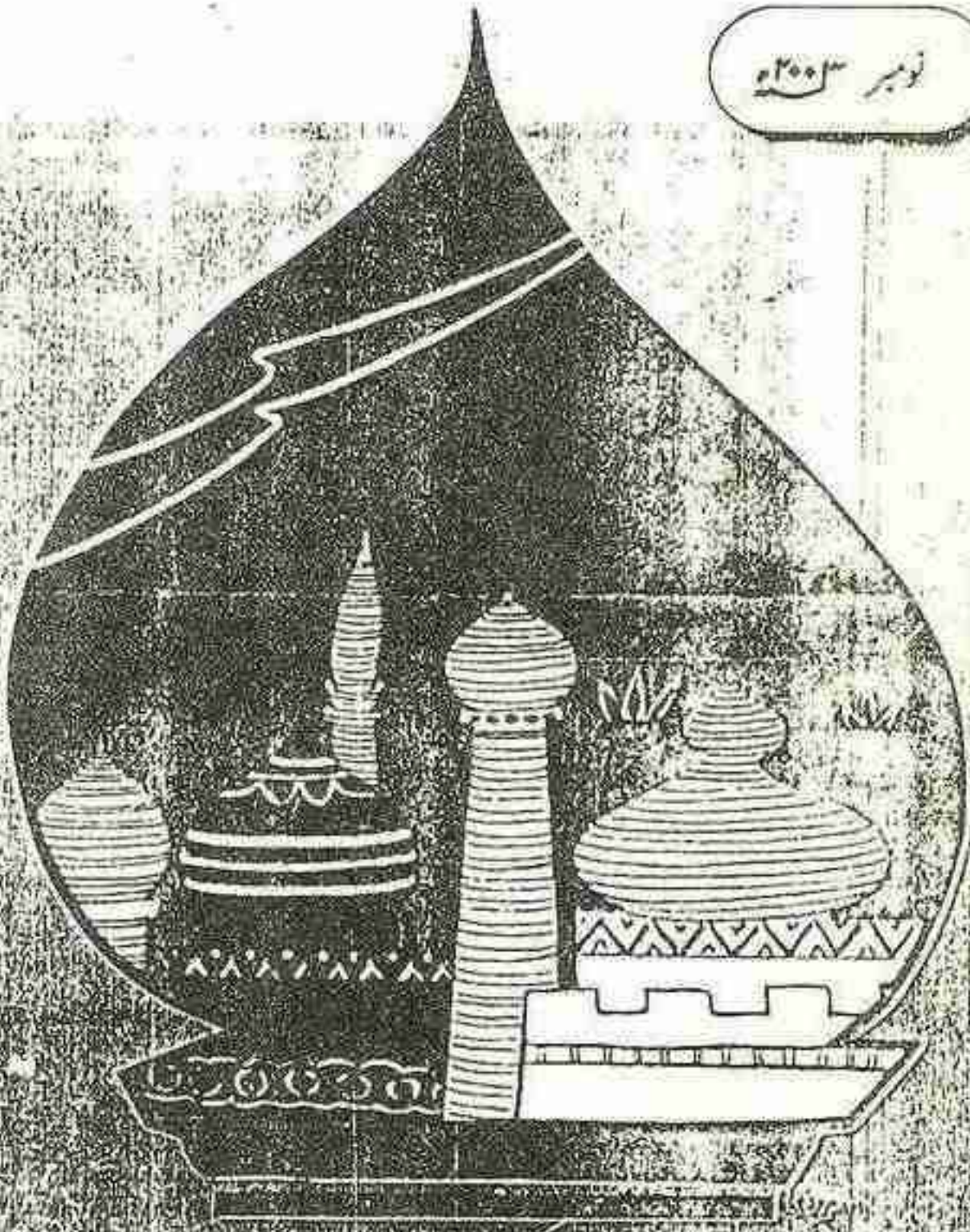
"الحمراء" نومبر ۲۰۰۰ء

مولانا حامد علی خاں کے چند خط

(اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک نایاب تحریر)

ترتیب اور تعارف

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

اکتوبر کا مہینہ شدت سے مولانا حامد علی خاں کی یاد دلاتا ہے۔ ۵ اکتوبر 1995ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا..... مولانا مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میں نے اپنے نام ان کے خطوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے۔ (اس مجموعے میں مولانا کے چند ایسے خطوط بھی آ گئے ہیں جو میرے نام نہیں)۔ یہ مجموعہ ابھی اشاعت کی منزل سے نہیں گزرا۔ وہ بہت خوش رقم تھے۔ کسی لمبی چوڑی تمہید کے بغیر یہاں "الحمراء" کے قارئین کے لیے مولانا حامد علی خاں کے پانچ خطوں کے عکس[1] پیش خدمت ہیں۔

پہلے دو خط خواجہ منظور حسین اور آخری تین خط راقم الحروف (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) کے نام ہیں۔ آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک نادر و نایاب تحریر محفوظ کی جا رہی ہے جو مولانا حامد علی خاں کے والد گرامی مولوی سراج الدین احمد کی ایک قدیم تالیف[1] کے بارے میں ہے۔ مولانا آزاد کی یہ تحریر کوئی ایک سو برس پہلے کی ہے۔

(۱)

۲۳ بے ماڈل ٹاؤن لاہور

۳/ اکتوبر ۱۹۸۳ء

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مخدومی و محترمی جناب خواجہ صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آج تین بجے کے قریب جب میں "جنگ" پر دوبارہ نظر ڈال رہا تھا تو ساتویں صفحے پر ایک خفی سا عنوان "انتقال" نظر پڑا۔ اس کے نیچے آپ کی بیگم صاحبہ محترمہ کی رحلت کی خبر درج تھی جسے پڑھ کر بہت رنج و افسوس ہوا۔

جوں جوں انسان کی عمر گزرتی جاتی ہے، تعلقاتِ دنیوی خود بخود کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے اگرچہ رفیق زندگی کی جدائی ہر عمر میں دردناک ہوتی ہے مگر شاید بڑی عمر میں آدمی اور بھی زیادہ تنہائی کا کرب محسوس کرتا ہے۔ دنیا نوجوانوں کی ہے اور وہ عموماً بڑوں اور بزرگوں سے الگ تھلگ ہی رہنا چاہتے ہیں۔ دعا ہے کہ آپ یہ صدمہ انتہائی صبر و استقامت سے برداشت کر سکیں اور خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

ہمارے بہت سے رفقائے زندگی یوں بھی ہمیں چھوڑ کر چل دیے ہیں۔ ان میں ایک میاں بشیر احمد بھی تھے جو آپ کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ میاں محمد شریف مرحوم بھی میرے بڑے مہربان تھے۔

[1] وقت کی کمی کے باعث مولانا کے خطوط کا عکس اس بار شائع نہ کیا جا سکا جو آئندہ کسی اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔ (مدیر)

''الحمراء'' نومبر ۲۰۰۳ء

خواجہ شاہد حسین صاحب اگر لندن سے تشریف لائے ہوں تو انہیں بھی یہ خط دکھایئے۔ ان کو اپنی شفیق والدہ ماجدہ کی رحلت کی خبر شاید ناگہانی طور پر دیارِ غیر میں ملی ہو۔ عزیزوں سے دور اکیلے آدمی کے لیے اس قسم کا دکھ اور بھی زیادہ کربناک ہو جاتا ہے۔

اسی سال شاید جنوری میں ''دیوانِ غالب'' کی اشاعت کے سلسلے میں ان سے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ پھر شاید کسی وجہ سے وہ بات رہ گئی۔ ان کی ملاقات کی خوشگوار یاد میں اب رنج و ملال بھی شامل ہوگیا ہے۔ خدا آپ سب کا حافظ و ناصر ہو۔

(حامد علی خاں)

(۲)

۲۳ بے ماڈل ٹاؤن لاہور

۲ نومبر ۱۹۸۳ء

مخدومی و محترمی ...... السلام علیکم پرسوں آپ کی کتاب اور کل آپ کا گرامی نامہ ملا۔ میں نے سب سے پہلے آپ کا افسانہ ''آپا'' پڑھا ہے۔ ترجمے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا، ایک عام بات ہے۔ میری رائے میں تو وہ ترجمہ ہی نہیں، جو ترجمہ معلوم ہوا مگر اس فن کے ماہرین ہمارے ہاں دو چار سے زیادہ نہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ کالج میں طلبہ کو ترجمہ کرنے کی مشق بھی کرایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ یہ آپ کا خاص فن ہے۔ سلیس زبان، چھوٹے چھوٹے فقرے، حیرت انگیز قدرتِ زبان کے شاہد ہیں۔ آپ نے شاید کلفتا اسے بچوں کی کتاب قرار دیا ہے۔ بڑے تو شاید اس سے زیادہ مستفید ہوسکتے ہیں۔ ترکیف کا میں پرانا مداح ہوں۔ اس کے فن کی کیا داد دوں مگر آپ کے حسنِ انتخاب کی داد ضرور دیتا ہوں۔ از اول تا آخر یہ افسانہ دلکش سے دلکش تر ہوا جاتا ہے اور انجام بھی ایسا ہے۔ جسے شیشے کے الفاظ میں پوری طرح استعارۃً کہا جاسکتا ہے۔ میں آپ کا دل سے شکرگزار ہوں کہ آپ نے یہ گراں پایہ کتاب پڑھنے کے لیے مجھے عنایت فرمائی۔

پارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

اس کو پڑھ کر اپنا ایک پرانا شعر یاد آگیا۔ یہ مخمل کے سامنے ٹاٹ پیش کرنے کے برابر ہے مگر شاید اس سے تسلی کا کوئی پہلو نکل سکے ؎

تیرا وجود رونقِ کاشانہ تھا کبھی اب تیری یاد شمعِ سیہ خانہ ہوگئی

(حامد علی خاں)

(۳)

۲۳ بے ماڈل ٹاؤن لاہور

مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۷۵ء (وقت شام)

جناب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب
وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج، لائل پور

مخدومی و محترمی جناب ڈاکٹر صاحب السلام علیکم آپ کا خط مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۷۵ء مل کر موجبِ مسرت ہوا۔ ''لسان الصدق'' کے کچھ پرچے میں نے دس بارہ سال کی عمر میں دیکھے تھے مگر پھر کچھ معلوم نہیں ان کا کیا حشر ہوا۔ کیا کہیں لسان الصدق کا پورا فائل محفوظ ہے؟ بہرحال آپ کی تلاش کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ ایسے کام آپ ہی کرسکتے ہیں۔ آج اگر سید احمد خاں موجود ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔ کاش آپ کا یہ خط دو سال پہلے آیا ہوتا۔

آپ نے اپنے نفیس اور خوبصورت خط میں جس محنت سے ارکان الاسلام پر آزاد صاحب کا یہ تبصرہ نقل کرکے مجھے بھیجا ہے اور جو تکلیف اٹھائی ہے، اس کا شکریہ کما حقہٗ میں ادا نہیں کرسکتا۔ خدا آپ کے شوقِ علم اور ذوقِ تحقیق میں اضافہ کرے۔ میں نے یہ تبصرہ محفوظ کرلیا ہے۔ ارکان الاسلام کے شاید چار پانچ ایڈیشن چھپے تھے۔ اب مدت سے نہیں چھپی۔ (حامد علی خاں)

''الحمرا'' نومبر ۲۰۰۷ء

(۴)

۲۳ بے ماڈل ٹاؤن لاہور
مورخہ ۸/ اکتوبر ۱۹۷۵ء

عید مبارک

محبی و محترمی السلام علیکم آپ کا ایک گرامی نامہ جس میں آپ نے کتاب خانہ ''اصلاح الاحوال'' دلبیہ کے بارے میں اطلاع دی تھی کہ وہاں ''لسان الصدق'' کا ایک ناقص فائل موجود ہے، مل کر باعث تشکر ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ میں ۱۹ اگست کو نیشنل سنٹر کے جلسے میں نہ آسکا۔ اس سے پہلے دو دن متواتر مجھے سخت گرمی میں کار پر طویل سفر کرنا پڑا۔ گرمی نے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ میں نے کشور ناہید صاحبہ کو لکھ دیا تھا اور خیال تھا کہ انہوں نے میری معذرت پیش خدمت کر دی ہوگی، اس لیے آپ کو بڑی تاخیر سے یہ اطلاع دے رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے اور اپنے محققانہ مشاغل میں مصروف۔

(حامد علی خاں)

(۵)

۲۳ بے ماڈل ٹاؤن لاہور
۱۶/ نومبر ۱۹۷۵ء

محبی و محترمی السلام علیکم۔ اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر بہت مسرت ہوئی کہ گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے۔ اردو کی جماعتیں شروع ہو رہی ہیں اور آپ اس شعبے کے سربراہ مقرر ہوئے ہیں۔ یہ تو خیر ایک حقیقت متوقع ہی تھی، مگر ہماری حکومتیں قومی زبان کو انگریزی کے مقابلے میں بہرحال پس پشت ڈالنے اور ڈالے رکھنے کا مستحکم ارادہ رکھتی ہیں۔ اس لیے یہ کام ہمیں خود انجام دینے کے لیے کوئی حیلہ کرنا چاہیے۔ ہمیں ہر سال طلبہ کی ایک ایسی کھیپ تیار کرنی چاہیے جنہیں اردو زبان و ادب سے کماحقہٗ دلچسپی ہو اور وہ اس کی عظمت سے بھی بے خبر نہ رہیں۔ ایسے ہی لوگ آئندہ چل کر مختلف مراحل میں قومی زبان کے سپاہی ثابت ہوں گے۔ زبان پر کیا لکھوں آپ خود مجھ سے بڑھ کر ان طریقوں سے واقف ہیں جو اس سلسلے میں اختیار کرنے چاہئیں۔ گرمی کی شدت اور ''لوڈشیڈنگ'' کے ظلم و ستم نے مجھ ''آرام طلب'' کو کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ یہی کہہ سکتا ہوں

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تو جو اور وسیلہ کی ''لوڈشیڈنگ'' نے (جو سیاسی ضرورت بھی تھی) کبھی اندھیرے کی وجہ سے اور کبھی گرمی اور پسینے کی وجہ سے کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ بے شمار خط جواب طلب پڑے ہیں۔ آپ کے نام میرے اور میرے نام آپ کے ایک دو خط باہم دگر نہیں پہنچے۔ ادھر میں آپ کے پوسٹ بکس کا نمبر بھی گم کر بیٹھا تھا۔ یہ خط بھی کالج کے پتے سے بہ مجبوری لکھ رہا ہوں۔ دعا ہے کہ آپ کے ہاتھ آجائے پوسٹ بکس اگر جاری ہے تو اس کا نمبر ضرور لکھیے تاکہ میں محفوظ کرلوں۔ جس ناشر نے آپ کے حکم کی پروا نہیں کی، میں اس سے آپ کی کتاب بحق حق سے مانگ سکتا تھا، چنانچہ میں اب تک اس سے محروم ہوں۔

آپ کی ایک اور کتاب کا ذکر اخبار میں پڑھا تھا۔ چونکہ میں اس کے موضوع سے خود پوری طرح واقف نہیں، میری خواہش تھی کہ وہ کسی طرح مجھے ملے مگر پہلی کتاب کے حشر اور گرمی کی شدت کے باعث کچھ نہ لکھ سکا۔

''لوڈشیڈنگ'' ''ضرورت'' کے موقع پر سردیوں میں بھی شروع ہونے کی نوید مل چکی ہے۔ الحمدللہ بدخطی اور جلد بازی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

(حامد علی خاں)

خواجہ منظور حسین (وفات لاہور ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء) کے نام، مولانا حامد علی خاں کی پہلی تحریر (مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء)، خواجہ صاحب کی اہلیہ گلشن منظور کے انتقال پر ایک مختصر اور موثر تعزیت نامہ حزن کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا کا دوسرا گرامی نامہ خواجہ منظور حسین کی کتاب: ''آسیا اور دوسری کہانیاں'' (مطبوعہ لاہور ۱۹۸۳ء) کی رسید اور تحسین میں ہے۔

"الحمراء" نومبر سن ۲۰۰۰ء

میرے نام مولانا حامد علی خاں کے پہلے دو خط زیادہ تر "لسان الصدق" (کلکتہ) کے ذکر پر مبنی ہیں۔ اس رسالے کے مدیر مولانا ابوالکلام آزاد (وفات، نئی دہلی ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) نے رسالے کی ایک قدیم اشاعت میں، مولانا حامد علی خاں کے والد گرامی مولانا سراج الدین احمد (وفات کرم آباد ۶ دسمبر ۱۹۰۹ء) کی ایک کتاب "ارکان الاسلام" (۱۹۰۳ء) پر تبصرہ کیا تھا۔ اس فراموش شدہ تبصرے کی نقل کی فراہمی، مولانا حامد علی خاں کی خوشی کا باعث ہوئی۔ یہ تبصرہ، افادۂ عام کے لیے، زیر نظر توضیحات کے آخر میں محفوظ کیا جا رہا ہے۔

میرے نام مولانا حامد علی خاں کے تیسرے خط (مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۸۵ء) کا پس منظر یہ ہے کہ اخبارات سے یہ اطلاع پا کر کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے (اردو) کی جماعتیں شروع ہو رہی ہیں، انہوں نے ازرہِ شفقت عنایت، اور ان کلاسز سے میری وابستگی پر مسرت کا اظہار فرمایا ہے۔

میں ۱۹۸۱ء کے اوائل میں، گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے جہاں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز تھیں، سات آٹھ برس کا تعلق منقطع کر کے، اس یقین وہاں پر لاہور آیا تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز کا آغاز کیا جائے گا۔ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب سے ہمیں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء کی فوری اجازت مل گئی لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کی درپردہ اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی علی الاعلان مخالفت اور ان کے لایعنی حیلوں بہانوں کے باعث پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز کے الحاق کے معاملات روبہ راہ لانے میں ہمارے چار برس برباد ہوئے اور بالآخر الحاق کی منظوری کہیں ۱۹۸۵ء میں جا کر میسر آ سکی!

محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب کی اشیرباد کے باوجود گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء کی تحریک کو یونیورسٹی اورینٹل کالج کے "بزرگوں" کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر وحید قریشی مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ میں 'جی سی' کی جانب سے اورینٹل کالج میں ایم۔ اے (اردو) کی تدریس میں شریک ہو جاؤں اور بجائے خود 'جی سی' میں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز شروع کرنے پر اصرار نہ کروں۔ میں ان سے متفق نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے جب تک وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں شعبۂ اردو کے سربراہ رہے، 'جی سی' کی درخواست اور کوشش کو لیت و لعل اور حیلوں بہانوں سے ٹالے رکھا۔ سال ۶۶-۱۹۶۵ء کے سیشن میں بھی گورنمنٹ کالج لاہور کی اسی نوعیت کی ایک تجویز اور تحریک کو وہ حتمی طور پر رد کر چکے تھے۔[1]

ڈاکٹر وحید قریشی کے بعد ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، شعبۂ اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے صدر ہوئے ــــ انہوں نے کہ یکسر بے لچک آدمی ہیں، کسی لگی لپٹی کے بغیر مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپ کی درخواست کے قطعاً حق میں نہیں ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا کہ 'جی سی' میں اورینٹل کالج کے برابر، ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کے دور صدارت میں ممکن ہے یہ نہ ہو، یا ہو بھی جائے، لیکن بالآخر تو اسے ہو کر رہنا ہے! خدا آپ کو زندگی دے کہ آپ 'جی سی' میں ایم۔ اے (اردو) کے اجراء اور ان کلاسز کے پھلنے پھولنے کی "خوشی" دیکھیں۔

---

[1] اس ضمن میں دیکھیے مراسلہ رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی لاہور نمبر ۲۳۳۶۔ پی، مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۶۵ء بنام پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور، جس میں کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر وحید قریشی کو انسپکشن پر مامور کیا تھا۔ انہوں نے اس بارے میں جو تحریری رپورٹ پیش کی ہے، اس کی روشنی میں گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء / الحاق کی اجازت / سفارش نہیں کی جا سکتی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ تحریری رپورٹ عجیب شے ہے اور 'جی سی'، شعبہ اردو کی تاریخ کا حصہ ہے۔ دیکھیے: "گورنمنٹ کالج لاہور، شعبہ اردو کوائف اور کارکردگی" مطبوعہ یونیورسل بکس لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۲۷-۳۱

"المراۃ" نومبر سن ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے بعد،
۸۶-۱۹۸۵ء کے سیشن میں پہلی بار ہم حکمہ تعلیم حکومت پنجاب کی اجازت اور پنجاب یونیورسٹی سے باقاعدہ الحاق کے بعد ایم۔ اے (اردو) کی سطح پر تدریس کا آغاز کر سکے۔

اب، اس تو ے اور تصویر کا دوسرا رخ: شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز شروع ہونے پر ڈاکٹر وحید قریشی نے پہلی فرصت میں مجھے "اعتماد اور راز" میں لے کر اپنی مجبوری اور معذوری یا کمزوری کا پس پردہ قصہ سنا کر اعتراف کیا کہ یہ "دراصل" خواجہ زکریا تھے جو کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ 'جی سی' میں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز ہوں۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے کہنے پر اور پھر مابعد اپنے زمانہ صدارت اور اختیار میں، میں خواجہ زکریا کے دباؤ کے تحت 'جی سی' میں ایم۔ اے (اردو) کی کلاسز کے اجراء کی درخواست سے اتفاق نہیں کر سکا میں لاہور میں رہتے ہوئے خواجہ زکریا کی مخالفت کو Afford نہیں کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی اس "دور فکنی" کو میں نے، ان کے خیال خاطر سے "مان لیا"...... وہ مجھے اپنے تئیں، یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ خواجہ محمد زکریا، مجھ سے شدید معاصرانہ اور معاندانہ چشمک رکھتے ہیں اور مجھے اپنا واحد شریک اور حریف سمجھتے ہیں!

میرے اور برادرم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے مابین (۱۹۶۵ء تا حال) کیا رشتہ رہا، یہ ایک الگ اور مختلف (بعض دوستوں کے نزدیک ایک مستقل موضوع) ہے۔ لیکن خود ڈاکٹر وحید قریشی کے طرز عمل اور روش حیات کو ان کے مضمون "خوف زدہ غالب اور عصری صورت حال" کی روشنی میں دیکھنا اور جانچنا بہت پرلطف، بامعنی اور سبق آموز ہوگا۔ یہ مطالعہ غالب سے شاید زیادہ خود مقالہ نگار کی صورت حال کا عکاس ہے!

یہ کس درجہ "حیرت افزا" منظر نامہ، اور میسر وسائل کا منصفانہ مصرف ہے کہ آج جب ڈاکٹر وحید قریشی بستر علالت پر تنہائی کا مستقل شکار ہیں، گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو سے وحید قریشی کی غیر منقطع اور طویل دورانیے پر پھیلی ہوئی "مہربانیوں" کے "اعتراف" میں جی سی یونیورسٹی کی "کمپی ٹینٹ" اتھارٹی کی خوش بخشی سے، وہ شعبہ اردو میں، تاحیات "ڈش ٹنگویشٹ پروفیسر" کے منصب جلیلہ پر فائز کیے گئے ہیں۔ 'جی سی' میں کسی ایک دن کے لیے بھی ان کا شعبے یا فیکلٹی میں آنا تو دور کی بات ہے، وہ گھر میں اپنی شدید علالت کے باعث کسی بیرونی مدد/ ایکسٹرنل ایڈ کے بغیر اپنے کمرے تک سے باہر نکلنے کے قابل نہیں۔ ماہ بماہ اعزازیہ گھر پہنچتا رہے گا۔ خدا انہیں جلد تر صحت یاب فرمائے اور وہ شعبے میں آ سکیں یا لائے جا سکیں اور فیکلٹی ان کے وجود مسعود سے فیضیاب ہو۔

میں نے جی سی یونیورسٹی کی انتظامیہ کے ایک اہم کل پرزے سے، خود ان کے رابطہ کرنے پر، عرض کیا تھا کہ ڈاکٹر وحید قریشی 'جی سی' کے شعبہ اردو سے جو کچھ کرتے رہے، وہ ڈھکا چھپا نہیں، ریکارڈ پر ہے۔ وہ کبھی شریک سفر ہوتا تو کیا معنی، سفر کھوٹا کرنے کا سبب اور باعث رہے ہیں۔ جواباً اس "اعزاز اور مالی مفاد" کا جواز مجھے یہ بتایا گیا کہ انہوں نے اپنا کتب خانہ 'جی سی' یونیورسٹی میں محفوظ کرا دیا ہے۔

مجھ سمیت یہ بات بہتوں کے علم میں ہے کہ وہ برسوں، اپنے کتب خانے کو فروخت کر دینے کی فکر اور کوشش میں لگے رہے۔ لیکن وہ وفاقی اور جامعاتی سطح پر ان کی کوئی کوشش، ان کے حسب خواہ، سرے نہ چڑھی۔ اسے چھوڑیے! ایک دوسرے زاویے سے دیکھیے۔ وہ نہ پہلے شخص ہیں، نہ وہی ایک ایسے منفرد شخص ہیں جنہوں نے 'جی سی' کو اپنے شخصی ذخیرۂ کتب کا عطیہ دیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر محمد صادق اور کئی دوسرے ذی حیات اکابر کے قیمتی عطیات 'جی سی' لائبریری کے منور گوشے ہیں۔ "پروفیسر شپ" کے تاج کا وحید قریشی ہی کے سر پر رکھنے میں مخفی حکمت ہے

کیا؟ عقل اسے سمجھنے سے عاجز ہے۔

اگر میانوالی کالا باغ کے علاقے کے معروف ڈاکٹر محمد خان، اپنی زندگی میں ایک معقول رقم، 'جی سی' کو عطا کر دیتے تو کیا ان کے نام نامی کو 'جی سی' سے وابستہ کر لینا اعزاز کا باعث ہوتا! یا کوئی اس کا جواز بنتا!؟ 'حمیت' بھی کوئی چیز ہے یا اسے بڑے بڑے سورما ''راوینز'' گھول کر پی گئے ہیں!!

'جی سی' یونیورسٹی کے منتظمہ کے جس مہربان سے میری یہ گفتگو ہوئی، اپنے آپ پر ان کے پیہم لطف و کرم کا معترف ہوں۔ اسی شہ پر میں یہ سب کچھ ان سے کہہ گزرا۔ ان کے پاس جواب صرف یہ تھا کہ ''فیصلے اوپر جہاں ہوتے ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، میں تو فیصلوں پر عملدرآمد کرانے کا ذمہ دار اور پابند، ایک ادنیٰ خادم ہوں!''۔ میں اس پر صرف ''سبحان اللہ'' کہہ سکا، حالانکہ محل کیا ''انا للہ'' کا نہیں تھا؟

میرے نام مولانا حامد علی خاں کے مکاتیب (جولائی اکتوبر ۱۹۷۵ء) میں رسالہ ''لسان الصدق'' کا تذکرہ آیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ماہنامے ''لسان الصدق'' (کلکتہ، شمارہ جون جولائی ۱۹۰۳ء) میں مولوی سراج الدین احمد کی نایاب تالیف ''ارکان الاسلام'' پر جو تعارفی تبصرہ تحریر فرمایا تھا، اسے افادۂ عام کے لیے ذیل میں درج/محفوظ کیا جاتا ہے:

''ارکان الاسلام''

''اردو زبان میں ایک ایسی مذہبی تصنیف کی تحت ضرورت تھی جو بچوں کی تعلیم کے لیے موجودہ زمانے کی ضرورتوں کے مطابق لکھی جائے۔ اس اشد ضرورت کو ہمارے کرم دوست منشی سراج الدین احمد خاں صاحب ایڈیٹر اخبار ''زمیندار'' لاہور، نے ''ارکان الاسلام'' لکھ کر پورا کیا۔ اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اسلام کے ضروری ارکان اور اسلام کے اہم معتقدات کو صاف اور سلیس اردو زبان میں بیان کر کے، ان کو چھوٹے چھوٹے سبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

نقلی احکام کا، عقلی دلائل کے ساتھ، ابتدائی کورس کے لیے لکھنا، کچھ آسان نہیں ہے مگر ہم نہایت مسرت سے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ منشی صاحب کو اس طرز میں عمدہ کامیابی ہوئی ہے۔

ارکان اسلامی کے بیان میں بعض ضروری مسائل فروعات بھی درج کر دیے ہیں جو مسلمان بچوں کی معلومات کے لیے ازحد مفید ہیں۔ قرآن مجید اور داعی اسلام کے متعلق یورپین مصنفین کے اقوال اور صحابہ کرام کے اخلاق و اوصاف لکھ کر کتاب کو ابتدائی مذہبی تعلیم کا ایک مکمل کورس بنا دیا ہے جس کے پڑھنے سے مسلمان بچوں کو اپنے مذہب کی خوبیاں اور مخالفین کا اعتراف محاسن، اپنے بزرگ اسلاف کی عظمت کا پختہ خیال پیدا ہو جائے۔

لکھائی اور چھپائی کے لحاظ سے بھی کتاب قابل تعریف ہے اور آٹھ آنے قیمت پر مصنف ممدوح سے مل سکتی ہے۔'' (تحریر: مولانا ابوالکلام آزاد، مدیر ماہنامہ ''لسان الصدق'' کلکتہ، شمارہ جون جولائی ۱۹۰۳ء) (بحوالہ: مضامین لسان الصدق، مرتبہ عبدالقوی دسنوی لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۷ء ص ۸۵-۸۶)

یہ نادر پارہ تحریر ''آثار الصنادید'' اور ''تبرک'' کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی کوئی ایک سو برس پہلے کی نگارش ہے۔ جو ''الحمراء'' کے صفحات پر حیات نو پا رہی ہے۔ (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن لاہور، ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

۞.........۞.........۞

''اکسار، ے ریا اور غیبت کے دربار لگانا، خوف زدہ اور تنگ احباب کا ہمیشہ سے پسندیدہ شیوہ رہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن اب اس درد انگیزی پر اہل مجلس خوش نہیں ہوتے، خاموش رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی خوش آئند ہے۔ ایک حدیث ہے ''بدبخت ہے وہ شخص جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس کی عزت کریں۔'' خدا ہر نیک آدمی کو اس طرح کی ''عزت'' سے دور اور محفوظ رکھے۔ یہ حدیث مبارک بعضوں کے لیے آئینہ ہے، اور سبق تو یہ سب کے لیے ہے۔'' (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

"الحمراء" دسمبر ۲۰۰۳ء

مکرمی۔۔۔ بھائی اشفاق نقوی کی سرگزشت نے دلچسپی پیدا کی ہوئی ہے۔ پرچے کا انتظار رہتا ہے شاید دوسروں کی تحریریں بھی منیر ہوتی ہیں۔ قاضی پیروز بخت کی بالاقساط تحریر بھی فکر افروز ہے۔ آہستہ آہستہ معتبر لکھنے والوں کی کہکشاں پھیلتی جا رہی ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے چھوٹے صاحبزادے کاکل سے کمیشن لے کر آئے اور ان کی پہلی پوسٹنگ کشمیر کی ۱۵ ہزار فٹ کی بلندی پر جنگ بندی لائن کی ایک فوجی پوسٹ پر ہوئی کل ان کو عیدکارڈ لکھنے بیٹھ۔ بے ساختہ کچھ مصرعے ہوتے گئے۔ (مرتضیٰ برلاس)

مکرمی۔۔۔ الحمراء شمارہ نومبر ۲۰۰۳ء کی بروقت دستیابی پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ میرا خیال تھا کہ سب سے پہلے میں گلہ کروں گا کہ آپ نے میرے افسانے "گھر کا کھانا" کو کوئی گوشہ کیوں عنایت نہیں فرمایا مگر جب میں نے گراں قدر تحریروں کی کہکشاں کو صفحۂ قرطاس پر بکھرتے ہوئے دیکھا تو احساس ہوا کہ میرے افسانے کو ملتوی کرنا ہی احسن تھا۔ یہ بات خاص طور پر ان نایاب خطوط اور دیگر تحریروں کے حوالے سے ہے جو لاتعداد نکتہ ہائے فکر و نظر کی وضاحت پیش کرتی ہیں۔ سب سے پہلے پیروز بخت قاضی صاحب کے مقالے تصوف، اسلام اور عہد حاضر کی تیسری قسط جو ایک نادر تحریر ہے۔ قاضی صاحب ماشاء اللہ تصوف کی تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھنے کے علاوہ بصیرت کی گہرائی۔ تصوف، عشق، فنا اور جنوں کی نازک پرتوں کو علیحدہ علیحدہ دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت کے حامل دکھائی دیتے ہیں اور بڑی خوبصورتی سے وہ اس مشکل موضوع پر اظہار خیال فرما رہے ہیں۔

مجھے اعزاز احمد آذر کی نظم نے بھی بہت متاثر کیا۔ نہ صرف اس سے پاکستان اور علامہ اقبال سے ان کا روحانی تعلق منکشف کرتی ہے بلکہ جس تخلیقی وصف کے ساتھ انہوں نے موجودہ عصری تناظر میں ان گنت موضوعات پر فکر اقبال کے حوالے سے بہت سے ڈرامائی کرداروں اور تمثیلات پر کیمرہ فوکس (Focus) کیا ہے۔ ان کی تکنیک اور دردمندی کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

جناب سید معین الرحمن صاحب نے مولانا حامد علی خاں کے جو خطوط ہم تک پہنچائے ہیں وہ ہمیں اپنی ان بزرگ ہستیوں کی طرزِ فکر کا ادراک بخشتے ہیں جو ماضی میں معاشرے کی تعمیر نو میں کلیدی حیثیت کے حامل رہے ہیں۔

ڈاکٹر کمال امروہوی صاحب کی نظم 'اکیسویں صدی کا آخری نوحہ' بہت دلکش اور درد آمیز ہے۔

جانے کس دشمن دانش نے تراشا ہے اصول گردشِ دہر سے آفاق بدل جاتے ہیں

بے حد خوبصورت لہجہ، عمیق نظر اور طنز کے نشتروں سے گھائل نظم۔ سبحان اللہ۔

۱۴ اگست کے حوالے سے بعنوان بشارت، امجد اسلام امجد صاحب نے تحریر کیا ہے وہ واقعتاً بڑی مہارت سے موضوع کی روح کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہے۔ نہ صرف یہ عہد حاضر میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ کو بھرپور انداز میں بے نقاب کرتا ہے بلکہ ایک صحیح سوچ کے حامل فرد کے سامنے اور اس کے ذہن کے جانے انجانے گوشوں میں چھپے ہوئے (Conflicts) کو بے نقاب کرتا ہے۔ (نیاز احمد صوفی)

مکرمی۔۔۔ "الحمراء" کا ماہ نومبر کا شمارہ پڑھا۔ اس شمارے سے پہلے تک آپ کا پرچہ غیر جانبدار ادبی پرچہ تھا لیکن موجودہ شمارے میں جس طرح ڈاکٹر معین الرحمن نے آپ کے والد گرامی مولانا حامد علی خاں کے خطوط کی آڑ لے کر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے حوالے سے زہریلے انداز میں لکھا ہے، وہ قارئین کو سوچنے پر مجبور کر دے گا کہ شاید اس معاملے میں آپ بھی ملوث ہیں۔ جبکہ میری ذاتی رائے آپ کے بارے میں یہی ہے کہ آپ گروہ بندیوں اور تعصبات سے

"الحمراء" دسمبر ۲۰۰۰ء

آدمی نہیں۔ براہ کرم اس سلسلے میں وضاحت شمارہ دسمبر میں لازماً کر دیں ورنہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ جائے گا۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب پاکستان کے نمبر ون محقق ہیں ان کے بارے میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کو ایسی سطحی زبان ہرگز زیب نہیں دیتی۔ اگر ڈاکٹر وحید قریشی کا کتب خانہ گورنمنٹ کالج کے اثاثہ جات میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں تو پھر ڈاکٹر معین الرحمٰن از خود اس سے بھی بڑا قدم اٹھا کر دکھائیں اور اپنی ذاتی لائبریری گورنمنٹ کالج کو Donate کر دیں۔ آخر کب تک سانپ بن کر ادبی خزانوں پر بیٹھے رہیں گے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات گرامی اردو ادب میں اتنی متنازعہ نہیں، جتنی خود معین صاحب کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ایمریطس مقرر ہونا وہ دکھ ہے، جس سے جانبر ہونے میں معین صاحب کو ایک عرصہ لگے گا کیونکہ پہلے تو انہوں نے گورنمنٹ کالج میں توسیع حاصل کرنے کی ناکام کوششیں کیں بعد میں پروفیسر ایمریطس کی کرسی کو جھپٹا ڈالنا چاہا اور بالآخر ناکام ہو کر، ٹھنڈے ٹھار ہو کر "بے وقار" پبلیکیشنز کو چلانے پر مجبور پائے گئے۔

ڈاکٹر معین کا مسئلہ جہاں تک میری سمجھ میں آیا ہے یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے خبروں میں In رہنا چاہتے ہیں اور خبروں میں ان رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ویسے بھی معین صاحب جس عمر میں ہیں اس عمر میں انسان صرف مسئلہ ہی کھڑا کر سکتا ہے۔ (عرفان احمد خان، ناول نگار)

امراؤ، دسمبر ۲۰۰۳ء

کچھ وقت ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ

انور سدید

ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی، فکری اور ادبی فتوحات کی فہرست بہت طویل ہے لیکن گذشتہ دنوں انہوں نے ایک ایسا غیر تصنیفی کارنامہ انجام دے ڈالا جس کی نظیر بیسویں صدی میں کم کم ملتی ہے۔ یہ ایثار و قربانی اور علم کے خیر کثیر کی تقسیم کبیر کا کارنامہ ہے اور اجمال اس کا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تمام زندگی کا ذخیرہ شدہ اثاثۂ کتب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کو بلامعاوضہ منتقل کر دیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ میری نیاز مندی اس دور سے شروع ہوئی تھی، جب انہوں نے شبلی نعمانی کے جذباتی زاویوں کا تجزیہ نفسیاتی علوم سے کیا تھا اور ایک حیرت افزا کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' لکھی تھی جس کی صدائے بازگشت بیسویں صدی کے نصف آخر میں سنی جاتی رہی لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ شبلی نعمانی کے انسانی فطری زاویوں کو کم نظر لوگ اس کتاب کے حقائق سے کسی اور رنگ میں دیکھ رہے ہیں تو انہوں نے اس کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ یہ کتاب عرفان احمد نے دوبارہ چھاپ دی ہے تو وہ خوش نہیں ہوئے کہ اب اس کی اشاعت بے محل اور ناواجب تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ لمبے عرصے کے بعد جب ڈاکٹر ابن فرید نے شبلی نعمانی کی زندگی کو جدید نفسیات کی روشنی میں پرکھا تو وہ بھی انہیں نتائج پر پہنچے جن پر ڈاکٹر وحید قریشی چالیس کی دہائی میں پہنچ چکے تھے۔ یہ بات ضمنی سمجھئے۔ اصل میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ مجھے ڈاکٹر وحید قریشی سے قریباً ساٹھ سال سے نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔ لیکن ان سے قربت اس دور میں پیدا ہوئی جب میں ایم اے کرنے کے بعد ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں سرگرداں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مشکل یونیورسٹی ضابطوں کی تکمیل اور تکمیل کرانے کے بعد حل کر دی تو اپنی وسیع لائبریری کے دروازے بھی مجھ پر کھول دیے، جو ہزاروں کتابوں پر مشتمل تھی۔ میں نے ان کے ذاتی کتب خانے سے کم و بیش پانچ سال تک استفادہ کیا اور ابتدائی تین سالوں میں تو ان کا کتب خانہ میں نے سرگودھا منتقل کرلیا تھا۔ مجھے اجازت تھی کہ جو کتاب جتنا عرصہ چاہوں اپنے پاس رکھوں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی ہر کسی کو اس اعتبار سے سرفراز نہیں کرتے تھے۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کتاب مانگنے والے کی طلب صادق ہو اور وہ مستعار کتابوں سے اپنی لائبریری مستقل طور پر سجانے کی بجائے کتاب ان کے کتب خانے میں واپس رکھنے کا فرض بھی ادا کرتا ہو۔ میں ڈاکٹر وحید قریشی کے اس کڑے امتحان پر پورا اترا اور مقالہ مکمل کرکے ان کی سب کتابیں ان کے کتب خانے میں اس جگہ رکھ دیں جہاں سے اٹھائی تھیں۔

''الحمراء'' دسمبر ۲۰۰۳ء

راز کی بات بھی عرض کردوں کہ وحید قریشی کتابیں مستعار دیتے وقت فہرست نہیں بناتے تھے، نہ ان کتابوں کے رسیدی دستخط حاصل کرتے تھے۔ لیکن جب کتابیں واپس کرنے کا دور آیا تو حیرت ہوئی کہ انہوں نے سب مستعار کتابیں، ایک رجسٹر میں درج کر رکھی تھیں اور کتابیں واپس گئیں تو ان کی پوری چیکنگ کی۔ یہ واقعہ ضمنی تھا لیکن اس دوران ان کے سمن آباد والے گھر میں جانے کا اتفاق ہوتا تو میں دیکھتا کہ ان کی لائبریری میں متنوع موضوعات کی کتابوں کا مسلسل ذخیرہ جمع ہو رہا تھا۔ گھر کی دوسری منزل کو انہوں نے کتب خانے کی صورت دے دی تھی جس کی وسعت کتابوں کے ذخیرے کے سامنے محدود ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن کتابوں کی خریداری میں ڈاکٹر صاحب نے کبھی کمی نہ آنے دی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن کسی دوست نے آ کر بتایا کہ لاہور کے آثار قدیمہ پر عبداللہ چغتائی کی ایک کتاب جو ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی تھی اردو بازار کے ایک ناشر نے ان کی وفات کے بعد چھاپ دی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا کہ عبداللہ چغتائی اپنی اس کتاب کی جتنی رائلٹی مانگتے تھے، ناشر اس کا دسواں حصہ بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب اشاعت سے محروم رہ گئی لیکن بددیانت ناشر نے مسودہ اپنے پاس رکھ لیا اور عبداللہ چغتائی سے بھاؤ تاؤ کرتے رہے۔ اسی دوران ان کی وفات ہوگئی اور ناشر نے عبداللہ چغتائی کا کفن میلا ہونے سے پہلے کتاب چھاپ دی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ خبر سنی تو لغوی معنوں میں اردو بازار کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ سخت غصے میں تھے۔ لیکن کتاب جس خوبصورت انداز میں چھاپی گئی تھی، اسے دیکھ کر خوش ہوگئے اور صرف یہ کہا:

''کاش! کتاب عبداللہ چغتائی کی زندگی میں شائع ہو جاتی۔''

انہوں نے نقد قیمت ادا کی اور یہ کتاب اپنے کتب خانے میں سجادی۔ راستے میں کہتے جاتے ''عبداللہ چغتائی آج عقبیٰ میں ضرور خوش ہوں گے کہ ان کا فیض عام وفات کے بعد بھی جاری ہے'' اور ملال کرتے جاتے کہ ''کتابوں کے اس تاجر نے ایک محنت کش محقق کی رائلٹی ادا نہیں کیں اس کا حق مار لیا ہے۔''

میں نے سوال کیا ''لاہور کا کون سا ناشر مصنف کو دیانتداری سے رائلٹی ادا کرتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال کا جواب نہ دیا۔ صرف ایک لمبی آہ کھینچ کر افسردہ ہوگئے۔ اگر ان کا جواب نفی میں ہوتا تو میں انہیں مقبول اکادمی اور عزیز بک ڈپو لاہور کے بارے میں اپنے تجربات بتاتا جو مختلف النوع تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نئی کتابوں کے علاوہ پرانی کتابوں کی تلاش میں بھی لگے رہتے تھے۔ دہلی کے ایک سفر میں جو انجمن ترقی اردو کے ایک سیمینار کے سلسلے میں پیش آیا تھا، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ہم رکاب میں بھی تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی سیمینار سے فارغ ہوتے تو کسی میزبان کو ساتھ لے کر کوچہ پنڈت، دریا گنج، اردو بازار اور دریبہ کلاں میں نکل جاتے۔ واپس آتے تو پرانی کتابوں سے لدے پھندے ہوتے۔ دہلی سے واپس آئے تو اپنی بیگم اور اکلوتی بیٹی کے لیے کوئی تحفہ نہ لائے لیکن کتابیں اتنی تھیں کہ اضافی کسٹم ادا کرنا پڑا اور ائرپورٹ پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی سفارش بھی بے اثر ثابت ہوئی۔

مجھے علم ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کے ذاتی کتب خانے میں مختلف موضوعات کی تیس چالیس ہزار کتابیں موجود تھیں، ان میں کئی نادر مخطوطات اور بعض کتابوں کے پہلے ایڈیشن بھی تھے۔ اخبارات کے اہم تراشے اور لیڈروں کے بیانات الگ تھے، پی ایچ ڈی کے خطی مقالات بھی بڑی تعداد میں تھے۔ اس پر مستزاد نامور ادیبوں کے مجلوں اور معرکوں کی فائلیں اور

"الحمرا" دسمبر ۲۰۰۳ء

ان کے ذاتی خطوط بھی کثرت سے تھے۔ ہمدرد دواخانہ کراچی کے مسیحا نفس، ادب دوست اور ادیب پرور حکیم محمد سعید (شہید) کی خواہش تھی کہ وحید قریشی یہ کتب خانہ ان کے ادارے کے پاس فروخت کردیں۔ انہوں نے غالباً بیس لاکھ روپے کی پیشکش کی تھی۔ پھر جنوبی پنجاب کی ایک نجی لائبریری نے پچیس لاکھ روپے قیمت لگائی جو ۳۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی اپنے کتب خانے سے مفارقت پر آمادہ نہ ہوئے۔ کہتے تھے کہ "یہ لائبریری نہیں، زندہ مصنفین کی انجمن ہے جن سے میں تبادلۂ خیالات کرتا ہوں۔"

لیکن پھر عمر ضعیفی کے تھے نازل ہونے لگے۔ مختلف قسم کی علالتوں نے انہیں آن گھیرا۔ سمن آباد والا مکان چھوڑ کر وہ ملتان روڈ کی ایک دور افتادہ آبادی میں منتقل ہوگئے۔ پوری لائبریری پہلے طارق عزیز (ڈاکٹر) کے ہاں پڑی رہی۔ پھر نئے مکان میں پہنچائی گئی۔ لیکن پھر ایک روز یہ متاع خاص انہوں نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لائبریری کی نذر کردی۔ ڈاکٹر وحید قریشی ایک لمبے عرصے سے بیمار ہیں، ہر ماہ ادویات کے لیے ہزاروں روپے کی ضرورت لاحق رہتی ہے لیکن وہ بڑے اطمینان سے فرماتے ہیں۔

"لائبریری فروخت کرنے کے خیال سے ہی مجھے سوہانِ روح ہو جاتا تھا۔"

لیکن اب وہ مطمئن اور شانت ہیں کہ ان کی لائبریری سے طلبہ اور طالبات استفادہ کریں گے۔

یہ ایک خبر تھی جو عام نہیں ہوئی۔

یہ ایک کارنامہ ہے جس کی اطلاع اہلِ ادب تک پہنچانی ضروری ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی سن لیجئے کہ ان کی کتاب "اساسیات اقبال" کو حکومت پاکستان نے قومی ایوارڈ عطا کیا ہے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی نے انہیں "پروفیسر ایمرِٹس" کے عہدے پر تاحیات فائز کردیا ہے۔ ان کی اس غنی مزاجی کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور کے وہ منتظم اعلیٰ ہیں لیکن یہ تمام کام بلا تنخواہ، بلا مشاہرہ اور اعزازی کرتے ہیں۔ اکادمی کی قلیل سی گرانٹ سے اعلیٰ پائے کی کتابیں اس نوع کے دوسرے تمام اداروں سے زیادہ چھاپتے ہیں۔ ۲۰۰۳ء کے دوران بھی ان کے ادارے سے ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سہیل بخاری، کرامت بخاری اور دوسرے نامور ادیبوں کی کتابیں شائع کرچکے ہیں۔ ایک نادر کتاب کا متن مصنف کے اپنے نایاب خطی نسخے کے عکس سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے جو مثال قائم کی ہے وہ اس قسم کے دوسرے اداروں کے لیے قابلِ تقلید ہے جو فنڈز کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے ایک معاصر نے اپنی خود نوشت سوانح میں ان کے بارے میں جو تاثر دیا وہ کسی طرح بھی ان کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن میرا ان سے سابقہ زرخیز نوعیت کا ہے۔ جس کا تذکرہ ضروری سمجھا اور اب میں پھر اعتراف کرتا ہوں کہ ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۷۰ء کی دہائی میں صدر شعبہ اردو نہ بنتے تو میں پی ایچ ڈی کے لیے اجازت نامہ حاصل نہ کرسکتا۔ نہ ادب کا ریاض مکمل کرسکتا۔ ان کی غنی مزاجی نے میرے ریاض میں معاونت کی اور مجھے تحقیق میں محنت اور تنقید میں اپنی بات اپنے انداز میں لکھنے کا سبق دیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب! میں آپ کا ممنونِ احسان ہوں۔

✿……✿……✿

''الحمراء'' فروری ۲۰۰۴ء

محفلِ احباب

مکرمی ... ''الحمراء'' (شمارہ دسمبر) میں چھپنے والے قائداعظم کی تدفین سے متعلق وقار عظیم مرحوم کے یادگار رپورتاژ کو ایک مقامی اخبار نے بھی نقل کیا۔ پی ٹی وی ورلڈ نے اس رپورتاژ پر بھی ایک پروگرام ۲۶ دسمبر کو پیش کیا۔ دونوں چیزیں میں دیکھ نہیں سکا، یہ خوشکن اطلاعات عزیز محترم انور وقار عظیم صاحب سے پائیں۔ اس اعزاز جاریہ کو ''الحمراء'' میں رپورتاژ کی اشاعت کا تصرف جانتا ہوں۔ اللہ آپ کو خوش اور ممتاز رکھے اور رسالے کو مزید کامیابیوں اور شادابیوں سے ہم کنار کرے۔ اور رکھے۔

''الحمراء''، دسمبر ۲۰۰۳ء کی ''محفل احباب'' میں محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب کا مکتوب پڑھ کر افسوس ہوا کہ میری کچھ ''توضیحات'' (مطبوعہ ''الحمراء'' نومبر ۲۰۰۳ء) انھیں تلخ لگیں اور ان کی دل آزاری کا باعث ہوئیں۔ میں، انور سدید صاحب کی ''قدیم دوستی'' اور اپنے حلقۂ یاراں کے لیے ان کی کسی قدر زائد از استحقاق ''توجہ'' کے علاوہ، بحیثیت مجموعی، ان کی علمی صلاحیت اور استعداد کار کا بڑا قدردان اور معترف ہوں۔ ان کی تالیفات اور نگارشات سے میں نے حسب استطاعت سیکھا اور پایا ہے۔ میری تحریر، ان کے تکدر کا باعث ہوئی، اس کے لیے میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔

ہر شخص، دوسرے کے بارے میں اپنے تجربے سے رائے قائم کرتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، صفات محمودہ سے بھی ضرور مزین ہوں گے، اس سے کیوں کر انکار کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے انور سدید صاحب کے لیے تحقیق کی راہ آسان بنائی۔ انور سدید صاحب کا زاویہ نظر، قدرتی طور پر قریشی صاحب سے نیاز مندانہ ہی ہونا چاہیے، اس سے کم یا مختلف کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔

انور سدید صاحب نے ۱۹۶۶ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ کے اعزاز کے ساتھ ایم۔ اے (اردو) کیا۔ ضمناً انھوں نے یہ لکھا ہے کہ ''میرا پی ایچ ڈی کا خاکہ جس کا عنوان ''اردو ادب کی تحریکیں'' تھا سید وقار عظیم نے مسترد کر دیا تھا'' وقار عظیم صاحب صرف ایک برس (۶۶۔ ۱۹۶۵ء)، شعبہ اردو کے صدر رہے۔ انھوں نے انور سدید صاحب کے ''عنوان'' کو یکسر مسترد نہیں کیا تھا۔ سدید صاحب کا موضوع تھا: ''اردو ادب کی تحریکیں۔ ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک۔''

وقار عظیم صاحب موضوع اور مقالہ نگار کی خیر خواہی میں چاہتے تھے کہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے اسے حد زمانی کے اعتبار سے محدود کر لینا زیادہ مناسب ہوگا۔ انور سدید صاحب کو اپنی استعداد کار کا خود بہتر اندازہ تھا، وہ وقار عظیم صاحب کی رائے سے متفق نہ ہوسکے۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے مزید لکھا ہے کہ: ''...... ڈاکٹر عبادت بریلوی چھ (۶) مرتبہ اس (خاکے) کی نقول لے کر اسے نظر انداز کرچکے تھے۔ انھوں نے کم وبیش پانچ سال تک مجھے خوب پھنکیاں دیں۔'' ظاہر ہے یہ تجربہ انور سدید صاحب کا ہے، اس لیے انھیں اس کے اظہار کا پورا حق حاصل ہے، خواہ یہ بعض کے نزدیک خلاف واقعہ یا بعض اصحاب کے لیے تکلیف دہ اور دل آزار ہی کیوں نہ ہو۔

ڈاکٹر انور سدید بڑے فاضل اور عمر اور علم میں مجھ سے بہت بڑے اور بڑھے ہوئے ہیں۔ اپنے حواشی سے کسی دل آزاری ہرگز مقصود نہیں تھی۔ انور سدید صاحب کی محبت اور شفقت کا تو میں ہمیشہ طلبگار رہا اور انھوں نے ہمیشہ مجھے ضرورت سے زائد عزت دی جس کے لیے میں قلباً ان کا ممنون ہوں۔ مجھ وحید قریشی صاحب سے ''حسد'' کی بات تو وہ سوچے جو ان کے علمی مرتبے اور ذاتی کردار سے ناواقف محض ہو۔

''محفل احباب'' میں آخری خط ''ناول نگار عرفان احمد خان'' صاحب کا ہے جو حد درجہ یک طرفہ ہے۔ مجھے

''الحمراء'' فروری ۲۰۰۴ء

موصوف سے تعارف یا ملاقات کی عزت حاصل نہیں اور اگر ہے تو حافظے میں نہیں۔ انہوں نے میرے بارے میں بڑے ''حقائق'' سے بہت بے بنیاد باتیں خاصے نامناسب اسلوب میں کہی ہیں (اور چھپی ہیں)۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''ڈاکٹر وحید قریشی صاحب پاکستان کے نمبر ون محقق ہیں۔''

میں نے انہیں ''دو نمبر'' کب کہا؟ ان کے محقق ہونے یا نہ ہونے کا تو میرے معروضے میں ذکر تک نہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور اس کے شعبہ اردو سے ان کا جو سلوک عمر بھر رہا، اس کے اظہار میں کوئی ''کمی'' یا کسر رہ گئی ہو تو عجب نہیں۔

ایک بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ:

''اگر ڈاکٹر وحید قریشی کا کتب خانہ گورنمنٹ کالج کے اثاثہ جات میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں تو پھر ڈاکٹر معین انجمن از خود اس سے بھی بڑا قدم اٹھا کر دکھائیں اور اپنی ذاتی لائبریری گورنمنٹ کالج کو Donate کر دیں۔ آخر کب تک صاحب بن کر ادبی خزانوں پر بیٹھے رہیں گے۔''

وحید قریشی صاحب کا ذخیرۂ کتب سر آنکھوں پر، یہ تو اب 'جی سی' میں آیا ہے۔ میرے ذاتی ذخیرۂ کتب کا ایک حصہ تو، جو غیر مطبوعہ تھیسز اور قائداعظم، نیز تاریخ و تحریک پاکستان سے متعلق کتابوں پر مشتمل ہے، اس سال کے اوائل ہی میں، گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی) لائبریری میں جا چکا۔

دوسری قسط کے طور پر میرے ذخیرۂ اقبالیات کو ''جی سی یو'' لائبریری میں منتقل ہونا ہے۔ صرف ''اقبالیات'' سے متعلق یہ سارا لوازمہ کوئی ایک ہزار کے لگ بھگ کتب و رسائل، مقالات اور تراشوں وغیرہ پر مشتمل ہوگا۔ تجویز یہ ہے کہ پہلے ایم فل (اردو) کے ایک مقالے کے طور پر اس ذخیرے کی تحقیقی اور توضیحی فہرست تیار کرائی جائے۔ پھر یہ سب چیزیں بھی ۲۰۰۵ء (کسی قیمت یا رعایت کے بغیر) 'جی سی یو' لائبریری میں چلی جائیں گی۔

پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم کا بے مثال شخصی کتب خانہ بھی میری تحریک پر ''جی سی یو'' لائبریری کے لیے مختص ہو چکا ہے ''گوشہ وقار عظیم'' کا نام دیا گیا ہے (میری ذاتی لائبریری بھی اسی گوشے کا ایک حصہ ہوگی)۔

میں نے جی سی یونیورسٹی لاہور کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد فراہم کر کے ''سید وقار عظیم گولڈ میڈل'' کے اجراء کا بھی اہتمام کیا ہے جو سال ۲۰۰۴ء سے دائماً ہر برس جی سی یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) میں فرسٹ کلاس فرسٹ کا اعزاز پانے والے طالب علم کو عطا کیا جایا کرے گا۔

ان امور واقعہ کا اظہار مجھے ہلکی بات معلوم ہوتی ہے جسے خوش ذوقی کے منافی اور خود نمائی کے قریب محمول کیا جا سکتا ہے لیکن ناول نگار جناب عرفان احمد خاں کے خط کی اشاعت کے بعد، میرے اس اظہار و اعلان کی، ضرورت اور اس کے جواز کو شاید آپ جائز سمجھیں۔

فاضل مراسلہ نگار نے ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات گرامی کو ''متنازعہ'' تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''ڈاکٹر وحید قریشی کا گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ایمریطس مقرر ہونا وہ دکھ ہے، جس سے جانبر ہونے میں معین صاحب کو ایک عرصہ لگے گا۔ پہلے تو انہوں نے گورنمنٹ کالج میں توسیع حاصل کرنے کی ناکام کوششیں کیں۔ بعد میں پروفیسر ایمریطس کی کرسی کو چھینا چاہا اور بالآخر ناکام ہو کر، ٹھنڈے ٹھار ہو کر ''بے وقار'' پبلی کیشنز کو چلانے پر مجبور پائے گئے۔''

ان سطور میں اوپر تلے کئی صریح غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا نقطہ نظر چھپی ہوئی شکل میں بہت پہلے سے موجود اور ریکارڈ پر محفوظ ہے۔ اپریل ۲۰۰۳ء میں ایک بچی نے مجھ سے پوچھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا آپ اس

کوشش میں ہیں کہ پھر کہیں کوئی تدریسی ذمہ داری قبول کرلیں؟''

اس سوال کے جواب میں میرے لفظ یہ تھے:

''آپ ''کوشش'' کہتی ہیں۔ میں تو اس کے برعکس، اس سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں اپنی اننگز بھلی یا بری کھیل چکا۔ اب اس سے چپٹے رہنا کیا۔ یہ اچھا بھی نہیں لگتا اور اپنی حد تک میں نہ چاہتا ہوں، نہ اسے پسند ہی کرتا ہوں۔ اب کہ ''آزادی'' ملی ہے، میں ازسرنو کسی ''قید یا پابندی'' کا خواہاں نہیں۔ اس کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا۔ ''جی سی یو'' سے بھی، جہاں میری مدتِ ملازمت کا طویل ترین اور خوشگوار ترین دور گزرا میں کوئی ''معاشی پیش کش'' (Monetary Package) قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر قطعاً آمادہ نہیں۔

اگرچہ شعبے یا ''جی سی یو'' سے کسی ''اعزازی'' نسبت یا تحقیقی یا نصابی امور میں رہنمائی کے لیے میں رضاکارانہ ہمہ وقت تیار ہوں۔ اس نوع کی کوئی خدمت میرا اعزاز ہوگا لیکن: I must emphasize its being with out any monetasy remuneration.

(i) نذرِ معین، مرتبہ محمد سعید، مطبوعہ لاہور ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۰

(ii) مطبوعہ: رسالہ ''نگار'' مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی اگست ۲۰۰۳ء، ص ۸۱

میرے اس بہت واضح اور مطبوعہ اعلان کے ریکارڈ پر بہت پہلے سے موجود ہوتے ہوئے، آپ ہی بتائیے کہ میں مراسلہ نگار موصوف کے ''الزامات'' اور ''تہمتوں'' پر ان سے معذرت خواہی کی توقع کروں یا نہ کروں؟

مراسلہ نگار نے ایک اشاعتی ادارے کا بھی کچھ حوالہ دیا ہے۔ میرے بیٹے سید وقار معین، ''الوقار پبلی کیشنز'' کے تنہا مالک اور مہتمم ہیں۔ اس اشاعتی ادارے میں ایک رتی بھر کا بھی میرا حصہ نہیں۔ اس سے میرا قطعاً کوئی مالی مفاد وابستہ نہیں۔ اس ادارے کی کم وقت میں بہت زیادہ کامیابی پر میں، اور میرے دوست فخر کریں یا خوش ہوں تو بے جا نہیں۔ بعض اشخاص یا گروہ ادارے اس سے رشتہ عناد رکھیں تو ان کی فراخی رزق کے لیے دعا ہی کی جاسکتی ہے۔

خان صاحب کے مراسلے کے مشمولات، اس کا اسلوب اور خط کا مجموعی مزاج تکلیف دہ ہے، لیکن اس کا تعلق، لکھنے والے کی ''توفیق'' سے جڑا ہوا ہے، اس لیے اس پر ماتم کیا! پھر بھی.... صد ادب (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

مکرمی..... نئے سال کا پہلا شمارہ پہلے سے ہر لحاظ سے بہتر۔ خوب سے خوب تر کی جانب گامزن۔ محفل احباب بھی خوب تر ہوتی ہے، احباب کو اس محفل میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔ اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔ لیکن محفل کو محض انجمن تحسین باہمی نہ بنانا چاہیے۔ صحیح اظہار خیال سے ذریعہ الحمراء میں چھپنے والے مضامین، نظم و نثر کا احاطہ کرنا چاہیے۔ تنقید آپ کو آگے کی سمت لے جاتی ہے۔ تعریف اس کو اپنی جگہ منجمد کر دیتی ہے۔ محترم جگن ناتھ آزاد صاحب نے اپنے مکتوب عالی قدر میں جدوجہد آزادی کے سودائی مولوی برکت اللہ کا نام برکت علی لکھ دیا ہے۔ تصحیح فرما لیجئے۔ ان کا نام برکت اللہ ہے۔ برکت اللہ بھوپالی بھی کہلاتے ہیں۔ مدینہ پردیس (بھوپال) لیکن یقیناً ان کو ایک قابل احترام حریت پسند ہیرو کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

''سیاسیوں کے دیس میں'' خالد محمود صاحب کا مشاہدہ عمیق نہیں ہے۔ ابھی وہ اجنبی ہیں۔ تھائی معاشرے سے واقف نہیں ہیں۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کر رہے ہیں۔ وہ بھی اپنی بھابھی اور اہل خانہ کی۔ تھائی معاشرہ! میں کچھ نہیں تو بیسیوں دفعہ بنکاک جا چکا ہوں۔ وہاں نماز تو کوئی نہیں چراتے تاکہ وہاں اس کی ضمانت ہے البتہ آپ کا بٹوہ ضرور غائب ہو جائے گا۔ کوئی ٹھگ آپ کو بیوقوف بنا کر لوٹ کر لے جائے گا۔ بھولی بھالی لڑکیاں آپ کو لبھا کر آپ کے ساتھ وہ کچھ کر جائیں گی کہ آپ کو محسوس ہی نہ ہوگا کہ ہوگیا کیا ہے۔ بنکاک وہ نہیں ہے جو خالد محمود صاحب کو اپنے بھائی کے گھر کی

Dr. Anwar Mahmood Khalid
M.A. PH.D.

(R) Professor And Head:
Department of Urdu,
Govt. College, FAISALABAD.
Ph: [redacted] Res: [redacted]-726646, 542445

Residence
24-W-B Madina Town,
Faisalabad.

Dated. 7.11.2001

مکرم و محترمی ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب

تسلیم - امید ہے آپ بخیریت ہوں گے - ایک ناگزیر فریضے کی ادائیگی کے لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔

آپ کو شاید یاد نہ ہو مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کافی عرصہ پہلے آپ نے لاہور سے فیصل آباد تشریف لا کر مجھ سے میر حسین عطا تحسین کی نو طرز مرصع (مرتبہ ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی - ناشر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، طبع ۱۹۵۸ - صفحات 136) طلب کی تھی اور میں نے فوراً فراہم کر دی تھی - اس کتاب کے شروع میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کا 55 صفحات کا دیباچہ و مقدمہ بھی تھا - اس زمانے میں ایم اے اردو کے نصاب کے پرچے (اسالیب نثر اردو) میں یہ نصاب کا حصہ شامل تھا اور چونکہ میرے پاس اس کا ذاتی نسخہ نہیں تھا اس لیے لاہور سے برادرم صدیق جاوید صاحب سے مستعار لی تھی۔ آپ کو کسی تحقیقی کام کے سلسلے میں یہ کتاب درکار تھی اس لیے آپ نے چند روز کے لیے یہ کتاب مجھ سے مانگی تھی لیکن اب تک واپس نہیں کی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کتاب پر کتاب کے مالک کا نام بھی درج تھا (شاید محمد اکرام چغتائی صاحب کا)۔ صدیق جاوید صاحب گزشتہ چند ماہ کے دوران مجھ سے یہ کتاب بارہا طلب کر چکے ہیں۔ ملاقات پر زبانی، خط کے ذریعے اور ٹیلی فون پر بھی۔ شاید آپ نے اپنے کسی علمی کام کے لیے اس کتاب کو سنبھال رکھا ہے۔ برادرم تھوڑا سا وقت نکال کر اپنے ذاتی کتب خانے کو کھنگالیے اور یہ کتاب ڈاکٹر برادرم صدیق جاوید صاحب کو پہنچا دیجیے اور مجھے اس کے مالک کو اس کی امانت لوٹانے کی اطلاع کر دیجیے۔ یہ کام آپ کی فوری توجہ کا طالب ہے۔ گزشتہ ہفتے میں اور صدیق جاوید صاحب آپ کے دولت کدے پر شام کے وقت حاضر ہوئے تھے لیکن آپ گھر پر موجود نہیں تھے اس لیے شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکا۔

فقط والسلام
خیر اندیش
انور محمود خالد

قائداعظم اور لائل پور

(۳۶)
برائے "گوشۂ وقارِ عظیم"
جی سی یو لائبریری
ہدیہ مخلصانہ
یکم مارچ ۲۰۰۳

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
DR. SYED MOEEN-UR-REHMAN
Professor & Chairman Department of Urdu
Government College University Lahore.
وائس پرنسپل: پروفیسر و صدر شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج لائل پور

سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور

بہ تقریب صد سالہ جشنِ ولادت قائدِ اعظم محمد علی جناح

۱۸۷۶ء ——— ۱۹۷۶ء

طبع اوّل : ۱۹۷۷ء

ناشر : نیاز احمد، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

طابع : منظور پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت : ۳۰ روپے

کتابت : محمد اشفاق زاہد

۹

حرفِ چند:

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن

"قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد اہلِ پاکستان سے ایک بہت بڑی کوتاہی 'قائد کی شخصیت' تعلیم اور سوانح سے نئی نسل کو آگاہ نہ کرسکنے کی کوتاہی تھی کہ انھی یادوں پر ہمارے قومی تشخص کا تسلسل مُنحصر ہے۔ کسی قوم کے عظیم رہنماؤں کی سوانح، دراصل اُس قوم کا حافظہ ہوتی ہے، جسے کھو کر وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں جان سکتی —— اور ہم نے تادیر حافظہ کھو بیٹھنے کی اس کیفیت میں خود کو اسیر رکھا ہے۔" —— پروفیسر میاں محمد رفیع انور

زیرِ نظر کتاب، قائدِ اعظم کی زندگی کے ایک فراموش شدہ ورق کو اُجالنے اور تحریکِ پاکستان کی ایک گم گشتہ یاد کو تازہ کرنے کی مُتعلمانہ اور مُخلصانہ کوشش ہے۔ اس کام کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور اس کے لیے کوئی جواز پیش کرنے یا معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء —— ۱۹۴۸ء) پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے پہلے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں مسلم لیگ کے مُتعدد و مُقتدر رہنماؤں کے ہمراہ ۱۷ نومبر ۱۹۴۴ء کو لائل پور تشریف لائے اور ۱۹ نومبر تک یہاں مُقیم رہے۔ لائل پور میں قائدِ اعظم کی یہ پہلی آمد، اُن کی آخری آمد بھی ثابت ہوئی کہ لائل پور کے عوام اور در و بام کو بارِ دِگر اُن کی میزبانی کی عزت اور مسرت نصیب نہ ہوئی۔ قائدِ اعظم کی زندگی میں پاکستان کے

کی پہلی مسلم خبر رساں ایجنسی "اورینٹ پریس"[1] کی جاری کردہ اطلاعات نے گھیرا ہے۔ "انقلاب" کا ادارۂ تحریر مولانا غلام رسول مہر (۳ مئی ۱۸۹۴ء - ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء) اور مولانا عبدالمجید سالک (۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء - ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء) پر مشتمل تھا، اور حمید نظامی (دسمبر ۱۹۱۵ء - ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء) اُس زمانے میں منجملہ مصروفیاتِ دیگر، "اورینٹ پریس" کی لاہور برانچ کے مینیجر تھے۔[2] کتاب کا انتساب ان ہی اصحابِ ثلاثہ کے نام ہے ۔

مولانا غلام رسول مہر، میرے حال پر بڑا کرم فرماتے تھے۔ اُن کی محبت اور شفقت کی یاد میرا بڑا قیمتی سرمایہ ہے ۔ اُن سے ملاقات اور مراسلت دونوں کے لُطف کی ارزانی رہی۔ مولانا عبدالمجید سالک سے مختصر سی مراسلت کا موقع ملا، اور حمید نظامی مرحوم سے لُطفِ ملاقات ہی میسر آیا، نہ مراسلت کا افتخار! آٹوگراف کی آرزو میں ایک پل کی دید و باز دید اور بس — خُدا آخرت میں بھی ان اصحابِ جلیلہ کے مقامات بلند تر فرمائے اور اے کاش! اُن کے سے جوشِ جُنوں کی کہیں تو جھلک نظر آئے !!

---

[1] مسلمانوں کو (خبر رساں) ایجنسیوں سے یہ شکایت تھی کہ اُن پر ہندو غالب ہیں اور وہ مسلم زاویۂ نگاہ کی اشاعت میں حائل (رہتے) ہیں۔ چنانچہ غالباً ۱۹۴۰ء میں پٹنہ میں مسٹر سید محمد نے "اورینٹ پریس آف انڈیا" کے نام سے ایک مسلم خبر رساں ایجنسی قائم (کی)۔ یہ تقسیم (ہند) تک قائم رہی اور اس نے اپنے محدود ذرائع کے باوجود مسلم مفاد کو تقویت پہنچائی"۔ (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صحافت پاک و ہند میں، لاہور ۱۹۶۳ء، صفحہ ۵۰۹)

[2] صحافت پاک و ہند میں، ایضاً، صفحہ ۴۹۰، ۴۹۱

شخصیات، مطبوعات، موضوعات، اداروں اور اماکن کے توضیحی اشاریے کی بنا پر کتاب سے استفادے کا دائرہ بڑھ جانا چاہیے۔ بعض یادگار تصاویر اور معاصر اخبارات کے کچھ متعلقہ اجزا کے عکس بھی زیبِ کتاب ہیں۔ یہ نوادر تعداد میں درجن بھر سے متجاوز ہیں۔

○

اس کام کی بجا آوری کے سلسلے میں مقامی اور نجی کتب خانوں کے علاوہ لاہور کے جن اداروں یا کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا، ان کی فہرست طویل ہے۔ چند نام یہ ہیں: پنجاب یونیورسٹی لائبریری، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میوزیم لائبریری، لاہور میوزیم تحریکِ پاکستان گیلری، لائبریری ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان دانش گاہ پنجاب، لائبریری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری اور لائبریری مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور۔ میں لاہور میوزیم کے ایم سلیمان گل صاحب کی اعانت کے لیے بطورِ خاص ممنون ہوں۔

○

لائل پور میں رہ کر بھی میں اپنے تحقیقی اور تصنیفی سفر کو کسی قدر جاری رکھ سکا تو ممکن ہے اس میں میرے مزاج یا مشن کو بھی کچھ دخل ہو، لیکن اس میں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی تھی، اگر مقامی طور پر مجھے محبِ محترم پروفیسر منیر احمد چودھری صاحب کی محبت اور شفقت میسر نہ ہوتی۔ یہی صورت شفیق مکرم پروفیسر افتخار احمد چشتی صاحب کی ہے جن کے وجودِ مسعود کے حوالے سے میں اپنے لائل پور کے قیام کو خود اپنے

لیے باثروت اور بابرکت مانتا ہوں۔

اِس موقع پر شعبۂ اُردو کے اپنے رفقائے کار عصمت اللہ خاں، حق نواز، ریاض احمد ریاض، عبدالرحمٰن شاکر، اسلم ارشاد، منظر مفتی، یوسف عزیز، محمد اسلم، حشمت اللہ خاں، شوکت ضیا، اور ظفرِ عالم کے اسماء ذہن میں اُبھرتے ہیں جن کی مخلصانہ اور برادرانہ رفاقت نے لاہور سے دور میرے لیے لائل پور کے قیام کو انعام بنا دیا۔ اس پورے قافلے کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے!!

اس لمحے شعبۂ اُردو سے قطعِ نظر کالج کے دوسرے بہت سے رفقا کے مانوس اور منوّر چہرے بھی ہجوم در ہجوم ذہن میں اُبھرتے ہیں، لیکن نام لینا شروع کیے تو اس بساط کا سمیٹنا پھر مشکل ہو جائے گا۔ یہ علم اور عقل میں سب کے سب، اور عمر میں بیشتر، مجھ سے بڑے ہیں اور میرے لیے محترم — لیکن کیا بڑے اور کیا چھوٹے بلااستثنا مجھے ان سب سے یہاں جو بے دریغ محبت اور عزت ملی، اپنے آپ کو اس کا مستحق قطعاً نہیں جانتا، لیکن اس پر فخر جتنا بھی کروں، وہ کم ہے۔

اِس حکایت کو جو دراز ہوتی جا رہی ہے، اُن چند عزیز دوستوں کے ذکرِ خیر پر ختم کرتا ہوں، جو اب کالج میں نہیں لیکن جن کے ساتھ کی یاد ہر مشکل اور مسرت میں اب بھی برابر نشاط اور انبساط اور طمانیت و تقویت کا باعث بنتی ہے: محمد افسر ساجد (دیپالپور)، محمد اسحٰق قریشی (ریاض، سعودی عرب)، اور محمد صدیق جاوید (لاہور) — یہ کالج میں نہ رہے لیکن دل سے کیونکر جائیں گے!؟

○

میری یہ کتاب بھی، برادرم نیاز احمد صاحب چھاپ رہے ہیں۔ اس کا خارجی حُسن

۱۷

اُنھیں کی خوش ذوقی کا رہینِ منّت ہے :

اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج، لائل پور

۲۴۔ مارچ ۱۹۶۰ء

برادرم ڈاکٹر محمد صدیق جاوید صاحب
کے لیے
ہدیۂ مرتب
۱۸ ستمبر ۱۹۹۸

قائدِ اعظم اور لائل پور

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور

وکٹری بک بنک ۔ لاہور

قیام پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر

کتاب:- قائد اعظم اور لائل پور

مصنف:- ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

تاریخ اشاعت:- ۱۹۹۸ء

اہتمام اشاعت:- پروفیسر جاوید اقبال ندیم

طباعت:- معراج پرنٹنگ پریس، اردو بازار۔ لاہور

اشاعت:- وکٹری بک بنک لاہور

قیمت:- -/۲00 روپے (دو صد)

لیے باعثِ عزت اور بابرکت مانتا ہوں۔

اس موقع پر شعبۂ اردو کے اپنے رفقائے کار عصمت اللہ خاں، حق نواز، ریاض احمد ریاض، عبدالرحمٰن شاکر، اسلم ارشاد، منظر مفتی، یوسف عزیز، محمد اسلم انور، محمود خالد، ریاض مجید، حشمت اللہ، شوکت ضیا اور ظفر عالم کے اسما ذہن میں ابھرتے ہیں۔ جن کی مخلصانہ اور برادرانہ رفاقت نے لاہور سے دور میرے لیے لائل پور کے قیام کو انعام بنا دیا۔ اس پورے قافلے کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے!!

اس لمحے شعبۂ اردو سے قطع نظر کالج کے دوسرے بہت سے رفقا کے مانوس اور منور چہرے بھی ہجوم در ہجوم ذہن میں ابھرتے ہیں، لیکن نام لینا شروع کیے تو اس بساط کا سمیٹنا پھر مشکل ہو جائے گا۔ یہ علم اور عقل میں سب کے سب، اور عمر میں بیشتر، مجھ سے بڑے ہیں اور میرے لیے محترم — لیکن کیا بڑے اور کیا چھوٹے بلا استثنا مجھے ان سب سے میاں جو بے دریغ محبت اور عزت ملی، اپنے آپ کو اس کا مستحق واقعتاً نہیں جانتا، لیکن اس پہ فخر جتنا بھی کروں، وہ کم ہے۔

اس حکایت کو جو دراز ہوتی جا رہی ہے ان چند عزیز دوستوں کے ذکرِ خیر پر ختم کرتا ہوں، جو اب کالج میں نہیں لیکن جن کے ساتھ کی یاد ہر مشکل اور مسرت میں اب بھی برابر نشاط اور انبساط اور طمانیت و تقویت کا باعث بنتی ہے: محمد افسر ساجد، محمد اسحٰق قریشی اور محمد صدیق جاوید — یہ کالج میں نہ رہے لیکن دل سے کیونکر جائیں گے!؟

[دستخط]
۲۳ مارچ ۱۹۷۷

شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج، لائل پور

1603

Dr. Syed Moeen-ur-Rehman

—Tehkeeq Ke Chirag Taley.....

سی ڈی - ۹/۲۶ ناظم آباد

کراچی - ۷۴۶۰۰

ڈاکٹر صدیقی جاوید اُن معدودے چند اہلِ قلم و تحقیق میں سے ہیں جو کسی موضوع پر لکھتے ہوئے، مداحوں کی طرح کسی مطلوبہ نتیجے تک رسائی کے لیے دلائل پیش نہیں کرتے بلکہ حقائق کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرتے ہوئے کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ یہی طریقِ کار زیرِ نظر کتاب میں بھی ملتا ہے۔ اس سے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اپنی تعریف میں مضامین لکھوا کر [illegible] خطوں میں [illegible] دوسروں کے نام سے شائع کروا کر مدح سے لبریز [illegible] ہونے والی جھوٹی شہرت علم و ادب کا [illegible] نہیں ہو سکتی۔ دوسروں کی کتابوں کو اپنے نام سے چھپوا لینا کمال تو ہے مگر علم و ادب کی دنیا میں نہیں، کسی اور دنیا کا۔

ڈاکٹر صدیقی جاوید مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے قاضی عبدالودود کی روایت پر عمل کرتے ہوئے ایک ایسی کتاب لکھی ہے جس میں اردو دنیا کے لیے ایک چشم کشا اور عبرت انگیز داستان بیان کی گئی ہے۔